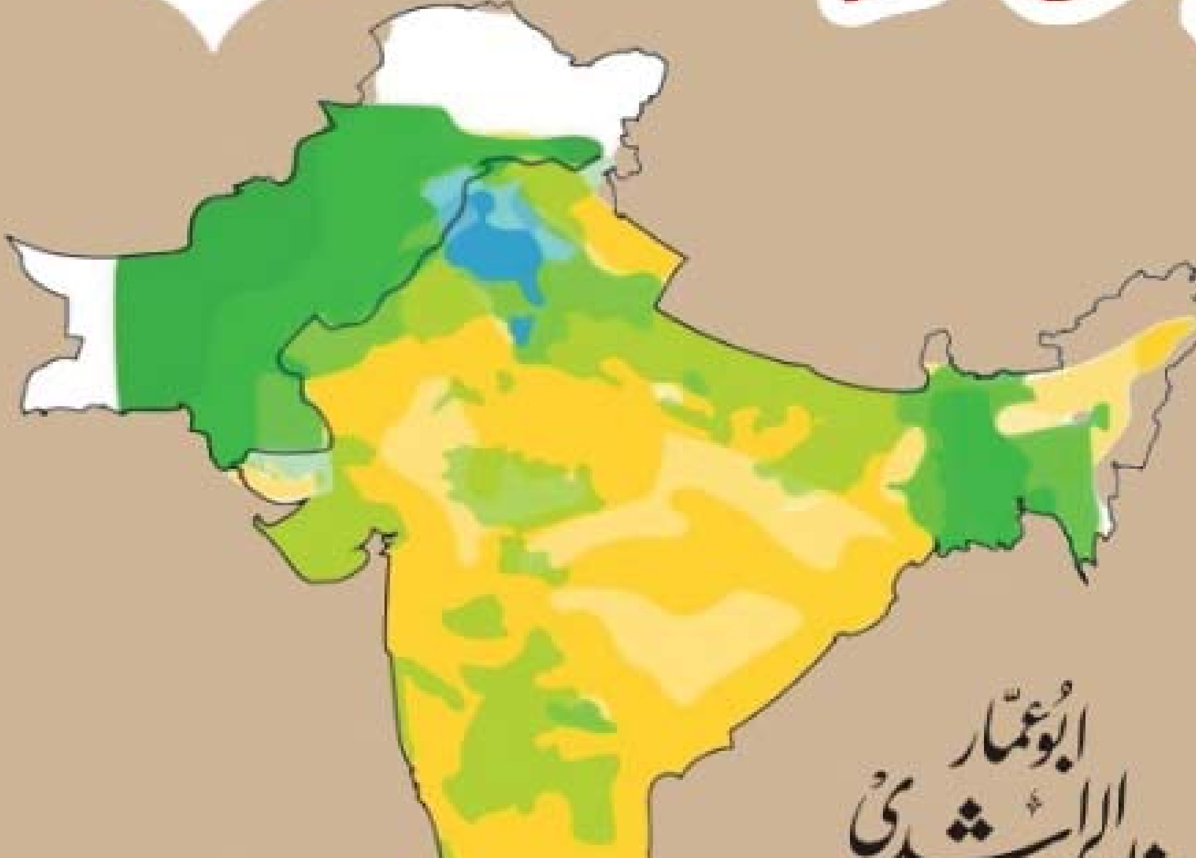
- مسئلہ کشمیر
- پاک بھارت تعلقات
- بھارت کی مُسلم اقلیت
- بھارتی عدالتیں
- بھارت کے مذاہب
- چند روز بھارت میں

بھارت



ابو عمار
زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بھارت

ابو عمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

عنوان : بھارت

تالیف : ابوعمار زاہد الراشدی

مرتب : ناصر الدین خان عامر

ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ

اشاعت : اگست ۲۰۲۳ء

فہرس

عالمی قوتوں کا کردار ۱۶۹

پاکستان کی قومی سلامتی: پاک بھارت تعلقات کے تناظر میں

بھارت کی مسلم اقلیّت: حالات و مسائل اور جدوجہد

بھارتی عدالتوں کے رجحانات

بھارت کے دو بڑے مذاہب

بھارت کے اسفار

متفرق

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بھارت ہمارا پڑوسی ملک ہے، ہم مدتوں اکٹھے رہ کر پون صدی قبل الگ ہوئے تھے۔ بھارت کے ساتھ ہمارے بہت سے تاریخی، سماجی، جغرافیائی اور مذہبی معاملات چلتے رہتے ہیں جو انسانی سماج کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ ایسے مسائل پر باہمی محاذ آرائی بھی ہو جاتی ہے اور مکالمات و روابط کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ ایک سیاسی کارکن اور صحافی کے طور پر یہ مسائل ہمیشہ میرا موضوع رہے ہیں، ان پر بہت کچھ بیان کیا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے۔ فرزند عزیز حافظ ناصر الدین خان عامر سلّمہٗ نے میری ایسی تحریرات کا بڑا حصہ زیر نظر مجموعہ میں مرتب کیا ہے جو اس کے حسن ذوق اور محنت کی علامت ہے۔ میرے بیانات اور تحریریں متعلقہ امور و مسائل پر ایک رائے کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے کسی بھی پہلو سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ مجھے اپنی کسی بھی رائے پر کبھی اصرار نہیں رہا۔ امید ہے کہ یہ گذارشات متعلقہ امور پر صورتحال کو سمجھنے میں قارئین کے کام آئیں گی اور وہ عزیزم عامر خان کو سعادتِ دارین کی دعاؤں سے نوازیں گے، آمین یارب العالمین۔

ابوعمار زاہدالراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

۲۱ جولائی ۲۰۲۳ء

مسئلہ کشمیر

﴿پس منظر اور حقائق﴾

کشمیر، تاریخ کے آئینے میں

(۱) چودھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں کشمیر کے ایک راجہ نے، جس کا نام رینچن یا رام چندر بتایا جاتا ہے، ایک عرب مسافر سید بلبل شاہؒ کی نماز اور تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا، اپنا اسلامی نام صدر الدینؒ رکھا اور سری نگر میں جامع مسجد تعمیر کی۔ اس طرح کشمیر کے اسلامی دور کا آغاز ہوا۔

(۲) پندرہویں صدی کے ربع اول میں کشمیر کو سلطان زین العابدینؒ جیسا نیک دل، رعایا پرور اور علم دوست بادشاہ نصیب ہوا جس نے عدل، تدبر، رحم دلی اور اسلامی اخوت و مساوات کے جذبہ سے ریاست میں اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ جامع مسجد کے ساتھ دار العلوم کی بنیاد رکھی اور علماء کی سرپرستی کی۔ اہل کشمیر اسے ''بڈشاہ'' (بڑا بادشاہ) کہتے ہیں اور اس کے عدل و انصاف اور رعایا پروری کے دوست دشمن سبھی معترف ہیں۔ سلطان زین العابدینؒ کا دور کشمیر کی اسلامی تاریخ کا زریں ترین دور شمار ہوتا ہے۔

(۳) ۱۵۸۵ء میں مغل فرمانروا جلال الدین اکبر نے کشمیر کو فتح کیا اور اس طرح کشمیر شاہمیری خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر مغل خاندان کے تسلط میں آ گیا۔

(۴) سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیرؒ کے وصال کے بعد جب سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہوئی، مغل شاہزدوں کی باہمی چپقلش کے باعث طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا اور ریاستیں خود مختار ہونے لگیں تو کشمیر پر افغانوں کا تسلط قائم ہو گیا اور اس طرح ۱۷۵۳ء میں کشمیر پر مغل اقتدار کا سورج غروب ہوا۔

(۵) ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ مہاراجہ پنجاب کے ایک لشکر نے مصر و دیوان چند کی قیادت میں

راجوری کے راستہ کشمیر پر حملہ کیا اور کشمیر کے حاکم جبار خان کو شکست دے کر سکھ اقتدار کا علم بلند کر دیا۔ یہیں سے کشمیری عوام کی بدنصیبی اور مظلومیت کا آغاز ہوتا ہے۔ رنجیت سنگھ نے کشمیر کے ڈوگرہ خاندان کو آلہ کار بنایا، اس خاندان کے دو افراد گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ رنجیت سنگھ کے درباری ملازم تھے، انہیں رنجیت سنگھ نے اہل کشمیر پر مسلط کر دیا۔ ڈوگروں اور سکھوں نے مل کر اہل کشمیر پر بے پناہ مظالم ڈھائے، ان کی صنعت کو تباہ کیا۔ اس دور میں شال بافی کی صنعت ترقی پذیر تھی، سکھا شاہی نے ۲۶ فیصد ٹیکس عائد کر کے اسے مفلوج کر دیا۔ شیر سنگھ کے دور میں قحط بھی پڑا۔ ان مظالم اور قحط سے تنگ آ کر بہت سے کشمیری خاندان پنجاب کی طرف ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ آج پنجاب کے مختلف علاقوں میں یہ کشمیری خاندان آباد ہیں۔

(۶) رنجیت سنگھ اور شیر سنگھ کے بعد سکھ اقتدار زوال پذیر ہوا تو فرنگی نے پنجاب پر براہ راست تسلط قائم کرنے کی خاطر سکھوں کو درمیان سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ سکھوں نے مزاحمت کی لیکن بالآخر ۱۸۴۶ء میں پنجاب فرنگی حکومت کے زیر نگین آ گیا۔ سکھوں اور انگریزوں کی اس جنگ میں کشمیر کے گلاب سنگھ نے فرنگی کے ساتھ تعاون کیا جس کے نتیجہ میں فرنگی نے ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو ''معاہدۂ امرتسر'' کے ذریعہ ۷۵ لاکھ روپے نقد کے علاوہ ایک گھوڑے، بارہ بکریوں اور چھ جوڑے شال پر مشتمل سالانہ خراج کے عوض ریاست جموں و کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس طرح کشمیر ڈوگرہ شاہی کے خونیں پنجوں میں جکڑ لیا گیا۔

(۷) ڈوگروں نے مسلمانوں کو ستانے اور ان پر ظلم ڈھانے میں پہلے ریکارڈ بھی توڑ دیے۔ شال بافی پر ۲۶ فیصد ٹیکس کو دوگنا کر کے ۵۲ فیصد کر دیا، مساجد مسمار ہونے لگیں، سکھا شاہی میں گاؤکشی پر پابندی عائد تھی، حتیٰ کہ ایک گائے کے ذبیحہ پر پورے کا پورا خاندان شہید کر دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی سکھ کسی مسلمان کو قتل کر دیتا تو اس کی سزا صرف ۱۴ روپے جرمانہ ہوتی تھی جن میں سے ۲ روپے مقتول کے خاندان کو ملتے اور ۱۲ روپے سرکاری خزانہ میں داخل کر دیے جاتے۔ ڈوگروں نے ان مظالم کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان میں دوگنا

چوگنا اضافہ کر دیا۔ ڈوگرہ مظالم اور جبر وتشدد کا یہ دور کشمیر کی تاریخ کا تاریک ترین اور اندوہناک باب ہے۔ بیشتر مسلمان ان مظالم کی تاب نہ لاتے ہوئے ہجرت کرتے رہے، وقتاً فوقتاً مزاحمت کی تحریکیں اٹھتی رہیں، لیکن ڈوگرہ شاہی کو چونکہ دولت برطانیہ کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اس لیے ڈوگرہ مظالم میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا چلا گیا۔

(۸) ۱۹۳۱ء میں ڈوگرہ ظلم وستم کے باعث ایک مسلمان کی شہادت کے بعد مدتوں سے سینوں میں پکنے والا لاوا پھٹ پڑا، پوری ریاست میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے، اہل کشمیر کی اس مظلومیت کو دیکھتے ہوئے انڈیا کی سیاسی جماعتوں نے بھی اس طرف توجہ دی۔ فرنگی کو اس دور میں یہ خدشہ تھا کہ کشمیر کی سرحد روس کے ساتھ ملتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ روس کشمیر کے راستہ سے اپنے اثرات انڈیا تک وسیع کر لے۔ اس خطرہ کے پیش نظر فرنگی حکومت نے سوچا کہ کشمیر میں کسی ایسی جماعت کو تقویت دی جائے جو وہاں فرنگی مفادات کا تحفظ اور بیرونی سرگرمیوں سے فرنگی حکومت کو باخبر کر سکے۔ قادیانی جماعت کا خلیفہ اول حکیم نور دین اس سے قبل جموں وکشمیر کے درباروں میں طبیب کی حیثیت سے فرنگی کے لیے مخبری کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس مقصد کے لیے فرنگی نے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین کو مہرہ بنایا۔ اس نے پنجاب کے سرکردہ مسلمانوں کو دھوکے سے ساتھ ملایا اور ''آل انڈیا کشمیر کمیٹی'' کی بنیاد شملہ میں رکھ دی جس کا صدر خود مرزا بشیر الدین اور سیکرٹری عبد الرحیم درد قادیانی تھا۔ اور صدر دفتر قادیان میں طے کیا گیا۔ اس کمیٹی کے علاوہ دوسرے سرکردہ مسلمانوں میں علامہ محمد اقبال مرحوم بھی تھے لیکن حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور دیگر زعماء کی مساعی سے علامہ اقبالؒ پر قادیانی سازش کی حقیقت آشکارا ہو گئی اور دوسرے مسلم شرکاء بھی اس چال کو سمجھ گئے تو انہوں نے مرزا بشیر الدین کی قیادت میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ادھر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد اور نامور کشمیری لیڈر میر واعظ مولانا محمد یوسفؒ فاضل دیوبند نے کشمیری راہنماؤں کو قادیانی سازش کے نتائج سے خبردار کیا جس کے نتیجہ میں مرزا بشیر الدین کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ کمیٹی نے علامہ محمد اقبالؒ کو صدر اور ملک برکت علی کو جنرل سیکرٹری چنا لیکن چند دنوں کے

بعد خود علامہ اقبالؒ نے کمیٹی کو توڑنے کا اعلان کر دیا اور اس طرح کشمیر کو قادیانی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی یہ سازش ناکام ہوگئی۔

(۹) اس کے برعکس پنجاب کے عوام نے مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم پر تحریک کشمیر کو بے پناہ قوت دی۔ ابتداء مجلس احرار اسلام کے ایک وفد نے کشمیری ارباب اقتدار سے مل کر انہیں ظلم وجور سے باز رکھنے کی سعی کی لیکن ڈوگرہ سامراج طاقت کے نشہ میں تھا جس کے باعث احرار کے جتھوں کو کشمیر پر یلغار کرنا پڑی۔ احرار کے کارکنوں اور پنجاب کے غیور مسلمانوں نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور دیگر زعماء احرار کی اپیل پر اس عظیم تحریک میں تیس ہزار کے قریب گرفتاریاں دے کر فرنگی اور ڈوگرہ اقتدار کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے اور کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کو آزادی اور مزاحمت کی راہ دکھائی۔

(۱۰) احرار کی اس یلغار کے سامنے فرنگی اور ڈوگرہ اقتدار بے بس ہو کر رہ گیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے قائدین حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ سے مصالحت کی استدعا کی گئی، ان بزرگوں نے باعزت اور باوقار مصالحت کے لیے اپنی مساعی کا آغاز کیا۔ کچھ دنوں تک یہ سعی ہوتی رہی لیکن سرکار پرست مسلمانوں نے جمعیۃ علماء ہند کے ذریعہ تحریک کشمیر کے کسی نتیجہ پر پہنچنے کو اپنے مستقبل کے لیے نیک شگون نہ سمجھتے ہوئے صاحب بہادروں کے حضور واویلا کیا اور فرنگی حکمرانوں نے اپنے ژلہ خواروں اور وفاداروں کی لاج رکھتے ہوئے ان بزرگوں کی مصالحتی مساعی کو کسی مثبت نتیجہ تک نہ پہنچنے دیا۔ اگرچہ اس تحریک کا ظاہری طور پر کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہ آیا لیکن اس سے کشمیری مسلمانوں کو جدوجہد آزادی کا حوصلہ اور جرأت ملی اور ۱۹۳۱ء کی اس تحریک کے بعد سے اب تک تحریک آزاد کشمیر کا تسلسل بدستور قائم ہے۔

(۱۱) ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر تقسیم ہوا تو ریاستوں کو اس بات کی آزادی تھی کہ وہ انڈیا یا پاکستان میں سے جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ کشمیر کو مسلم اکثریت کی بنا پر پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا لیکن فرنگی اور اس کے خود کاشتہ پودے قادیانی گروہ نے ایک بار پھر سازش کی، پنجاب کی سرحدات کے تعین کے لیے ریڈکلف ایوارڈ کے سامنے مسلم لیگ کے

قادیانی نمائندے ظفر اللہ خان نے ضلع گورداسپور کے بارے میں مسلمانوں کے موقف کو نقصان پہنچایا۔ ضلع گورداسپور میں قادیانیوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ قرار دیتے ہوئے اپنا موقف جداگانہ پیش کیا اور قادیان کو کھلا شہر قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ قادیان تو کھلا شہر نہ بن سکا البتہ قادیانیوں کی اس حرکت کے باعث ضلع گورداسپور کو غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار دے کر انڈیا کے حوالے کر دیا گیا جس کی وجہ سے انڈیا کو کشمیر کے لیے راستہ مل گیا۔ یہیں سے کشمیر کو بھارت کے تسلط میں دینے کی سازش کی ابتدائی ہوئی کیونکہ اگر گورداسپور انڈیا کے پاس نہ جاتا تو کشمیر پر انڈیا کے تسلط کی کوئی راہ نہ تھی۔

(۱۲) کشمیر کی سیاسی جماعتوں میں سے شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس نے انڈیا سے الحاق کا فیصلہ کیا۔ اس جماعت کو ریاستی اسمبلی میں چھ نشستیں حاصل تھیں۔ مسلم کانفرنس نے چوہدری غلام عباس مرحوم اور حضرت مولانا میر واعظ محمد یوسفؒ کی قیادت میں پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد پاس کی۔ اس جماعت کو ریاستی اسمبلی میں ۱۲ نشستیں حاصل تھیں۔ مولانا میر واعظؒ اور چوہدری غلام عباس مرحوم کو گرفتار کر لیا گیا۔

ادھر پونچھ کے غیور نوجوانوں نے ڈوگرہ سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ پیر علی اصغر شاہ صاحب کو امیر المجاہدین بنایا گیا اور سردار عبدالقیوم خان نے جنگ آزادی کی قیادت کی۔ باغ، راولاکوٹ، نیلا بٹ، ہڈا باڑی، نانگا پہاڑ، آندھیری، سوہاوہ وغیرہ مقامات پر مجاہدین آزادی نے بے سروسامانی کے باوجود ڈوگرہ فوج کو شکست دی۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی فوج اور قبائلی مجاہدین بھی ان مجاہدین آزادی کی امداد کو پہنچ گئے اور کم وبیش سوا سال کی جنگ آزادی کے نتیجہ میں مظفر آباد، پونچھ اور میرپور کے اضلاع ڈوگرہ سامراج سے آزاد کرا لیے گئے۔ جن پر آزاد جموں وکشمیر کی حکومت سردار محمد ابراہیم کی صدارت میں قائم کی گئی۔ قیام حکومت کے بعد پونچھ شہر کے حصول کے لیے بھی معرکے ہوئے، ایک موقع پر شہر تین دن تک مجاہدین کے گھیرے میں رہا مگر (اقوام متحدہ کی مداخلت کے نتیجے میں) حکومت پاکستان کی ہدایت پر جنگ بند ہوگئی اور مجبوراً شہر سے پیچھے ہٹنا پڑا۔

(۱۳) گلگت شروع میں کشمیر میں شامل اوراس کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر کشمیر کے ایک انگریز وزیراعظم کالون نے اپنے دورِاقتدار میں اسے براہ راست انگریزی عملداری میں دے دیا۔ تقسیم برصغیر کے وقت انگریز نے پھر اسے مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ کے حوالہ کر دیا جس نے وہاں اپنے عمال مقرر کیے۔ لیکن گلگت کے مسلمانوں نے اس تسلط کو قبول نہ کیا، ڈوگرہ شاہی کے نمائندوں کو بھگا دیا اوراس طرح ہری سنگھ کا تسلط گلگت پر قائم نہ ہوسکا۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور......۲۴ مئی ۱۹۷۴)

تاریخی پس منظراور موجودہ صورتحال

کشمیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے جہاں سب سے پہلے مسلمان حکومت آٹھویں صدی ہجری میں قائم ہوئی اورشاہ میر نے ۷۴۰ھ مطابق ۱۳۳۹ء میں سلطان شمس الدین اول کے لقب کے ساتھ اسلامی اقتدار کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وادی کشمیر مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے ۱۸۴۶ء میں جموں کے ہندو ڈوگرہ خاندان کے تسلط میں چلی گئی جب فرنگی حکمرانوں نے ’’معاہدہ امرتسر‘‘ کے تحت پچھتر لاکھ روپے نانک شاہی کے عوض کشمیر کا یہ خطہ ڈوگرہ خاندان کے راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ مگر جب گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کرنا چاہا تو کشمیر کے مسلم حکمران شیخ امام دین نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور میدان جنگ میں گلاب سنگھ کو شکست دے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد کرنل لارنس کی قیادت میں انگریزی فوج میدان میں آئی اور شیخ امام دین کو شکست دے کر اس نے گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دلا دیا۔ تب سے کشمیری عوام کی جنگ آزادی جاری رہی ہے اور کشمیری مسلمان ڈوگرہ حکمرانوں کے دور سے مسلسل نبرد آزما چلے آرہے ہیں۔

۱۸۳۱ء میں مجاہدین بالاکوٹ کے امیر حضرت سید احمد شہیدؒ کشمیری عوام کی دعوت پر ان کی مدد اور کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے مظفر آباد آرہے تھے اور تاریخی روایات کے مطابق ان کے مجاہدین نے مظفر آباد چھاؤنی کو فتح بھی کر لیا تھا مگر بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی شہادت کے باعث یہ مہم آگے نہ بڑھ سکی۔

۱۹۳۱ء میں ڈوگرہ حکمرانوں کے وحشیانہ مظالم کے خلاف کشمیری مسلمانوں کی مدد کے لیے ’’آل انڈیا مجلس احرار اسلام‘‘ میدان میں آئی اور تیس ہزار کے لگ بھگ رضا کاروں نے ریاست

جموں وکشمیر میں داخل ہو کر گرفتاری دی جبکہ ۲۲ نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اس کے نتیجے میں جموں وکشمیر میں آزادی کے لیے سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا اور باقاعدہ سیاسی جماعتیں تشکیل پائیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے موقع پر توقع پیدا ہوگئی تھی کہ واضح مسلم اکثریت رکھنے اور پاکستان کے پڑوس میں ہونے کے باعث جموں وکشمیر کی ریاست پاکستان میں شامل ہوگی اور کشمیری عوام کو ڈوگرہ خاندان کی ایک سوسالہ غلامی سے نجات مل جائے گی۔ مگر جموں وکشمیر کے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے جموں، کشمیر اور گلگت بلتستان کے شمالی علاقہ جات سمیت پوری ریاست کا بھارت کے ساتھ یک طرفہ الحاق کا اعلان کر دیا اور بھارت نے اپنی فوجیں فوری طور پر ریاست میں داخل کر دیں۔ جس کے خلاف جموں وکشمیر کے مسلمان عوام نے علم جہاد بلند کیا اور قبائل کے غیور پٹھانوں اور پاکستانی فوج کی مدد سے جموں وکشمیر کا وہ خطہ آزاد کرالیا جسے ’’آزاد ریاست جموں وکشمیر‘‘ کہا جاتا ہے اور جس کا دارالحکومت مظفر آباد ہے۔ ادھر گلگت بلتستان اور سکردو کے عوام بھی ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور علم جہاد بلند کر کے اپنے علاقے کو ڈوگرہ خاندان سے آزاد کرالیا۔ یہ علاقہ جموں وکشمیر کے ’’بین الاقوامی طور پر متنازعہ خطہ‘‘ کا حصہ ہے اور تنازع طے ہونے تک حکومت پاکستان نے عارضی طور پر اس خطہ کا انتظام سنبھال رکھا ہے۔

پاکستان کے بجائے بھارت کے ساتھ جموں وکشمیر کے الحاق کی راہ ہموار کرنے میں جہاں ڈوگرہ حکمران ہری سنگھ کی اپنی ریاست کے عوام کے ساتھ غداری کا بڑا رول ہے وہاں قادیانیوں کا کردار بھی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس لیے کہ اس وقت بھارت کے پاس کشمیر میں داخل ہونے کے لیے ایک ہی راستہ تھا جو مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور سے گزرتا تھا۔ مشرقی پنجاب کے بارے میں تقسیم کا یہ فارمولا تھا کہ سرحد کے ساتھ ساتھ جو علاقے مسلم اکثریت کے ہیں وہ پاکستان کا حصہ ہوں گے اور جن میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے وہ بھارت میں شامل ہوں گے۔ اس فارمولے کے مطابق علاقوں کی تقسیم اور بین الاقوامی سرحد کے تعین کے لیے لارڈ ریڈکلف کی سربراہی میں کمیشن کام کر رہا تھا۔ قادیانیوں کا مرکز ’’قادیان‘‘ ضلع گورداسپور میں واقع ہے اور اس ضلع میں آبادی کی پوزیشن یہ تھی کہ اگر قادیانی گروہ اپنا شمار مسلمانوں کے ساتھ کراتا تو ضلع

گورداسپور مسلم اکثریت کا علاقہ قرار پا کر پاکستان میں شامل ہو جاتا۔ اور اگر قادیانیوں کا شمار غیر مسلموں میں ہوتا تو یہ علاقہ غیر مسلم اکثریت کا ضلع قرار پا کر بھارت کا حصہ بنتا۔ یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان آبادی کے تناسب کی کنجی قادیانیوں کے ہاتھ میں تھی مگر قادیانی گروہ نے، جو آج قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بارے میں پاکستانی پارلیمنٹ کے فیصلے کے خلاف پوری دنیا میں شور مچا رہا ہے اور اسے منسوخ کرنے کا مطالبہ کر کے خود کو زبردستی مسلمان کہلانے پر بضد ہے، تقسیم ہند کے موقع پر انہوں نے قادیانی امت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر ریڈ کلف کمشن کے سامنے اپنا کیس مسلمانوں سے الگ اور جداگانہ حیثیت سے پیش کیا جس کی وجہ سے گورداسپور کا یہ علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ تسلیم نہ ہوا اور اسے بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ اسی سے بھارت کو کشمیر میں داخلے کا راستہ ملا اور اس نے فوجیں داخل کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا۔

دوسری طرف مظفر آباد، پونچھ اور میر پور میں کشمیری مجاہدین قبائلی مسلمانوں اور پاکستانی فوج کی مدد سے علم جہاد بلند کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے اور بعض دستے پونچھ شہر اور سری نگر کے نواح میں پہنچ گئے تھے کہ بھارت نے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اقوام متحدہ نے ایک واضح قرارداد کے ذریعے سے کشمیری عوام کے ساتھ یہ وعدہ کرتے ہوئے جنگ بندی کی اپیل کر دی کہ انہیں ان کی آزادانہ مرضی اور عوامی استصواب کے ذریعے سے پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہونے کا حق دیا جائے گا۔

اقوام متحدہ کی اس اپیل پر جنگ بندی کر دی گئی۔ اس وقت تک جتنا حصہ آزاد ہو چکا تھا اس میں میر پور، راولا کوٹ اور مظفر آباد کے علاقوں پر مشتمل ''آزاد ریاست جموں و کشمیر'' کے نام سے آزاد حکومت قائم کر دی گئی جبکہ گلگت بلتستان اور دیگر شمالی علاقہ جات کو حکومت پاکستان نے عارضی انتظام کے طور پر اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اس کے بعد سے کشمیری عوام ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مسلسل یہ آواز بلند کر رہے ہیں کہ بین الاقوامی وعدہ کے مطابق آزادانہ استصواب کے ذریعے سے انہیں حق خود ارادیت کے تحت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے مگر نہ بھارت اس کے لیے تیار ہو رہا ہے اور نہ اقوام متحدہ اور عالمی برادری ہی کشمیری عوام کو ان کا یہ جائز اور مسلمہ حق دلوانے میں کسی سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ جبکہ اس وقت مبینہ طور پر چھ لاکھ کے لگ بھگ انڈین

آرمی جموں وکشمیر کے بھارتی مقبوضہ حصے پر مسلط ہے اور ریاست کے عوام جبر وتشدد کے وحشیانہ ماحول میں سنگینوں کے سائے تلے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کشمیری عوام نے بھارتی مظالم اور اقوام متحدہ کی بے حسی کے خلاف تنگ آ کر متعدد بار ہتھیار اٹھائے اور ہزاروں نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اس دوران میں کئی بار مذاکرات کی میز بچھی مگر نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط اس جدوجہد کا ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور احتجاج اور قربانی کا کوئی مرحلہ بھارت اور عالمی برادری کے طرز عمل میں تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

ریاست جموں وکشمیر کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ بتائی جاتی ہے جس کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ پاکستان اور دیگر ممالک میں مہاجر کے طور پر زندگی بسر کر رہا ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والے کشمیری اپنے اس مطالبہ پر پوری طرح متفق اور اس کے لیے سرگرم عمل ہیں کہ انہیں اقوام متحدہ کے وعدے کے مطابق آزادانہ حق خودارادیت کے ذریعے سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ کشمیر دنیا کے خوبصورت ترین خطوں میں سے ہے اور یہ ایسی جنت نظیر وادی ہے جس کے بارے میں کسی فارسی شاعر نے کہا تھا کہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مگر آج یہ جنت ارضی انڈیا کی چھ لاکھ فوج کی سنگینوں تلے آگ اور خون کا میدان کارزار بن چکی ہے اور اس خطے کے مظلوم مسلمان اپنی آزادی اور دینی تشخص کے لیے قربانیوں کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ یہ تو مسئلہ کشمیر کا تاریخی پس منظر ہے جس کا تعلق ماضی سے ہے اور اس خطے کے عوام کے مسلمہ حقوق سے ہے مگر اس مسئلے کا ایک معروضی تناظر بھی ہے جسے اس موقع پر سامنے رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ:

☆ جس طرح نصف صدی قبل تقسیم ہند کے موقع پر بین الاقوامی قوتوں بالخصوص مغربی استعمار کا مفاد اس میں تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی فضا بہرحال قائم رکھی جائے اور اسی مقصد کے لیے طے شدہ پلان کے مطابق کشمیر کا مسئلہ سازش کے ذریعے سے کھڑا کیا گیا اور پھر اسے کبھی حل نہ کرنے کی پالیسی اختیار کر لی گئی، اسی طرح

آج ان قوتوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ کشیدگی کم ہو اور پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے قریب آ کر اس بین الاقوامی ایجنڈے پر عملدرآمد کی مشترکہ طور پر راہ ہموار کریں جو ''گلوبلائزیشن'' کے نام سے پوری دنیا پر مغرب کی حکمرانی مسلط کرنے کے لیے منظّم طور پر آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

☆ مغربی حکمرانوں کو پاکستان کی ایٹمی طاقت کھٹک رہی ہے کیونکہ یہ مسلم دنیا کی ایٹمی قوت سمجھی جا رہی ہے اس لیے پاکستان کو ایٹمی طاقت سے دستبردار ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے مسئلہ کشمیر کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ضروری سمجھا جا رہا ہے۔

☆ مغربی استعمار کو پاکستان کی فوج کا موجودہ سائز، صلاحیت اور جہاد کے عنوان سے اس کی تربیت کھٹک رہی ہے اور پاک فوج کی ڈاؤن سائزنگ اور اس کا ذہنی رخ بدلنے کے لیے کشمیر کا ٹارگٹ اس کی نگاہوں سے اوجھل کرنا ضروری سمجھا جا رہا، اس لیے بھی مسئلہ کشمیر کا کوئی نہ کوئی حل ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

☆ جہاد کے عنوان سے روسی جارحیت سے نجات حاصل کرنے کے بعد افغان مجاہدین نے وہاں جو اسلامی نظریاتی حکومت قائم کر لی ہے، اس تجربہ کا کشمیر میں اعادہ مغربی استعمار کے نزدیک ناقابل برداشت ہوگا اس لیے بین الاقوامی حلقوں کے نزدیک یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ کشمیر میں کوئی بھی تبدیلی جہاد کے عنوان سے نہ ہو اور بین الاقوامی سیاسی رابطوں کے ذریعے سے اسی طرح کا کوئی حل کشمیریوں پر مسلط کر دیا جائے جیسے ''جنیوا معاہدہ'' کے تحت روسی افواج کو افغانستان سے واپسی کا راستہ دے کر کابل میں ایک کمزور سی حکومت بٹھا دی گئی تھی اور افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کو مستقل طور پر آپس میں لڑاتے رہنے کا اہتمام کر لیا گیا تھا۔

☆ مغربی حکمرانوں کو چین کے خلاف اپنا حصار مضبوط کرنے اور جنوبی ایشیا کو ایک بلاک کی صورت میں چین کے خلاف کھڑا کرنے کے لیے بھی پاکستان اور بھارت کی دوستی اور اشتراک کار درکار ہے اور یہ مسئلہ کشمیر کے کسی نہ کسی حل کے سوا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ چین کے خلاف عسکری مہم جوئی کے لیے جغرافیائی طور پر وادیٔ کشمیر سب سے مضبوط اور

موزوں عسکری مرکز ثابت ہوسکتی ہے اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ پاکستان اور بھارت کسی نہ کسی صورت میں اسے بین الاقوامی کنٹرول کے نام سے مغربی ملکوں کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

☆ بھارت کو ریاست جموں وکشمیر سے دستبرداری میں اپنی روایتی ہٹ دھرمی اور پاکستان دشمنی کے ساتھ ساتھ یہ مشکل پیش آرہی ہے کہ اس کے اپنے مختلف علاقوں میں آزادی کی تحریکات چل رہی ہیں اس لیے کشمیر کو آزادی دینے کی صورت میں مختلف علاقوں کی ان تحریکاتِ آزادی کا راستہ روکنا مشکل ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں بھارت اسی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوسکتا ہے جس طرح جہاد افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین کے حصے بخرے ہو گئے تھے۔

☆ پاکستان کے لیے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے بقول کشمیر ''شہ رگ'' کی حیثیت رکھتا ہے اور کشمیری عوام کے ساتھ پاکستان کے لازوال دینی، ثقافتی اور جغرافیائی رشتوں اور تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے ہے کہ کشمیر اس کے بیشتر دریاؤں کا سرچشمہ ہے اور مستقبل قریب میں پانی کے عالمی سطح پر پیدا ہونے والے متوقع عظیم بحران سے قبل اپنے دریاؤں کے سرچشموں سے دستبرداری پورے پاکستان کو بنجر بنانے اور ایتھوپیا اور سوڈان جیسے خوفناک قحطوں کو قبول کرنے کے مترادف ہوگا۔

اس پس منظر میں جنرل پرویز مشرف مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے مؤثر پیشرفت کا عزم لے کر انڈیا جا رہے ہیں تو بظاہر کسی مثبت پیشرفت کی توقع نہ ہونے کے باوجود ہم ان کے لیے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ پردۂ غیب سے خصوصی اسباب پیدا فرما کر ان کے لیے کامیابی کی راہ ہموار کر دیں تاکہ مظلوم کشمیری عوام کی جدوجہد اپنے منطقی نتیجہ سے ہمکنار ہو اور جنوبی ایشیا کے عوام امن کے ماحول میں سکون کا سانس لے سکیں۔ البتہ اس پرخلوص دعا کے ساتھ ہم جنرل پرویز مشرف سے بطور یاددہانی یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے چار فریقوں کے الگ الگ مفادات یعنی پاکستان، کشمیری عوام، بھارت اور مغربی ممالک کی اس چوکور اور ان کے باہمی مفادات کے ٹکراؤ میں پاکستان اور کشمیری عوام کے مشترکہ مفادات کے حق میں توازن کو قائم رکھنا

ان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے اور مغربی ممالک اور بھارت کے مفادات کے جال میں پھنسنے سے بچ گئے تو وہ نہ صرف پاکستان کی پوری تاریخ کے کامیاب ترین حکمران اور کشمیری عوام کے سب سے بڑے محسن شمار ہوں گے بلکہ جنوبی ایشیا کی تاریخ میں بھی شہاب الدین غوریؒ، محمود غزنویؒ اور ظہیر الدینؒ بابر کی فہرست میں جگہ پانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو دوسری فہرست میر جعفر، میر صادق اور اس قماش کے لوگوں کی ہے۔ خدا نہ کرے، خدا نہ کرے اور خدا نہ کرے کہ ہمارے جنرل صاحب کا نام ایسے لوگوں کے ساتھ نتھی ہو جائے، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... جولائی ۲۰۰۱ء)

کشمیری عوام کے ساتھ بھارت کا وعدہ

ریاست جموں و کشمیر کے عوام نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے اس جدوجہد میں مصروف ہیں کہ بھارت اقوام متحدہ کے فورم پر ان کے ساتھ کیا گیا یہ وعدہ پورے کرے کہ وہ کشمیری عوام کو آزادانہ استصواب کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دے گا اور اقوام متحدہ نے اس خطہ کے عوام کا یہ حق تسلیم کیا تھا کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ پاکستان یا بھارت میں سے جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ اس مقصد کے لیے کشمیری عوام اب تک ہزاروں جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں لیکن بھارت انہیں ان کا جائز حق دینے کی بجائے فوجی قوت کے زور پر دبائے ہوئے ہے اور حریت کا مطالبہ کرنے والوں کو سنگینوں کے ذریعے خاموش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کشمیر، جسے اس کے حسن اور خوبصورتی کی وجہ سے جنت ارضی سے تعبیر کیا جاتا ہے، مسلم اکثریت کا علاقہ ہے اور پاکستان کے ساتھ جغرافیائی اور علاقائی وحدت کے علاوہ قدیم تہذیبی اور دینی رشتوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے کشمیری عوام کی اکثریت کی خواہش ہے کہ ان کی ریاست کا الحاق پاکستان سے ہو اور پاکستانی عوام بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر ان کے لیے ثقافتی اور مذہبی رشتوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اکثر دریاؤں کا سرچشمہ ہونے کی وجہ سے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ دل و جان سے کشمیری عوام کی اس جدوجہد کے ساتھ ہیں اور اسی یکجہتی کا اظہار پاکستانی قوم کی طرف سے پانچ فروری کو ہر سال روایتی جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

کشمیر کی طرف مسلمانوں کی توجہ کا تذکرہ دوسری صدی ہجری کے دوران منصور عباسی کے دور خلافت میں سب سے پہلے ملتا ہے جس میں مؤرخ بلاذری کے بقول سندھ کے حاکم ہاشم بن عمر تغلبی نے ملتان کے بعد کشمیر کی طرف مہم جوئی کی تھی۔ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری میں محمود غزنوی کے کشمیر پر حملے کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے لیکن اس خطہ میں مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ حکومت شاہ میر سواتی نے ۷۴۰ھ میں قائم کی تھی۔ اس کے بعد شاہ میری خاندان کی حکومت سوا دو سو برس سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی اور شاہ میری خاندان کے حکمرانوں میں سے زین العابدین کا تاریخ میں اس حیثیت سے زیادہ نمایاں تذکرہ ملتا ہے کہ اس نے اپنے دور میں عدل وانصاف کی عمدہ مثال قائم کی اور سڑکوں، نہروں اور پلوں کی تعمیر اور دیگر رفاہی کاموں کے ذریعے کشمیری عوام کی بہت زیادہ خدمت کی۔ اکبر بادشاہ کے دور میں کشمیر مغلوں کی سلطنت میں شامل ہوگیا، اس کے بعد جہانگیر، شاہجہان اور اورنگزیب عالمگیر کے مقرر کردہ گورنر کشمیر پر حکومت کرتے رہے اور کم و بیش ایک سو ساٹھ سال تک کشمیر پر مغلوں کی حکمرانی قائم رہی۔ ۱۷۵۳ء کے بعد احمد شاہ درانی نے کشمیر پر قبضہ کرلیا اور افغانوں کی حکومت قائم ہوگئی جس کا تسلسل تقریباً چھیاسٹھ برس تک قائم رہا تا آنکہ پنجاب کے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۹ء میں کشمیر کے افغان گورنر جبار خان کو شکست دے کر کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور اس خطہ کے مسلمانوں پر مظالم کا ایک افسوسناک دور شروع ہوگیا۔ اس دور میں کشمیر کا سفر کرنے والے ایک مغربی سیاح مورکرافٹ کا کہنا ہے کہ:

> ”سکھ کشمیریوں کو حیوانوں سے ذرا بہتر تصور کرتے ہیں۔ اگر کوئی سکھ کسی کشمیری کو مار ڈالے تو حکومت کو سولہ روپے سے لے کر بیس روپے تک قاتل کی طرف سے جرمانہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس رقم سے چار روپے مقتول کے لواحقین کو دیے جاتے ہیں بشرطیکہ مقتول ہندو ہو، اور اگر مقتول مسلمان ہو تو صرف دو روپے لواحقین کو دیے جاتے ہیں۔ بیگار عام ہے، کام لیا جاتا ہے اور کسی کو پائی پیسہ ادا نہیں کیا جاتا۔ لوگوں کو پکڑ لیا جاتا ہے اور رسیوں سے باندھ کر ہانکا جاتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے غلاموں کو ہانکا جاتا ہے۔ گاؤں کے گاؤں خالی پڑے ہیں

اور سنسان ہیں۔ لوگ خوف کے مارے بھاگ گئے ہیں، فصل پکنے پر دس میں سے بعض اوقات نو حصے حکومت لے جاتی ہے اور کسان کے پاس صرف ایک حصہ رہ جاتا ہے۔''

رنجیت سنگھ کے دور میں جموں کے تین ڈوگرہ بھائیوں دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ نے اس کے دربار میں اثر ورسوخ حاصل کر لیا اور اس نے ان کی خدمات پر خوش ہو کر گلاب سنگھ کو جموں، دھیان سنگھ کو پونچھ اور بھمبر، جبکہ سچیت سنگھ کو رام نگر کی حکمرانی بخش دی اور گلاب سنگھ جموں کا راجہ کہلانے لگا۔ یہ تینوں بھائی متعصب ہندو تھے اور ان کے ذریعے ریاست جموں و کشمیر پر ہندوؤں کی حکمرانی کے دور کا آغاز ہو گیا۔

لاہور پر انگریزوں کا قبضہ فروری ۱۸۴۶ء میں ہوا جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جانشینوں کی حکومت کو شکست دے کر فرنگی نے لاہور کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس جنگ میں گلاب سنگھ نے درپردہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔ لاہور پر انگریزوں کے قبضے اور سکھوں کی شکست کے بعد جب سکھوں پر تاوان جنگ ڈالا گیا تو ان کے پاس اس کی ادائیگی کے لیے پوری رقم موجود نہیں تھی۔ چنانچہ گلاب سنگھ نے اس شرط پر وہ رقم انگریزوں کو دینے کا وعدہ کیا کہ جموں کے ساتھ کشمیر کی حکمرانی کا حق بھی اس کے خاندان کے لیے تسلیم کیا جائے۔ یہ شرط منظور کر لی گئی اور ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو گلاب سنگھ اور برطانوی حکومت کے درمیان ''معاہدہ امرتسر'' کے نام سے ایک باقاعدہ معاہدہ طے پایا جس کے تحت گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ روپے کے عوض کشمیر کو انگریزوں سے خرید لیا اور یہ رقم وصول کر کے برطانوی حکومت نے گلاب سنگھ اور اس کی نرینہ اولاد کے لیے کشمیر کی حکمرانی کا حق مستقل طور پر تسلیم کر لیا۔ مگر اس وقت سری نگر میں لاہور کی سکھ حکومت کی طرف سے امام الدین گورنر تھا جس نے کشمیر کا علاقہ گلاب سنگھ کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا اور گلاب سنگھ کو پہلے حملے میں امام الدین کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد کرنل لارنس کی قیادت میں برطانوی فوج نے کشمیر پر حملہ کیا جس کے سامنے امام دین نے ہتھیار ڈال کر کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔ پھر نومبر ۱۸۴۲ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک کم وبیش ایک صدی تک ریاست جموں وکشمیر پر ڈوگرہ ہندو خاندان کی حکومت قائم رہی۔ گلاب سنگھ مسلمانوں کے لیے سکھوں سے بھی زیادہ جابر

حکمران ثابت ہوا، اس کے طرز حکومت کے بارے میں شیخ غلام حیدر چشتی مرحوم اپنی کتاب ''ہنگامہ کشمیر'' میں لکھتے ہیں:

''گلاب سنگھ بے حد سفاک، ظالم، بے رحم اور حریص مہاراجہ تھا۔ اس نے جموں و کشمیر کی حکومت سنبھالتے ہی پہلے تو ڈوگرہ مخالفوں کو ہموار کیا اور اس کے بعد بھمبر، پونچھ، میر پور، راجوری اور کشتواڑ وغیرہ میں مسلمان حکمرانوں کو مکرو فریب سے قابو میں لا کر کسی کو کنویں میں ڈالا، کسی کی آنکھیں نکلوائیں اور کسی کو سامنے کھڑا کر کے کھال اتروائی۔ چنانچہ پونچھ کے ایک مسلمان راجے کو گرفتار کر کے گلاب سنگھ کے سامنے لایا گیا تو اس نے راجے کی کھال اتارنے کا حکم دیا۔ کھال سر کی طرف سے اتارنے میں دماغی صدمے سے آدمی جلدی مر جاتا ہے اور اسے کم اذیت ہوتی ہے لیکن پاؤں کی طرف سے کھال اتارنے میں آدمی دیر تک زندہ رہتا ہے اور مرنے سے پہلے زیادہ دیر تک اذیت اٹھاتا ہے۔ گلاب سنگھ کا ایک بیٹا بھی اس وقت موجود تھا، جب مظلوم راجے کی کھال ٹانگوں سے اوپر ادھڑی جا چکی تو اس دردانگیز نظارے کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے منہ ایک طرف پھیر لیا۔ گلاب سنگھ نے بیٹے کی گردن پکڑ کر یہ کہتے ہوئے اس کا منہ مظلوم راجے کی طرف پھیر دیا کہ اگر بزدلی دکھاؤ گے تو حکومت کیسے کرو گے؟ جب کھال چھاتی تک اتر چکی تو بہادر مسلمان راجے نے جس کے حواس اس وقت تک بجا تھے پہلے پانی پینے کی اور پھر بیوی بچوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن ظالم گلاب سنگھ نے اس کی اس خواہش کو مسترد کر دیا۔ جب کھال گردن تک اتر چکی تو مسلمان راجہ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔''

گلاب سنگھ کے بعد اس کا بیٹا رنبیر سنگھ حاکم بنا، اس کے بعد پرتاب سنگھ نے چالیس برس تک کشمیر پر حکمرانی کی اور اس کے بعد راجہ ہری سنگھ نے یہ گدی سنبھالی۔ اسی کے دور میں ڈوگروں کے بے پناہ مظالم کے خلاف کشمیری عوام نے ۱۹۳۱ء میں بغاوت کی اور کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں آل انڈیا مجلس احرار اسلام نے ''کشمیر چلو'' کی تحریک چلائی جس کے تحت چالیس ہزار کے لگ

بھگ علماء اور کارکنوں نے کشمیر پہنچ کر اپنے کشمیری بھائیوں کی حمایت میں خود کو قید و بند کے لیے پیش کیا۔ جبکہ اکابرین میں سے مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، امیر شریعت چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین اور دیگر سرکردہ حضرات اس تحریک میں گرفتار ہوئے۔ اسی تحریک کے نتیجے میں کشمیر میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور شیخ عبداللہ مرحوم اور چودھری غلام عباس مرحوم جیسے قوم پرست لیڈر ریاست کی افق پر ابھرے۔ اسی مہاراجہ ہری سنگھ کے دور میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی اور پاکستان کے نام سے ایک اسلامی ریاست کا وجود قائم ہوا۔

تقسیم کے طے شدہ اصولوں میں نیم خودمختار ریاستوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ الحاق کر لیں۔ مگر مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کی اکثریتی آبادی کے جذبات اور مرضی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا جس کے خلاف ریاست کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ جموں و کشمیر کے مختلف علاقوں میں مسلح بغاوت ہوئی، علماء کرام نے جہاد کا فتویٰ دیا اور مجاہدین نے سری نگر کی طرف یلغار کر دی۔ قریب تھا کہ مجاہدین سری نگر پہنچ جاتے کہ اقوام متحدہ نے مداخلت کی اور یہ کہہ کر جنگ بندی کرا دی کہ مذاکرات کے ذریعے عوام کا یہ حق تسلیم ہے کہ انہیں آزادانہ استصواب کے ذریعے اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ تب سے بھارت کشمیر پر طاقت کے زور سے قابض ہے اور کشمیری عوام کو خود ارادیت کا مسلمہ حق دینے سے انکاری ہے۔ جبکہ اقوام متحدہ اور عالمی طاقتیں خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہی ہیں اور کشمیری عوام اپنی آزادی اور خود ارادیت کے مسلمہ حق کے لیے مسلسل قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔

اس پس منظر میں ۵ فروری کا دن بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور مظلوم کشمیری مسلمانوں کا حق ہے کہ ان کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا بھرپور انداز میں اظہار کیا جائے اور عالمی رائے عامہ کو ان کے اس جائز حق کی طرف توجہ دلائی جائے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۲ فروری ۲۰۰۵ء)

قادیانی گروہ کا کردار

ریڈکلف باؤنڈری کمیشن اور ضلع گورداسپور

جب پاکستان کے قیام اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب کی تقسیم کا بھی فیصلہ ہوگیا تو پاکستان کے حصے میں آنے والے پنجاب کی حد بندی کے لیے ریڈکلف باؤنڈری کمیشن قائم کیا گیا جس نے متعلقہ فریقوں کا موقف معلوم کرنے کے بعد حد بندی کی تفصیلات طے کر دیں۔ اصول یہ طے ہوا تھا کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی وہ پاکستان میں شامل ہوگا اور جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہوگی وہ بھارت میں رہے گا۔ ضلع گورداسپور کی صورتحال یہ تھی کہ قادیانیوں کا مرکز ''قادیان'' اس ضلع میں تھا اور ان کی بڑی آبادی بھی یہیں تھی۔ اگر ان کی آبادی کو مسلمانوں کے ساتھ شمار کیا جاتا تو یہ علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ شمار ہوتا اور اگر انہیں غیر مسلموں کے زمرہ میں رکھا جاتا تو یہ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ قادیانیوں نے باوجود اس کے کہ وہ خود کو مسلمان کہنے پر ابھی تک مصر ہیں اور اسلام کے نام پر اپنے جھوٹے مذہب کے فروغ میں مصروف ہیں، ریڈکلف کمیشن کے سامنے اپنا موقف مسلمانوں سے الگ پیش کیا جس کی وجہ سے اس علاقہ کو غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار دے کر اسے بھارت میں شامل کر دیا گیا۔

ضلع گورداسپور کی جغرافیائی صورتحال یہ ہے کہ اس وقت کشمیر کو بھارت سے ملانے والا واحد راستہ ضلع گورداسپور سے ہو کر جاتا تھا۔ اگر یہ ضلع پاکستان میں شامل ہوتا تو بھارت کے پاس کشمیر میں مداخلت کا کوئی زمینی راستہ نہیں تھا۔ اس طرح کشمیر بھارت کی دستبرد سے محفوظ رہتا۔ اس پس منظر میں یہ کہا جاتا ہے کہ قادیانیوں نے ریڈکلف کمیشن کے سامنے اپنا موقف مسلمانوں سے الگ پیش کر کے ضلع گورداسپور کو بھارت میں شامل کرنے کا موقع فراہم کیا جس سے بھارت کو کشمیر کے

لیے راستہ ملااوراس نے مداخلت کر کے کشمیر پر قبضہ کرلیا۔اس لحاظ سے کشمیراور اہل کشمیر کی موجودہ غلامی اور مصائب کی ذمہ داری قادیانیوں پر عائد ہوتی ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... جولائی ۱۹۹۰ء)

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کا مذہب ایک نہیں ہے بلکہ دونوں الگ الگ مذہب کے پیروکار ہیں۔اس حقیقت کو قادیانی گروہ بھی تسلیم کرتا ہےاور تاریخ کے ریکارڈ میں اس کی متعدد دستاویزی شہادتیں موجود ہیں جن میں سے بعض کا میں اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

جب پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم ہورہی تھی، پنجاب کی تقسیم کے لیے ریڈکلف کمیشن بنا تھا، پنجاب کو اس بنیاد پر تقسیم کیا جارہا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان میں شامل ہوں گےاور جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں وہ بھارت کا حصہ ہوں گے۔گورداسپور کا علاقہ جہاں قادیان واقع ہے،اس علاقہ کی صورتحال یہ تھی کہ اگر قادیانی آبادی خود کو مسلمانوں میں شامل کراتی تو یہ خطہ زمین پاکستان کے حصہ میں آتا،اور اگر قادیانی گروہ مسلمانوں سے الگ شمار ہوتا تو گورداسپور کا علاقہ بھارت کے پاس چلا جاتا۔اس وقت قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے، جو مرزا غلام احمد قادیانی کا فرزند اور مرزا طاہر احمد کا باپ تھا، اپنا کیس مسلمانوں سے الگ پیش کر کے یہ فیصلہ تاریخ میں ریکارڈ کروایا کہ قادیانی خود کو مسلمانوں سے الگ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ چودھری ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر قادیانیوں کی فائل مسلمانوں سے الگ ریڈکلف کمیشن کے سامنے پیش کی جس کی بنیاد پر گورداسپور غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار پایااور بھارت کے حوالے کردیا گیا۔اس کے نتیجہ میں بھارت کو کشمیر کے لیے راستہ ملااور اس نے کشمیر پر قبضہ کرلیااور آج بھی لاکھوں کشمیری عوام بھارت کے تسلط اور وحشت و درندگی کے خلاف آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں۔

(مرکزی جامع مسجد، برمنگھم، برطانیہ میں خطاب کا کچھ حصہ......۱۶ اگست ۱۹۹۲ء)

مرزا طاہر احمد کی متحدہ ہندوستان کی خواہش

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۱ جون ۱۹۹۱ء کے مطابق سفیر ختم نبوت مولانا منظور احمد چنیوٹی نے

انکشاف کیا ہے کہ قادیانی امت کے سربراہ مرزا طاہر احمد نے ایک حالیہ انٹرویو میں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کو دوبارہ متحد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ انٹرویو بھارت کے انگریزی جریدہ ''مسلم انڈیا'' کی گزشتہ اشاعت میں چھپا ہے جس کے مطابق مرزا طاہر احمد کا کہنا ہے کہ:

> ''پاکستانی انڈین ہیں، اس طرح بنگلہ دیش کے لوگ انڈین ہیں، یہ ایک تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی حقیقت ہے، تاہم آج کے دور کی سیاسی حقیقت نہیں، یہ صرف ایک سیاسی تقسیم ہے۔ ۱۹۴۷ء میں انڈیا، انڈیا اور پاکستان بن گیا، اور ربع صدی میں انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش بن گیا۔ دونوں تقسیمیں بدقسمتی کی بات تھی کیونکہ دونوں مرتبہ بے پناہ انڈینز کو نقصان اٹھانا پڑا۔ سیاسی غلطی کو درست کیا جا سکتا ہے اور جتنی جلد ممکن ہو سکے اسے درست کر لیا جانا چاہیے۔ انڈیا کا پھر متحد ہونا برصغیر کے ان مسائل کا قدرتی حل ہوگا جو طاعون بنے ہوئے ہیں، متحد ہو جانے کے بعد انڈیا میں فرقہ وارانہ کشیدگی ختم ہو کر ہم آہنگی بن جائے گی اور ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب کے لوگ احترام کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر رہ سکیں گے۔''

پاکستان اور بھارت کو دوبارہ متحد کرنے کے عزم کا اظہار مرزا طاہر احمد کے آنجہانی باپ مرزا بشیر الدین محمود نے بھی اپنے ایک نام نہاد کشف کی بنیاد پر قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد کیا تھا لیکن اب اس کا اعادہ ایسی فضا میں ہوا ہے جب کہ امریکہ کے ''نیو ورلڈ آرڈر'' نے جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے بہت سے ممالک کے جغرافیائی مستقبل کو خدشات و شبہات سے دوچار کر رکھا ہے۔ اور لاہور میں امریکی قونصل جنرل رچرڈ مکی کے حالیہ دورہ ربوہ کی درونِ خانہ کہانیاں محبّ وطن اور احساس پاکستانیوں کے قلبی اضطراب کو دوچند کیے ہوئے ہیں۔

اس پس منظر میں مرزا طاہر احمد کے مذکورہ انٹرویو کے مضمرات و مقاصد کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور ملک کے دینی و سیاسی حلقوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس ضمن میں اپنے موقف اور کردار کا بروقت تعین کریں۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... جولائی ۱۹۹۱ء)

سکھ مت اور قادیانیت: دو نئے مذہب

ان دنوں کرتارپور راہداری کے بارے میں بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اخبارات اور سوشل میڈیا پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان بین الاقوامی سرحد پر نارووال سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر کرتارپور ایک جگہ کا نام ہے جہاں تقسیم ملک سے قبل دونوں طرف آنے جانے کا راستہ ہوتا تھا۔ یہ راستہ تقسیم ہند کے وقت بند ہو گیا تھا جسے گزشتہ دنوں کھول دیا گیا ہے اور ۹ نومبر کو پاکستان کے وزیراعظم جناب عمران خان نے اس کا افتتاح کیا ہے۔ یہاں سکھوں کا ایک بڑا گوردوارہ ہے جو ان کے اہم اور مقدس مقامات میں شمار ہوتا ہے، سکھوں کو وہاں آنے جانے کی سہولت فراہم کرنے کے عنوان سے اس راہداری کو باضابطہ صورت دی گئی ہے اور اب وہاں سے بین الاقوامی مسلّمہ دستاویزات کے ساتھ کوئی بھی آ جا سکتا ہے۔

کرتارپور کا علاقہ نارروال، گورداسپور، سیالکوٹ اور شکرگڑھ کے درمیان ہے جن میں سے گورداسپور تقسیم ملک کے وقت سے انڈیا کا حصہ ہے، جبکہ باقی تینوں شہر پاکستان میں شامل ہیں۔ قادیانیوں کا مرکزی مقام ''قادیان'' گورداسپور کے علاقہ میں ہے اس لیے انہیں بھی وہاں سے آمد ورفت کی سہولت مل گئی ہے اور اس سہولت کے حاصل ہونے پر سکھوں کی طرح وہ بھی بہت خوش ہیں۔ اس پر پاکستان کے محبّ وطن اور دینی حلقوں میں مسلسل تحفظات کا اظہار کیا جا رہا ہے جنہیں سمجھنے اور ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پروگرام میں قادیانیوں کی شمولیت موجودہ صورتحال میں اہل پاکستان اور مسلمانوں کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

جہاں تک سکھوں اور قادیانیوں کے باہمی ربط وتعلق کی بات ہے تو وہ قابل فہم ہے اس لیے کہ دونوں نئے مذہب ہیں۔ پانچ سو سال قبل بابا گورونانک نے ہندو مذہب ترک کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی تھی کہ انہیں بت پرستی اور ذات پات سے نفرت تھی۔ چنانچہ اپنا نیا مذہبی راستہ متعین کرنے کے لیے انہوں نے مسلم صوفیائے کرامؒ کے حلقوں میں خاصی دیر آمد ورفت رکھی، بیت اللہ کا حج کیا اور بغداد میں حضرت شاہ عبد القادر جیلانیؒ کے مزار پر چلہ کشی بھی کی، مگر اسلام قبول کرنے کی بجائے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈال دی۔ انہیں سکھوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کا

فرستادہ سمجھا جاتا ہے اور مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی انہیں انبیاء کرام کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ بابا گورونانک کی کتاب ''گوروگرنتھ'' کو الہامی کتاب قرار دیا جاتا ہے اور آسمانی وحی کی طرح اس کی قرائت کی جاتی ہے۔

سکھوں کا سب سے مقدس مقام شیخوپورہ کے علاقہ میں ننکانہ صاحب کا شہر ہے جو بابا گورونانک کا مقام ولادت ہے، جبکہ قادیانیوں کا سب سے مقدس مقام قادیان ہے۔ان دونوں علاقوں کا مرکز پنجاب ہے جس کا مغربی حصہ پاکستان کا اور مشرقی حصہ بھارت کا صوبہ ہے۔ پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے اور اس کے مستقبل کو اپنے نام کرنے کی خواہش دونوں حلقوں میں موجود ہے جسے ان بین الاقوامی طاقتوں اور لابیوں کی حمایت حاصل ہے جو پاکستان کو غیر مستحکم دیکھنا چاہتی ہیں اور اس کے اسلامی نظریاتی تشخص کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ قبل دونوں طرف سے ننکانہ صاحب اور قادیان کو ''اوپن سٹی'' قرار دینے کا مطالبہ بین الاقوامی حلقوں میں مشترکہ طور پر چلتا رہا ہے اور عالمی سیکولر لابیاں اس کی حمایت کرتی رہی ہیں۔

سکھوں نے ''آزاد خالصتان'' کے نام سے ایک عرصہ سے تحریک شروع کر رکھی ہے اور اس سلسلہ میں ''آزاد حکومت'' بھی جگجیت سنگھ چوہان کی سربراہی میں تشکیل ہوئی تھی، جن سے کافی سال پہلے ساؤتھ آل لندن میں حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کے ہمراہ ایک عوامی جلسہ کے اسٹیج پر میری ملاقات ہوئی تھی۔ بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے دور میں ''خالصتان'' کی اس تحریک کے ماحول میں سکھوں کے سب سے بڑے مرکز گولڈن ٹمپل امرتسر میں اسلام آباد کی لال مسجد کے سانحہ کی طرز پر رونما ہونے والا واقعہ قارئین کو یاد ہوگا، جس میں سرکاری مسلح آپریشن کے دوران بہت سے دیگر لوگوں کے ہمراہ سکھوں کی مسلح جماعت کے سربراہ جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ بھی جاں بحق ہو گئے تھے۔آزاد خالصتان کی اس تحریک کے سلسلہ میں عام طور پر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا نام بھی لیا جاتا ہے، جبکہ خود میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ٹورانٹو ایئرپورٹ پر فلائیٹ کے انتظار میں بیٹھا تھا اور میرے ساتھ ایک سکھ سردار صاحب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے سرسری طور پر پوچھ لیا کہ سردار جی آپ کے خالصتان کا کیا بنا؟ انہوں نے بڑی حسرت کے ساتھ جواب دیا کہ

''ساڈا جیا والھق ہی مر گیا، خالصتان کتھوں بنوں؟''

یعنی ہمارا ضیاء الحق ہی فوت ہوگیا ہے اب خالصتان کہاں سے بنے گا؟

اسی طرح ''قادیانیت'' بھی ایک نیا مذہب ہے جو گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے نئی وحی اور نئے نبی کے عنوان سے کام کر رہا ہے مگر سکھوں کی طرح الگ عنوان اور اصطلاحات اختیار کرنے کی بجائے خود کو مسلمانوں میں شمار کرنے پر مصر ہے۔ سکھ مذہب ہندوؤں سے الگ ہو کر بنا ہے اور قادیانی مذہب اسلام کے اجتماعی عقائد اور مسلمانوں کی ملی اساس سے انحراف کر کے تشکیل پایا ہے، اس لیے نئے اور منحرف مذاہب ہونے کے پس منظر میں ان دونوں کے اشتراک عمل کے اسباب سمجھ میں آتے ہیں لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق موجود ہے جسے اس ساری ''گیم'' میں نظر انداز کیا جا رہا ہے اور جسے اس کھیل کا کوئی فریق بھی سمجھنے کے لیے تیار دکھائی نہیں دیتا، جبکہ ہمارے نزدیک یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر اس پوری مہم کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔ سکھوں نے اپنے مذہب کو ہندوؤں سے الگ ایک مستقل مذہب قرار دے رکھا ہے اس لیے ان کے ساتھ اس حوالہ سے ہندوؤں کا کوئی تنازعہ نہیں، بلکہ مسلمانوں کی مذہبی روایات کے ساتھ کسی قدر مماثلت ہونے کے باوجود مسلمانوں کا بھی ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے، چنانچہ مسلمان اور ہندو ایک مستقل مذہب کے طور پر سکھ برادری کے ساتھ معاملات کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے۔ مگر قادیانیت کے پیروکار اسلام اور مسلمانوں سے الگ ہو جانے کے باوجود خود کو مسلمانوں کی صف میں شمار کرانے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہوئے خود کو مسلمان کہلانے پر بضد ہیں، جو مسلمانوں کے لیے کسی درجہ میں بھی قابل قبول بلکہ قابل برداشت نہیں ہے اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے احساسات وجذبات سب کے سامنے ہیں جن کا اظہار پاکستان میں قومی سطح پر کئی بار ہو چکا ہے۔

ہمیں پاکستان کے مفاد میں اور علاقائی صورتحال کے تناظر میں سکھوں کے ساتھ تعلقات از سرنو استوار کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا لیکن اس کے لیے:

(۱) پاکستان کی سالمیت ووحدت اور اسلامی نظریاتی تشخص کے تحفظ کو یقینی بنانا ہوگا، اور

(۲) قادیانیوں کا معاملہ پہلے طے کرنا ہوگا کہ اس منصوبہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھارت سے آنے والے قادیانیوں سے ان کی حیثیت ایک الگ مذہب کے طور پر تسلیم کرائی

جائے، جبکہ پاکستان کے شہری قادیانیوں کو دستور پاکستان اور امت مسلمہ کے اجماعی فیصلے کے سامنے سپر انداز ہونے پر مجبور کیا جائے۔

چنانچہ ہم اس ''گیم'' کے تمام عالمی، علاقائی اور مقامی منصوبہ سازوں سے گزارش کریں گے کہ وہ معاملات کا از سر نو جائزہ لیں اور یہ بات بہرحال ذہن نشین کر لیں کہ جنوبی ایشیا بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں کے عقائد و جذبات کو نظر انداز کر کے ان کی کوئی مہم کامیاب نہیں ہو سکے گی اور انہیں ملت اسلامیہ کے ایمان و عقیدہ اور جذبات و احساسات کا بہرحال احترام کرنا ہوگا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۱۶ نومبر ۲۰۱۹ء)

مسئلہ کشمیر

﴿تحریکات اور جدوجہدِ آزادی﴾

جہادِ کشمیر اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں ’’قراردادِ مقاصد‘‘ کی منظوری بنیادی طور پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ہی کی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ یہ قراردادِ پاکستان کی نظریاتی اساس بنی اور اس نے پاکستان کی دینی حیثیت کو ہمیشہ کے لیے طے کر دیا۔ کشمیر پر بھارت کی فوجی یلغار علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی زندگی میں ہوئی، چنانچہ انہوں نے پاکستان کی سالمیت کے تحفظ اور استحکام کے لیے جہاد کا فتویٰ دیا۔ اور نہ صرف علامہ عثمانیؒ نے بلکہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء کے سرخیل امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لاہور میں ’’دفاعِ پاکستان کانفرنس‘‘ منعقد کر کے اعلان کیا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہمارا جو اختلاف تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے، پاکستان ہمارا وطن ہے اور اس کے ایک ایک چپہ کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔

دستور ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد علامہ شبیر احمدؒ عثمانی اس سلسلہ میں مزید عملی پیشرفت کے لیے اپنے رفقاء کے ساتھ صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ پیغامِ اجل آ پہنچا۔ آپ بہاولپور ریاست کے وزیراعظم کی دعوت پر جامعہ عباسیہ کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے بہاولپور تشریف لے گئے اور وہیں ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مختصر علالت کے بعد عالمِ فانی سے دارِ بقاء کی طرف کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(روزنامہ مشرق، لاہور......۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ء)

آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

کشمیر کے بارے میں ’’ٹریک ٹو پالیسی‘‘ کے پس پردہ بعض سرگرم قادیانیوں کو متحرک دیکھ کر کم و بیش پون صدی قبل کا وہ منظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا ہے جب قادیانی گروہ نے کشمیر پر اپنا جال پھیلانے کے لیے مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ تک کو کچھ دیر کے لیے دام ہمرنگ زمین کا شکار بنا لیا تھا۔ مگر مجلس احرار اسلام خطرہ کی بو سونگھتے ہوئے میدان میں کود پڑی اور اس نے نہ صرف علامہ اقبالؒ کو اس جال سے نکالنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی بلکہ ڈوگرہ سامراج کے مظالم میں مسلسل پستے چلے جانے والے مجبور کشمیری عوام کے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں قادیانیوں کے کشمیر کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو بھی روک دیا تھا۔

یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جب ریاست جموں و کشمیر کے مسلمان عوام ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم اور جبر و تشدد سے تنگ آ کر بغاوت پر اتر آئے تھے اور قرآن کریم کی توہین کے ایک شرمناک واقعہ نے کشمیر کے غیور مسلمانوں کو ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف سڑکوں پر لا کھڑا کیا تھا۔ شیخ محمد عبد اللہ مرحوم اسی احتجاجی تحریک میں منظر عام پر آئے تھے اور پھر اپنی شعلہ نوائی اور قائدانہ صلاحیتوں کے باعث آگے بڑھتے چلے گئے تھے۔ اس موقع پر میاں سر فضل حسین مرحوم جو پنجاب کے ان سرکردہ سیاسی رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے جو تحریک آزادی کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزی حکومت کا سہارا بننے کو ترجیح دیتے رہے، انہوں نے شملہ میں کشمیری عوام کی حمایت کے لیے اپنے سیاسی ذوق کے حامل حضرات پر ایک کشمیر کمیٹی تشکیل دی جس کا سربراہ قادیانی گروہ کے قائد مرزا بشیر الدین محمود کو

بنایا گیا اور چند دیگر سرکردہ مسلمان قائدین کے ساتھ ساتھ علامہ محمد اقبالؒ کو بھی کشمیر کمیٹی کا رکن بنا لیا گیا۔

مرزا بشیر الدین محمود کی سربراہی میں بننے والی کشمیر کمیٹی سے اس کے علاوہ کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی مظلومیت اور جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست جموں و کشمیر میں قادیانی اثر ونفوذ کو فروغ دے گی۔ اور اس کمیٹی میں علامہ اقبالؒ کو شامل کرنے کا مقصد مسلمانوں میں اس عظیم فلسفی شاعر اور مفکر کی مقبولیت کی آڑ میں اپنے لیے پیشرفت کی جگہ بنانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ اس پس منظر میں مرزا بشیر الدین محمود اور ان کے بعض حواریوں کی طرف سے کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کی خواہش کا بھی اظہار ہونے لگا جسے برصغیر کے دیندار مسلمانوں اور خاص طور پر مجلس احرار اسلام نے محسوس کیا۔ احرار رہنماؤں کے وفد نے علامہ اقبالؒ سے ملاقات کر کے انہیں اس خطرہ سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے درخواست کی وہ مرزا بشیر الدین محمود کی سربراہی میں بننے والی کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کریں۔ علامہ اقبالؒ نے یہ درخواست منظور کر لی اور کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد اگست ۱۹۳۱ء کے وسط میں مجلس احرار اسلام نے کشمیری عوام کی حمایت میں خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اکتوبر میں چوہدری افضل حق مرحوم، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم اور خواجہ غلام محمد مرحوم پر مشتمل احرار قائدین کا وفد کشمیری عوام کے مطالبات پر ڈوگرہ حکمرانوں سے بات چیت کے لیے جموں پہنچا مگر بات چیت جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچی تو مجلس احرار اسلام نے کشمیری عوام کی حمایت میں احرار کارکنوں کو کشمیر بھیجنے اور ان کی تحریک میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی دوران امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو دہلی سے گرفتار کر لیا گیا اور ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی جس سے احرار کارکنوں کے جذبات میں مزید جوش وخروش پیدا ہوا۔

نومبر ۱۹۳۱ء میں احرار کارکنوں نے چاروں طرف سے کشمیر پر یلغار کر دی، جہلم سے میر پور، راولپنڈی سے کوہالہ، اور سیالکوٹ سے سچیت گڑھ کے راستے احرار رضا کار کشمیر میں داخل ہونا شروع ہوئے جنہیں ریاست کی حدود میں قدم رکھتے ہی گرفتار کر لیا جاتا۔ تین ماہ کے عرصہ میں چالیس ہزار کے لگ بھگ رضا کاروں کو کنٹرول سے باہر ہوتا دیکھ کر ڈوگرہ حکمرانوں نے دہلی کی

انگریز حکومت سے رابطہ کیا جس نے پہلے جمعیۃ علماء ہند کے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے ذریعہ احرار رہنماؤں سے مفاہمت کا راستہ نکالنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوئی جس پر احرار کے خلاف دار وگیر اور جبر وتشدد کا محاذ دہلی کی انگریز حکومت نے براہ راست سنبھال لیا۔ پھر تحریک کا دائرہ ریاست سے نکل کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ کشمیر کے بعض لیڈروں کو ریاست میں احرار کی مقبولیت بڑھنے سے اپنی قیادت ڈگمگاتی دکھائی دی اور بعض معاصر سیاسی جماعتوں نے بھی تعاون کی امیدیں پوری نہ کیں جس کی وجہ سے مجلس احرار اسلام کی یہ جدوجہد مزید آگے نہ بڑھ سکی۔ البتہ کشمیری عوام میں سیاسی بیداری اور جذبۂ حریت کو فروغ دینے میں اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ ورنہ اگر برصغیر کی دوسری سیاسی جماعتیں بھی اس موقع پر احرار کا ساتھ دیتیں اور ریاست جموں وکشمیر کی مقامی لیڈرشپ احرار کو اپنا حریف قرار دینے کی بجائے دوست اور معاون سمجھ لیتی تو آج اس خطہ کی صورتحال ہی مختلف ہوتی۔

چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد جب مجلس احرار اسلام نے مسلم لیگ کے ساتھ سیاسی مخالفت کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہوئے عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ اور پاکستان کے تحفظ ودفاع کی خاطر متحرک ہونے کا فیصلہ کیا تو لاہور کے کھلے جلسہ میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اس کا شکوہ بھی کیا جسے ''حیاتِ امیر شریعتؒ'' کے مصنف جانباز مرزا مرحوم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب بھارتی حکمرانوں کی طرف سے پاکستان کے خلاف جارحانہ عزائم کا اظہار شروع ہوا تو مجلس احرار اسلام نے جنوری ۱۹۴۹ء کے دوران دہلی دروازہ سے باہر ''دفاع پاکستان کانفرنس'' کے عنوان سے تین روزہ کانفرنس منعقد کی جس میں احرار قائدین نے وطن عزیز پاکستان کے دفاع اور تحفظ کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کا اعلان کیا۔ اس کانفرنس میں جب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ خطاب کر رہے تھے تو ان کی تقریر کے دوران ممتاز کشمیری لیڈر چوہدری غلام عباس مرحوم بھی جلسہ گاہ میں تشریف لائے جن کا احرار کارکنوں نے پرجوش استقبال کیا اور ''کشمیر ہمارا ہے'' کے نعروں کی گونج میں انہیں اسٹیج پر پہنچا دیا۔ اس موقع پر شاہ جی نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

''چوہدری صاحب کی آمد سے بات دوسری طرف چلی گئی عزیزو! خدا

جانے اب آپ کس کشمیر کو لینے کے ارادے کر رہے ہیں یا کس کشمیر کے متعلق سوچتے ہیں؟ ورنہ وہ کشمیر جو ذہنوں میں جنت کا نشان ہے جس کے متعلق میری رائے ہے کہ پروردگار عالم نے آسمانوں پر اپنی موجودگی میں تیار کروا کر اسے زمین پر اتار دیا وہ جنت کا ایک ٹکڑا ہے، جس پر اب نہیں ۱۹۳۱ء سے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ اس زمانے میں ہم نے اسی کشمیر کے متعلق مسلمانوں سے بات کہی تھی لیکن اس وقت کے رئیس مسلمانوں نے جن کا تعلق فرنگی ایوانوں سے تھا ہماری بات نہ سنی۔ اگر اس زمانے میں جب ہم نے چالیس ہزار کے قریب مسلمانوں کو جیل میں بھجوایا اور بائیس نوجوانوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے جام شہادت نوش فرمایا تھا، ہماری بات مان لی ہوتی تو آج کشمیر کا نقشہ یہ نہ ہوتا۔ خیر۔۔۔ اب آپ بھی سن لیں اور چوہدری صاحب بھی! کشمیر تو آپ اپنے ہاتھ سے دے چکے، اگر فائر بندی کی بات نہ ہوتی تو ممکن ہے کوئی بات بن جاتی۔ مگر اب تو میری بات لکھ کر جیب میں ڈال لو کہ فرنگی اور ہندو اب آپ کو کشمیر نہیں دیں گے۔ ہاں اگر کبھی فرنگی کو ضرورت ہو کہ وہ اس مستقل فساد کو ختم کرنا چاہے تو ممکن ہے اس کا کچھ حصہ آپ کے پاس آجائے۔“

شاہ جیؒ کا مطلب یہ تھا کہ جب ۱۹۴۸ء میں کشمیری مجاہدین اور ان کے ساتھ آزاد قبائل کے غیور مسلمان سری نگر اور پونچھ میں داخل ہو رہے تھے اس وقت جنگ جاری رکھنے کی بجائے سیز فائر قبول کر کے ہندوستان کو کشمیر پر مسلح قبضے کا موقع فراہم کیا گیا، اس لیے اب بھارت آسانی سے کشمیر نہیں چھوڑے گا اور نہ ہی فرنگی کشمیر کو پاکستان کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہوگا۔

اس پرانی داستان کو دہراتے ہوئے میرے ذہن میں دو سوال ابھر رہے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ آج پھر جبکہ مجاہدین کشمیر نے انڈین آرمی کے لیے کشمیر میں زیادہ دیر تک براجمان رہنے کو مشکل تر بنا دیا ہے اور بھارت ایک بار پھر سیز فائر کے نام سے اپنے اکھڑے ہوئے قدم دوبارہ جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے تو کیا ہمارے حکمران پھر سے بھارت کو کشمیر میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا موقع دینے کے لیے تیار ہو جائیں

گئے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ آج پھر کشمیر کی صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے ''قادیانی لابی'' سرگرم عمل ہے اور اس کے دام ہمرنگ زمین میں بڑے بڑے خوشنما چہرے اور متبرک نام شکار ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ تو کیا آج چوہدری افضل حقؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا مظہر علی اظہرؒ، شیخ حسام الدینؒ، اور ماسٹر تاج الدین انصاریؒ کا کوئی وارث زندہ نہیں ہے جو کشمیر کی طرف قادیانیوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی راہ روک لے اور آج کے دانشوروں آج کے بشیر الدین محمودوں کے جال میں پھنسنے سے بچالے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ...... ۷ جون ۲۰۰۱ء)

مسئلہ کشمیر اور مسلم سربراہ کانفرنس لاہور

قائد جمعیۃ علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود نے سکھر میں اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ مسلم سربراہ کانفرنس میں عالمِ اسلام کے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ مسئلہ کشمیر پر بھی غور کیا جائے۔ ادھر معروف کشمیری راہنما میر واعظ مولانا محمد فاروق نے بھی کانفرنس کے ایجنڈے میں مسئلہ کشمیر کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

مسئلہ کشمیر قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مسلسل کشیدگی کا باعث چلا آ رہا ہے اور دو سے زائد بڑی جنگوں کا محرک بن چکا ہے۔ اور اس سے نہ صرف برصغیر اور ایشیا بلکہ پوری دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے مسلم سربراہ کانفرنس کے موقع پر اس مسئلہ کو اہمیت نہ دینا حقائق سے آنکھیں موند لینے کے مترادف ہوگا۔ کشمیر کا مسئلہ دراصل ایک سازش کے تحت جنم دیا گیا ہے۔ برٹش سامراج نے برصغیر کی تقسیم کے بعد دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے لڑائے رکھنے اور اس خطہ کے عوام میں نفرت اور عداوت کی آگ گرم رکھنے کی غرض سے اس مسئلہ کو جنم دیا تھا۔

تقسیم کے مسلّمہ اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے گورداسپور کے ہندو اقلیت کے علاقہ کو ہندوستان میں شامل رکھ کر ہندوستان کو کشمیر کے لیے راستہ دینے کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ کشمیر کی وادی کو بھارت کے تسلط میں دے دیا جائے تاکہ نوزائیدہ پاکستان اپنی فلاح و ترقی کی طرف توجہ دینے کی بجائے تمام تر قوت اس مسئلہ پر خرچ کرتا رہے، اور دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ملک ہونے کی حیثیت سے عالمِ اسلام کے اتحاد اور ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے اپنا کردار ادا نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں قادیانی سازشوں اور سرحدات کے تعین میں ظفر اللہ خان کے کردار کو نظر

اندازنہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ تقسیمِ ہند کے بعد یہ مسئلہ دو ملکوں کے درمیان مستقل نزاع وفساد کی کی بنیاد بن گیا جس کی وجہ سے پاکستان جیسا غیر ترقی یافتہ ملک اپنے محدود وسائل کا معتد بہ حصہ دفاع کے لیے مختص کرنے پر مجبور ہے۔

آج صورتحال یہ ہے کہ کشمیر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور دونوں حصوں کے عوام کا آپس میں رابطہ معطل ہے۔ مقبوضہ کشمیر پر بھارت کا شکنجہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا ہے اور اقوامِ متحدہ میں کشمیری عوام کے لیے خود ارادیت کا حق تسلیم کر لینے کے بعد بھی بھارت ان مظلوم مسلمانوں کو یہ حق دینے پر آمادہ نہیں۔ بے شمار کشمیری نوجوان جیلوں میں محبوس ہیں۔ ربع صدی سے کشمیر کو انتخابی نعرے کے طور پر استعمال کرنے والے پاکستانی لیڈروں کی منافقت اور بدعملی نے کشمیری عوام کو حوصلہ دلانے کی بجائے ان کی مایوسیوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور اب انہیں موجودہ صورتحال پر قناعت کا سبق دینے کے ساتھ ساتھ در پردہ اس کے انتظامات بھی کیے جا رہے ہیں۔ آج کشمیر کی نئی پود ایک طرف کشمیری عوام کی قربانیوں اور دوسری طرف بھارت کے ظلم وتشدد، اقوامِ متحدہ کے جمود اور پاکستانی حکمرانوں کی دورُخی کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا ہمیں اپنی منزل کے تعین اور راستہ کی جدوجہد میں ان سہاروں سے بے نیاز تو نہ ہونا پڑے گا۔

ہم عالمِ اسلام کے راہنماؤں سے درخواست کریں گے کہ کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمان بھائیوں کو بے یقینی کی اس کیفیت سے نجات دلائیں اور ان کو حقِ خود ارادیت سے بہرہ ور کرنے کے لیے اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کریں تاکہ کشمیر کے مسلمان بھی عالمِ اسلام کے اتحاد کی مقدس جدوجہد میں اپنا رول ادا کر سکیں۔ اور پاکستان پہلے سے زیادہ توانائی اور استحکام کے ساتھ عالمِ اسلام کے تعمیری مشن میں شریک ہو سکے۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور......۱۵ فروری ۱۹۷۴ء)

جموں و کشمیر کے نوجوانوں کی خدمت میں!

جمعیۃ طلباء اسلام جموں و کشمیر کے زیر اہتمام ۲۶ و ۲۷ مئی کو باغ ضلع پونچھ میں طلبہ کا ایک عظیم الشان کنونشن منعقد ہو رہا ہے جس میں آزاد کشمیر کے دینی مدارس اور کالجوں کے طلبہ شریک ہوں گے۔ آزاد کشمیر کے علماء کرام کے علاوہ قائد جمعیۃ علماء اسلام پاکستان حضرت مولانا مفتی محمود صاحب بھی اس میں شرکت فرمائیں گے۔ یہ کنونشن آزاد کشمیر کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے اور جمعیۃ طلباء اسلام کے باہمت نوجوانوں نے یہ ذمہ داری قبول کر کے ایک اہم قدم اٹھایا ہے جس کے اثرات آزاد کشمیر کی تاریخ میں دوررس اور وقیع ہوں گے۔

ریاست جموں و کشمیر کے عوام ایک عرصہ سے ڈوگرہ سامراج اور پھر ہندوستانی حکومت کے مظالم کے خلاف نبرد آزما ہیں اور آزادی کی جنگ میں مصروف ہیں۔ برصغیر کے علماء حق نے اہل کشمیر کے اس جائز حق اور جدوجہد کی ہمیشہ حمایت کی ہے۔ اب سے نصف صدی قبل تحریک کشمیر کو اجاگر کرنے میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے باہمت رفقاء کی بے مثال جدوجہد، احرار کے پلیٹ فارم پر ہزاروں کارکنوں کی گرفتاریاں اور سیاسی سطح پر جمعیۃ علماء ہند کے قائدین حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور حضرت مولانا احمد سعیدؒ کی مساعی جمیلہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد بھی کشمیر کے حریت پسندوں کو پاکستان کے علماء حق کا تعاون اور سرپرستی حاصل رہی۔ پاکستان کے عوام کو مسئلہ کشمیر سے آگاہ رکھنے میں علماء کرام کے بے مثال کردار سے

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بین الاقوامی کانفرنسوں اور دوروں میں قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی طرف سے کشمیری عوام کے جائز موقف کی دوٹوک حمایت ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اور آج جبکہ آزاد کشمیر کے دینی مدارس اور کالجوں کے طلباء کی مشترکہ تنظیم جمعیۃ طلباء اسلام جموں وکشمیر نے نئی پود کو صحیح قیادت فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو قائد علماء حق حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کشمیری نوجوانوں کے اس مبارک فیصلہ کی تائید وحمایت کے لیے خود باغ آزاد کشمیر تشریف لے جا رہے ہیں۔

آزاد کشمیر میں طلبہ کے اس کنونشن کی اہمیت جس قدر زیادہ ہے اسی قدر جمعیۃ طلباء اسلام سے وابستہ نوجوانوں کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ اور یہ مرحلہ ایسا ہے کہ صحیح فکر رکھنے والے تمام کشمیری طلباء کو مل جل کر اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کنونشن کو زیادہ سے زیادہ بامقصد اور کامیاب بنانے کے لیے صرف کر دینی چاہئیں۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور...... ۳ مئی ۱۹۷۴ء)

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے راہنما

مولانا محمد یوسف خانؒ کی یادداشتیں

دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری آزادکشمیر کے بانی و مہتمم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف خان آزادکشمیر کے ان بزرگ علماء میں سے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے جہادِ آزادی کو منظّم کرنے میں سرگرم کردار ادا کیا، اس میں عملی حصہ لیا اور آزاد کشمیر کی ریاست قائم ہونے کے بعد اس میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے سرگرم عمل ہو گئے جس کے نتیجے میں آزاد کشمیر میں سرکاری طور پر قضا اور افتا کے شرعی محکمے الگ الگ کام کر رہے ہیں، ہر ضلع اور تحصیل میں ججوں کے ساتھ جید علماء کرام بطور قاضی بیٹھ کر مقدمات کی سماعت کرتے ہیں اور شرعی قوانین پر عمل درآمد کی نگرانی کرتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف خان جہاد کشمیر کے اس مرحلہ اور اسلامائزیشن کے اس عدالتی عمل کے عین گواہ ہیں اور علماء کرام کی اس کھیپ میں سے غالباً واحد بزرگ باقی رہ گئے ہیں۔ جبکہ ان کے دیگر رفقاء مولانا مفتی امیر عالم خان، مولانا محمد عبد اللہ کفل گڑھیؒ، مولانا عبد الحمید قاسمیؒ، مولانا محمد عبد اللہ سیاکھویؒ، مولانا مفتی عبد المتینؒ، مولانا امیر الزمان خانؒ اور دیگر بزرگ عالم آخرت کو سدھار چکے ہیں۔ مولانا محمد یوسف خان کے ساتھ میری نیازمندی بہت پرانی ہے، وہ میرے والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کے دورۂ حدیث کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں اکٹھے دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے سند فراغت حاصل کی تھی۔ اس نسبت سے ان کے ساتھ میرا تعلق چچا بھتیجے کا ہے اور اس حوالے سے ان کی شفقتوں اور دعاؤں سے ہمیشہ فیض یاب ہوتا رہتا ہوں۔

مولانا موصوف آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں اور آل جموں و کشمیر جمعیۃ علماء اسلام کے امیر کی حیثیت سے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے فرزند برادرم مولانا سعید یوسف خان کی دعوت اور اصرار پر اپنے معمول کے خلاف جمعہ کے روز پلندری جانا ہوا اور دارالعلوم تعلیم القرآن کی جامع مسجد میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کیا تو اس موقع پر فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا محمد یوسف خان کے ساتھ بھی ایک نشست کر ڈالی جس کا مقصد جہاد کشمیر میں علماء کرام کے کردار اور آزاد کشمیر میں افتا اور قضا کے شرعی محکموں کے قیام میں علماء کرام کے حصے کے بارے میں ان کے مشاہدات کو کریدنا تھا تاکہ نئی نسل اس سے آگاہ ہو اور تاریخ اپنے ریکارڈ کے اس اہم حصے سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ ان دونوں موضوعات پر ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

شہدائے بالاکوٹ اور کشمیری مجاہدین

مولانا محمد یوسف خان نے بتایا کہ کشمیر کی آزادی اور اسے ایک مکمل اسلامی ریاست بنانے کے لیے کشمیری عوام کی جدوجہد کا سلسلہ بہت پرانا ہے اور کشمیری مجاہدین امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے اس جہاد میں بھی شریک رہ چکے ہیں جس کا اصل ہدف کشمیر پر قبضہ کرنا اور اسے تحریک آزادی کا بیس کیمپ بنانا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ بالاکوٹ کی طرف شہدائے بالاکوٹ کے قافلہ کی آمد کا مقصد بالاکوٹ کا علاقہ نہیں بلکہ مظفر آباد تھا جس پر قبضہ کے لیے وہ تیاریاں کر رہے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کی فوجوں نے بالاکوٹ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور وہ علاقہ کے کچھ لوگوں کی مخبری پر شیر سنگھ کی فوجوں کے گھیرے میں آ کر شدید مقابلہ کے بعد جام شہادت نوش کر گئے۔ شہدائے بالاکوٹ کے ساتھ ان جنگوں میں ریاست پونچھ کے بہت سے لوگ شریک تھے، چنانچہ بالاکوٹ کے اس معرکہ کے بعد پونچھ کے مجاہدین آزادی کو سزا دینے کے لیے جموں کا ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ خود اس علاقہ میں آیا اور اس نے چن چن کر ایسے لوگوں کو گرفتار اور قتل کیا جن کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہ شہدائے بالاکوٹ کے ساتھ پشاور سے بالاکوٹ تک کی جنگوں میں شریک رہے ہیں۔ ہزاروں مسلمان گرفتار کیے گئے، سینکڑوں کو جموں لے جایا گیا، بیسیوں افراد کے سر کاٹ کر ان کے سروں کی پلندری اور گردونواح میں نمائش کی گئی اور آزادی کے دو متوالوں

سردار سبز علی خان شہیدؒ اور سردار ملی خان شہیدؒ کو راجہ گلاب سنگھ نے اپنے سامنے درختوں کے ساتھ الٹا لٹکا کر زندہ حالت میں ان کی کھالیں اتروا دیں۔ یہ واقعہ ۱۹۳۲ء کا ہے اور اس کی یادیں ابھی تک علاقہ کے پرانے بزرگوں کے دلوں میں تازہ ہیں جو انہوں نے اپنے باپ دادا سے سن رکھی ہیں۔

اس موقع پر مولانا محمد یوسف خان کے ساتھ ہماری مجلس میں موجود ایک بزرگ نے کہا کہ گلاب سنگھ کی طرف سے مسلمانوں کے قتل عام پر انعام مقرر کیا گیا تھا کہ جو کسی مجاہد کا سر لائے گا، اسے آٹھ آنے ملیں گے اور ان کے کسی حمایتی مسلمان کا سر لانے والے کو چار آنے انعام دیا جائے گا۔ اسی مجلس میں مولانا سعید یوسف خان نے بتایا کہ ان واقعات کا تذکرہ خود راجہ گلاب سنگھ نے اپنی ڈائری ’’گلاب نامہ‘‘ میں اور میجر اسمتھ نے اس علاقہ کی تاریخ میں کیا ہے۔ گلاب سنگھ نے اپنی ڈائری میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب درخت سے الٹے لٹکے ہوئے دو زندہ مجاہدوں سبز علی خان شہیدؒ اور ملی خان شہیدؒ کی کھالیں سینے تک اتر گئیں تو انہوں نے پیاس اور تکلیف کی شدت کے باعث پانی مانگا تو گلاب سنگھ نے انہیں پانی دینے سے انکار کر دیا اور اسی حالت میں وہ دونوں مجاہد جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ جہاد آزادی میں شرکت کی تھی اور کشمیر کو سکھوں کے اقتدار سے نجات دلا کر ایک آزاد اسلامی ریاست بنانے کی مہم میں شامل ہو گئے تھے جو پورے ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک ’’بیس کیمپ‘‘ کے طور پر مجاہدین کا مرکز سکتی تھی، مگر بالاکوٹ میں مجاہدین کی شکست سے اس جدوجہد کا باب بند ہو گیا۔

۱۹۳۱ء میں ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف عوامی بغاوت

کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف عوامی بغاوت کا دوسرا مرحلہ ۱۹۳۱ء کا ہے جس میں ڈوگروں کے وحشیانہ مظالم کے خلاف کشمیری عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس احرار اسلام نے پورے ہندوستان سے ان کی حمایت میں رضا کار کشمیر بھجوانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ڈوگرہ پولیس سے تصادم کے نتیجے میں بیسیوں مجاہد شہید ہوئے اور کم و بیش تیس ہزار افراد نے گرفتاری پیش کی جن کے لیے ریاست جموں و کشمیر کی جیلیں تنگ پڑ گئیں اور انہیں حراست میں رکھنے کے لیے کیمپ قائم کرنا پڑے۔ اس تحریک میں رضا کار بھجوانے کے اہم مراکز میں گوجرانوالہ اور سیالکوٹ بھی شامل

ہیں جہاں کے پرانے بزرگ اب بھی اس دور کے واقعات مزے لے لے کر سناتے ہیں۔

مگر مولانا یوسف خان اپنی یادداشتوں کے سلسلہ کا آغاز ۱۹۴۳ء سے کرتے ہیں جب وہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر اپنے علاقہ منگ آزاد کشمیر میں آئے، ان کی عمر اس وقت پچیس سال تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں رہ کر آئے تھے اور حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی جیسے مجاہد آزادی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا، اس لیے سینے میں آزادی کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ موج زن تھا اور آتے ہی ایک دل خراش واقعہ کا سامنا کرنا پڑا جس نے ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف نفرت کی آگ اور بھڑکا دی۔ واقعہ یہ تھا کہ علاقہ کا ایک مسلمان نمبردار زمان علی قتل ہوگیا۔ قاتل ہندو تھا جسے مقدمہ چلائے جانے کے بعد صرف دوسال قید کی سزا سنائی گئی جبکہ ان دنوں ریاست میں گائے ذبح کرنے پر پابندی تھی اور اس کی سزا سات سال قید مقرر تھی۔ مولانا محمد یوسف خان شعبان میں دیوبند سے فارغ ہوکر آئے اور رمضان المبارک کے بعد عیدالفطر کے روز منگ کی عیدگاہ میں نماز عید کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ''کھڑاک'' کردیا۔ انہوں نے ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم اور مذکورہ بالا مقدمہ کے حوالے سے مسلمانوں کو غیرت دلائی اور ڈوگرہ حکومت کو سرعام للکارا جس کے نتیجے میں وہ گرفتار کر لیے گئے۔ ایک ماہ حوالات میں رہے، پھر تین ماہ قید کی سزا سنائی گئی اور نصف کے قریب سزا بھگت چکے تھے کہ پونچھ کے مسلمان سیشن جج نے اس تنبیہ کے ساتھ انہیں رہا کردیا کہ ''مولوی صاحب! اتنی گرم تقریر نہ کیا کرو۔''

یہ مولانا یوسف خان کی عملی زندگی کا آغاز تھا جس کے بعد انہوں نے پلندری کے عوام کی خواہش پر پلندری کی مرکزی جامع مسجد میں ڈیرہ ڈال لیا اور دارالعلوم تعلیم القرآن کے نام سے دینی درس گاہ کا آغاز کیا جو اب آزاد کشمیر کے سب سے بڑے دینی تعلیمی ادارے کے طور پر تعلیمی خدمات میں مصروف ہے۔

تقسیمِ ہند اور مسئلہ کشمیر

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی اور کشمیر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو پونچھ کے عوام نے ڈوگرہ حکمرانوں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد یوسف خان اور ان کے رفیق کار مولانا عبدالعزیز تھوراڑوی نے علماء کرام سے رابطہ قائم کر کے ان کی مشاورت کا

اہتمام کیا جس میں مولانا محمد عبداللہ کفل گڑھیؒ، مولانا مفتی عبدالحمید قاسمیؒ، مولانا مفتی امیر عالم خانؒ، مولانا مظفرحسین ندوی، مولانا عبدالرحمٰن عباس پوریؒ، مولانا حکیم حیات علی میر پوریؒ، مولانا عبدالرحمٰن مظفر آبادیؒ اور دیگر سرکردہ علماء کرام شریک ہوئے۔ یہ مشاورت ۲۲ جولائی کو ہوئی جس میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کرتے ہوئے سب علماء کرام نے حلف اٹھایا جبکہ اس کے ایک ماہ بعد نیلا بٹ میں سردار محمد عبدالقیوم خان والی مشاورت ہوئی اور اس میں بھی بغاوت کا حلف اٹھایا گیا۔ اس حوالے سے تحریک آزادی کشمیر میں پہل کرنے کا اعزاز علماء کرام کو حاصل ہوا۔

مولانا محمد یوسف خان اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ تقسیم ہند کا فیصلہ ہوتے ہی ڈوگرہ حکمرانوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کشمیر کے مسلمان انہیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کریں گے، اس لیے انہوں کے حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے جگہ جگہ امن کمیٹیاں قائم کرنا شروع کر دیں، مگر مذکورہ بالا علماء کرام نے ان کمیٹیوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ہر علاقہ کے عوام کو ان میں شرکت سے منع کیا اور پھر ۲۲ جولائی کی مشاورت میں ڈوگرہ راج کو مسترد کرنے کا باقاعدہ فیصلہ کیا گیا۔ اسی دوران سردار محمد ابراہیم خان جو ریاستی اسمبلی کے ممبر تھے، سری نگر چھوڑ کر مری آ گئے اور حریت پسندوں کو منظّم کر کے آزاد حکومت کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں تو علماء کرام ان کے ساتھ ان کوششوں میں شریک ہو گئے۔

کشمیریوں کا جہادِ آزادی

اس جہاد آزادی میں جن علماء کرام نے خود عملاً حصہ لیا، ان میں مولانا محمد یوسف خان، مولانا مفتی امیر عالم خانؒ، مولانا عبدالحمید قاسمیؒ، مولانا محمد عبداللہ کفل گڑھیؒ، مولانا عبدالرحمٰن عباس پوریؒ، مولانا عبدالرحمٰن مظفر آبادیؒ اور مولانا مظفرحسین ندوی شامل ہیں جن میں سے اول الذکر مولانا محمد یوسف خان اور آخر الذکر مولانا مظفرحسین ندوی ابھی تک بقید حیات ہیں جبکہ باقی بزرگ عالم بقاء کو سدھار چکے ہیں۔ پونچھ کے معرکہ میں مولانا محمد کریم اور باغ کے معرکہ میں مولانا جلال الدین نے جام شہادت نوش کیا جبکہ ارجہ تحصیل دھیر کوٹ کے مولانا خدا بخش مرحوم نے جنگ میں سب سے پہلی گولی چلانے کا اعزاز حاصل کیا جن کے فرزند مولانا عبدالحئیؒ آج کل مدنی مسجد دھیر کوٹ کے خطیب ہیں۔

مولانا محمد یوسف خان نے بتایا کہ جہادِ کشمیر کے اس مرحلہ میں جس کے نتیجے میں آزاد جموں وکشمیر کی حکومت قائم ہوئی، صوبہ سرحد کے اس وقت کے وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم خان مرحوم کا بھی بڑا کردار ہے جنہوں نے جہادِ کشمیر کے لیے آنے والے قبائلی مجاہدین کو سہولتیں مہیا کیں اور ان کی وساطت اور کوشش سے مجاہدین کشمیر کو درہ سے اسلحہ کی بہت بڑی مقدار حاصل ہوئی جس سے مجاہدین نے جنگ لڑی اور اس خطہ میں ایک آزاد حکومت قائم ہوگئی جس کے پہلے سربراہ سردار محمد ابراہیم خان تھے۔

مولانا موصوف کا کہنا ہے کہ اگر اس وقت ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف کشمیری علماء اور عوام کے جوشِ آزادی میں مداخلت نہ کی جاتی اور بین الاقوامی دباؤ کو قبول کر کے سیز فائر قبول نہ کیا جاتا تو آج صورتحال مختلف ہوتی، مگر اقوام متحدہ نے کشمیری عوام کو بھی آگے بڑھنے سے روک دیا اور خود بھی مسئلہ کشمیر کی فائل کو نصف صدی سے گھٹنوں کے نیچے دبائے بیٹھی ہے۔

آزاد جموں وکشمیر کی حکومت کا قیام

علماء کے نزدیک آزادی کی تحریک اور اسلامی نظام کا نفاذ آپس میں لازم وملزوم ہیں بلکہ آزادی کی جدوجہد کا مقصد ہی نفاذِ اسلام ہوتا ہے، ورنہ تحریکِ آزادی ان کے نزدیک بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے۔ شہدائے بالاکوٹ کی حکومت پشاور سے لے کر طالبان کی حکومت افغانستان تک ایک تسلسل ہے جو اس فلسفہ جہاد کے عملی مظاہر کی نشاندہی کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب مظفر آباد، پونچھ اور میرپور کے اضلاع پر مشتمل آزاد جموں وکشمیر کی حکومت سردار محمد ابراہیم خان کی سربراہی میں قائم ہوئی تو جہادِ آزادی کو منظم کرنے اور اس میں عملی حصہ لینے والے علماء کرام نے آزاد حکومت کے قیام کے ساتھ ہی اسلامی قوانین کے عملی نفاذ کی طرف پیشرفت شروع کر دی اور آپس میں مشورہ کر کے مختلف علاقوں میں شرعی قاضی مقرر کیے جنہوں نے لوگوں کے مقدمات سن کر فیصلے کرنا شروع کر دیے۔

چنانچہ راولاکوٹ میں مولانا عبدالعزیز تھوراڑوی، باغ میں مولانا محمد عبداللہ کفل گڑھی، عباس پور میں مولانا عبدالرحمٰن اور منگ میں مولانا نذیر احمد کو قاضی مقرر کیا گیا۔ ان قاضیوں نے عدالتی کام کا آغاز کیا تو پہلے سے چلی آنے والی سول عدالتوں کے ساتھ تصادم ناگزیر تھا اور اس کا آغاز راولا

کوٹ سے ہوا جہاں کے قاضی مولانا عبد العزیز تھوراڑوی اور سب جج سردار محمد یوسف شریف تھے جو بعد میں چیف جسٹس کے منصب تک پہنچے اور اسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان دونوں میں راولاکوٹ کے ایک جلسہ میں اسی مسئلہ پر تلخ کلامی ہوگئی۔ جلسہ میں صدر ریاست سردار محمد ابراہیم خان بھی موجود تھے۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو سردار شریف نے کہا کہ مولوی صاحب نے متوازی عدالت قائم کر رکھی ہے جبکہ مولانا عبد العزیز نے کہا کہ سردار شریف صاحب شرعی قوانین کو تسلیم نہیں کر رہے۔ اس پر سردار محمد ابراہیم خان نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سرکردہ علماء کرام کو مشاورت کے لیے طلب کر لیا۔ اس وقت آزاد حکومت کا مرکز پلندری تھا اور مولانا محمد یوسف خان کی معیت میں سرکردہ علماء کرام نے صدر حکومت سے ملاقات کی جس میں کابینہ کے دیگر افراد بھی موجود تھے۔ علماء کرام نے ان پر واضح کیا کہ ہمارے نزدیک تو آزادی کا مقصد ہی شرعی قوانین کا نفاذ ہے، اس لیے ہم شرعی عدالتوں سے کم کسی بات کو قبول نہیں کریں گے۔ حکومت نے غور کے لیے ایک ہفتہ کا وقت طلب کیا اور اس کے بعد ان علماء کو بتایا کہ سردست ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ محکمہ افتاء قائم کر کے سرکاری طور پر تحصیل اور ضلع کی سطح پر مفتی مقرر کر دیں جو ججوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی دینی رہنمائی کریں۔ کچھ عرصہ بعد جب ان علماء کو عدالتی کام کا تجربہ ہو جائے گا تو انہیں باقاعدہ قاضی کا درجہ دے دیا جائے گا۔

علماء کرام نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور ضلع مفتیوں کے تقرر کے لیے نام تجویز کرنے کا کام مولانا محمد یوسف خان کے سپرد ہوا اور ان کی مشاورت سے اس وقت کی نو تحصیلوں میں مفتی مقرر کیے گئے۔ صوبائی مفتی کے لیے ممتاز کشمیری عالم دین علامہ محمد شریف کشمیری کا نام تجویز ہوا جو اس وقت بلوچستان کی ریاست قلات میں علامہ شمس الحق افغانی کے معاون کے طور پر نائب وزیر معارف تھے، مگر انہوں نے یہ منصب قبول کرنے سے معذرت کر دی جس کے بعد مولانا عبد الرحمٰن عباس پوری کو صوبائی مفتی مقرر کیا گیا جن کی نگرانی میں مفتیان کرام نے سول عدالتوں میں ججوں کے ساتھ ان کی دینی رہنمائی کے لیے بیٹھنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد چودھری غلام عباس مرحوم اور سردار محمد ابراہیم خان کے درمیان سیاسی کشمکش کا آغاز ہوگیا جس نے پورے آزاد کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ کشمکش کئی سال تک جاری رہی اور

اس دوران دیگر معاملات کی طرح افتاء اور قضاء شرعی کے اس معاملہ میں بھی کوئی پیشرفت نہ ہو سکی حتیٰ کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں آزاد کشمیر میں جناب کے ایچ خورشید مرحوم کی حکومت قائم ہوئی تو افتاء کے اس محکمہ کو سرے سے ختم کر دینے کی بھی کوشش کی گئی جس کی علماء کرام نے مزاحمت کی، اس لیے افتاء کا محکمہ تو ختم نہ کیا جا سکا مگر حکمت عملی یہ اختیار کی گئی کہ جو مفتی وفات پا جاتا یا ریٹائر ہو جاتا اس کی جگہ نئے مفتی کا تقرر نہ کیا جاتا۔ اسی دوران آزاد کشمیر میں عائلی قوانین نافذ کرنے کی بھی کوشش کی گئی جس کی بہت سی شقوں پر علماء کرام کو اعتراض تھا اور یہ قوانین پاکستان میں نافذ ہو چکے تھے لیکن آزاد کشمیر کے علماء کرام کے سخت احتجاج کے باعث وہاں یہ قوانین نافذ نہ کیے جا سکے۔

آزاد کشمیر میں شرعی عدالتی نظام

آزاد کشمیر میں سردار محمد عبد القیوم خان کی حکومت قائم ہوئی تو افتاء کے محکمہ کو باقاعدہ قضاء شرعی میں تبدیل کرنے کے لیے پیشرفت کا آغاز ہوا۔ سردار محمد عبد القیوم خان نے وزیر قانون خواجہ محمد اقبال بٹ کی سربراہی میں لاء کمیشن قائم کیا جس میں حکومت آزاد کشمیر کے لاء سیکرٹری اور اس وقت کے چیف جسٹس سردار یوسف صراف کے علاوہ مولانا محمد یوسف خان، مولانا مظفر حسین ندوی، مولانا محمد یونس اثری، مولانا مفتی عبد الحکیم اور مولانا صدر الدین شامل تھے۔ اس کمیشن نے کئی ماہ تک شرعی قوانین کا جائزہ لے کر قوانین کے مسودات اور عدالتی نظام کا ڈھانچہ مرتب کیا اور اس دوران مولانا محمد یوسف خان نے کمیشن کے اجلاسوں میں اسلامی قوانین کے اس دور میں ناقابل عمل ہونے کے خدشات اور دیگر اعتراضات کا نقلی اور عقلی طور پر تجزیہ کرتے ہوئے اسلامی قوانین کا جس کامیابی کے ساتھ دفاع کیا، اس کی یاد ابھی تک کمیشن کے شرکاء کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ حتیٰ کہ چیف جسٹس سردار یوسف صراف نے کمیشن کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ مولانا محمد یوسف خان کی گفتگو سننے کے بعد اس بات کے شعوری طور پر قائل ہو گئے ہیں کہ اسلامی قوانین آج کے دور میں بھی نہ صرف قابل عمل ہیں بلکہ ضروری ہیں۔

کمیشن کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد پاکستان کی سپریم کورٹ کے سربراہ جسٹس حمود الرحمٰن صاحب کو آخری اجلاس میں شرکت اور مسودہ پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی گئی چنانچہ وہ مظفر آباد

گئے اور کمیشن کے اجلاس میں اس مسودہ کا جائزہ لیا۔ انہوں نے بھی مسودہ کی مختلف شقوں پر ایک درجن سے زائد اعتراضات کیے جن کے جواب میں مولانا محمد یوسف خان نے تقریباً تین گھنٹے تک کمیشن سے خطاب کیا اور اس کے بعد جسٹس حمودالرحمٰن صاحب نے یہ کہہ کر مسودہ کی منظوری دے دی کہ مولانا محمد یوسف خان علم کا مینار ہیں، البتہ انہوں نے زنا کی شرعی سزا کے بارے میں کہا کہ اس پر بحث نہیں کرنا چاہتا، مگر میری رائے ہے کہ مصلحت کا تقاضا اسی میں ہے کہ اسے مسودہ میں شامل نہ کیا جائے اور اس طرح بحث ومباحثہ کے اس طویل عمل کے بعد آزاد کشمیر میں عدالتی سطح پر شرعی قوانین کے نفاذ اور تحصیل اور ضلع کی سطح پر باقاعدہ شرعی قاضیوں کے تقرر کا فیصلہ کر لیا گیا جو بدستور آج سیشن اور سول ججوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

مفتیوں کا دائرہ کار قاضیوں سے قدرے وسیع تھا اور وہ عدالتی کام کے علاوہ دیگر سرکاری اور عوامی شعبوں میں بھی عوام اور افسران کی دینی راہنمائی کی خدمات سرانجام دیتے تھے، اس لیے جب انہیں قاضی کی حیثیت دے دی گئی تو وہ عدالتی دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئے اور دیگر شعبوں میں دینی رہنمائی کا خلا پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ جب سردار محمد عبدالقیوم خان آزاد کشمیر کے صدر اور سکندر حیات خان وزیراعظم تھے، افتاء کا ایک مستقل محکمہ سرکاری طور پر قائم کیا گیا جس کے تحت ضلع اور تحصیل کی سطح پر مفتی مقرر کیے گئے ہیں اور وہ سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

مولانا محمد یوسف خان کا کہنا ہے کہ اگرچہ آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں خاصی پیشرفت ہوئی ہے، مگر ابھی یہ کام ادھورا ہے اور ہمارا کام اس وقت مکمل ہوگا جب پورا کشمیر بھارتی سامراج کے تسلط سے نجات حاصل کرے گا اور اس میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں آجائے گا۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۲۹ جولائی ۲۰۰۰ء)

تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور تراڑکھل

۲۱ ستمبر کو تراڑکھل آزاد کشمیر جانے کا اتفاق ہوا جہاں علماء کرام کے علاقائی فورم تنظیم اہل السنۃ والجماعۃ کا سالانہ اجتماع تھا جس کے لیے مولانا شبیر احمد ایک سال سے میرے تعاقب میں تھے۔ اس علاقہ میں جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فضلاء کی خاصی تعداد ہے جس کی مناسبت سے دوستوں کی خواہش ہوتی ہے کہ سال میں ایک دو بار وہاں ضرور حاضری دوں اور یہ ان کا حق بھی ہے۔ اس سفر میں عزیزم حافظ محمد حذیفہ خان سواتی فاضل نصرۃ العلوم گوجرانوالہ بھی ساتھ تھا جو میرا نواسہ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کا پوتا ہے۔ مرکزی جامع مسجد تراڑکھل میں صبح دس بجے سے ظہر تک پروگرام تھا جس میں مجھے گفتگو کے لیے ’’عصر حاضر میں علماء کرام کی ذمہ داریاں‘‘ کا موضوع دیا گیا۔

تراڑکھل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی آزاد حکومت کا آغاز یہاں سے ہوا تھا، سردار محمد ابراہیم خان مرحوم نے اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر آزاد حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور کئی ماہ تک تراڑکھل اس کا دارالحکومت رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف مسلح جنگ کا آغاز نیلا بٹ سے ہوا تھا جہاں سردار محمد عبد القیوم خان مرحوم نے اپنے رفقاء سمیت مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا اور اسی وجہ سے انہیں مجاہد اول کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جبکہ آزادیٔ کشمیر کی سیاسی جدوجہد تراڑکھل سے شروع ہوئی تھی جس کے آغاز، تسلسل اور استحکام میں چودھری غلام عباس مرحوم اور سردار محمد ابراہیم خان مرحوم کے ساتھ میر واعظ مولانا سید محمد یوسف شاہؒ اور کرنل علی احمد مرحوم کا کردار بھی نمایاں رہا ہے۔ ہمارے مخدوم و محترم بزرگ حضرت مولانا محمد یوسفؒ آف پلندری، مولانا عبد العزیز تھوراڑویؒ اور مولانا مفتی عبد الحمید قاسمیؒ بھی اس قافلے کا حصہ تھے اور یہ

تینوں بزرگ میرے والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کے دورۂ حدیث کے ساتھیوں میں سے تھے۔

اجتماع کے زیادہ تر شرکاء علماء کرام تھے اور تنظیم اہل سنت کے احباب نے بڑی محنت کر کے اسے علاقہ کے علماء کرام کا نمائندہ اجتماع بنا دیا تھا۔ میں نے علماء کرام سے گزارش کی کہ چونکہ میں ترارکھل میں کھڑا ہوں جو مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے درمیان بین الاقوامی کنٹرول لائن سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور کنٹرول لائن کے دوسری طرف جو کچھ ہو رہا ہے اس کی خبریں ہم روزانہ پڑھتے رہتے ہیں کہ ہمارے مظلوم کشمیری بھائی اس وقت کس کڑی آزمائش سے دوچار ہیں، اس لیے میں پہلی بات اسی حوالہ سے کروں گا کہ ملک وقوم کی آزادی کی جدوجہد صرف سیاسی ایجنڈے کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ یہ دینی ذمہ داری بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی تحریک آزادی کے دومرحلوں کی تفصیل بیان کی ہے جن میں قوم کو غلامی سے نجات دلانے اور ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی جدوجہد کی قیادت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے کی تھی۔ فرعون کی غلامی سے نجات کی جدوجہد کے ایک مرحلہ کی قیادت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمائی جبکہ بیت المقدس پر قبضہ کے لیے جہاد اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کی قیادت حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے کی۔ اسی طرح جالوت کے تسلط اور جبر سے نجات کی جدوجہد کی راہنمائی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام نے فرمائی جبکہ ان کی راہنمائی میں عملی جنگ حضرت طالوت علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام نے لڑی جس کے نتیجے میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی اور اسے قرآن کریم نے حضرت داؤدؑ کے حوالہ سے ’’خلافت‘‘ قرار دیا ہے۔

چنانچہ میں آزاد کشمیر کے علماء کرام کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ غلامی سے نجات، قومی آزادی اور اسلامی ریاست کے قیام کی محنت صرف سیاسی نہیں بلکہ مذہبی ذمہ داری اور دینی فریضہ بھی ہے۔ جس سے علماء کرام کو لاتعلق نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس میں ہر سطح پر شریک ہو کر اس کی راہنمائی کرنی چاہیے اور اس میں مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے۔ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین جس جہاد میں مسلسل مصروف ہیں اور بے پناہ قربانیاں دے رہے ہیں اس میں سیاسی، سفارتی، اخلاقی، مالی اور دیگر ہر طرح کی

امداد کی ضرورت ہے جو آزاد کشمیر کے عوام اور علماء کرام کے ساتھ پاکستانی قوم اور حکومت کو مہیا کرنی چاہیے، بلکہ یہ پورے عالم اسلام کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ تحریک آزادیٔ کشمیر کو ہر ممکن سپورٹ مہیا کرے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ حضرات کی جماعتی وسیاسی گروہ بندیوں سے قطع نظر میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ آزاد کشمیر کی نئی حکومت کے صدر مسعود خان ہیں جو ایک کامیاب سفارتکار کے طور پر معروف ہیں جبکہ وزیراعظم تحریک آزادیٔ کشمیر کے ممتاز سیاسی راہنما راجہ حیدر خان مرحوم کے فرزند راجہ فاروق حیدر خان بنے ہیں۔ سیاست وسفارت کا یہ ملاپ ایک اچھی علامت ہے، اس وقت تحریک آزادیٔ کشمیر کو سیاست، سفارت، لابنگ اور میڈیا کے محاذوں پر نئی صف بندی کی ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ دونوں راہنما تحریک آزادیٔ کشمیر کو قومی اور عالمی محاذ پر آزاد کشمیر کے دیگر سیاسی راہنماؤں کے تعاون سے منظّم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن علماء کرام کو اس تحریک سے لاتعلق نہیں رہنا چاہیے اور آگے بڑھ کر اس میں سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے......

(روزنامہ اسلام، لاہور...... ۲۷ ستمبر ۲۰۱۶ء)

مسئلہ کشمیراورسردارمحمدعبدالقیوم خانؒ

کارگل آپریشن

......کارگل کے مسئلہ پرانہوں نے کہا کہ اس آپریشن کو وہ بالکل صحیح سمجھتے ہیں اوراس میں مجاہدین اوردیگر متعلقہ اداروں نے جو کامیابی حاصل کی ہے اور بے پناہ ایثار، جدوجہداورقربانیوں کے ساتھ وہ جس ہدف تک پہنچے ہیں وہ کشمیر کی تحریک آزادی کا ایک روشن باب ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی کارگل سے واپسی کے بارے میں میاں محمد نواز شریف کے فیصلے کو بھی وہ صحیح اور بروقت سمجھتے ہیں کیونکہ موسمی حالات کے پیش نظر مجاہدین کے لیے ہفتہ عشرہ سے زیادہ کارگل کی چوٹیوں پر مزیدرہنا ممکن نہیں تھا اس لیے خودواپس آنے کی بجائے ہفتہ دس دن پہلے کسی کے کہنے پرواپس آجانے میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ بالخصوص اس آپریشن کے ذریعہ دنیا کومسئلہ کشمیر کی طرف توجہ دلانے کا ہدف حاصل کیا جا چکا تھا اورصدر امریکہ تک کے لیے اس میں دلچسپی کا اظہار ضروری ہوگیا تھا۔البتہ میاں محمد نواز شریف نے کارگل کے بارے میں حال ہی میں جو بیان دیا ہے وہ غلط ہے اور یہ بیان دے کرانہوں نے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے دوستوں اور مجموعی طور پرسیاستدانوں پرظلم کیا ہے۔

خودمختار کشمیر

جموں وکشمیر کی خودمختاری کے سوال پرسردارصاحب نے کہا کہ انہوں نے کبھی ’’خودمختار کشمیر‘‘ کی حمایت نہیں کی بلکہ خودمختاری کے اس تصور کے خلاف رائے عامہ اور بین الاقوامی فورم پرکشمیری عوام کے جذبات کی ترجمانی سب سے زیادہ انہوں نے کی ہے اوروہ اس تصور کوکشمیری عوام کے

خلاف سازش سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ بھی خودمختاری کی بات کرنے لگیں گے تو پھر پیچھے کیا رہ جائے گا؟ البتہ مذاکرات کی میز پر کسی استثناء اور شرط کو وہ مناسب نہیں سمجھتے اور ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب ہمارا موقف بالکل واضح اور بے غبار ہے اور ہم اپنے موقف پر ناقابل تردید دلائل رکھتے ہیں تو ہمیں مسئلہ کشمیر کے بارے میں کسی بھی تجویز پر گفتگو سے انکار نہیں کرنا چاہیے اور دنیا کو یہ تاثر دینے سے گریز کرنا چاہیے کہ ہم کسی بھی حوالہ سے مذاکرات سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اس طرح انکار کی ذمہ داری ہم پر آئے گی اور اس کا فائدہ بھارت کو ہوگا۔ مجھے یقین اور اعتماد ہے کہ مذاکرات کی میز پر بھارت کے ساتھ گفتگو کا آغاز کسی بھی تجویز سے ہو بالآخر حق خودارادیت کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اصول پر ہی آئے گی اور اس کے سوا مسئلہ کے حل کا کوئی راستہ ممکن نہیں ہوگا۔ اس لیے ہم کسی تجویز پر بات کرنے سے کیوں گھبرائیں اور مذاکرات سے گریز کی ذمہ داری اپنے سر لینے کی بجائے اسے بھارت کے کھاتے میں کیوں نہ ڈالیں؟

''خودمختار کشمیر'' کے بارے میں سردار صاحب نے بتایا کہ ان سے ایک بڑے ملک کے نمائندہ نے اس سلسلہ میں بات کی تو انہوں نے کہا کہ ہم اس پر گفتگو کے لیے تیار ہیں لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ اس کے لیے تقسیم ہند کے اس بنیادی فارمولے پر نظر ثانی کرنا پڑے گی جس کے تحت برصغیر کی سینکڑوں ریاستوں کو پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کا حق دیا گیا تھا۔ اگر بھارت اس فارمولے پر نظر ثانی کرنے اور اسے ازسرنو طے کرنے کے لیے تیار ہے تو ہم بھی اس پر غور کرنے کے لیے حاضر ہیں۔ لیکن بھارت کو اس کے لیے تیار کرنے کی ذمہ داری ان قوتوں کی ہے جو مسئلہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کے مجوزہ مذاکرات کے ایجنڈے میں خودمختاری کی تجویز کو شامل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اگر وہ بھارت کو تقسیم ہند کا فارمولا ازسرنو طے کرنے پر رضامند کر لیں تو ہم بھی اس پر گفتگو سے انکار نہیں کریں گے۔ لیکن اگر تقسیم ہند کا فارمولا بدستور موجود اور نافذ العمل ہے اور اس میں کسی ترمیم اور نظر ثانی کی گنجائش نہیں ہے تو پھر مسئلہ کشمیر بھی اس فارمولے کے تحت طے کرنا ہوگا اور اس کے لیے الگ راستہ اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

سردار محمد عبدالقیوم خان کا کہنا ہے کہ کسی مسئلہ پر اپنے موقف سے دستبرداری اور اپنے موقف کے خلاف کسی تجویز پر گفتگو کے لیے آمادگی اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے معترض کو ان دو

باتوں میں فرق کرنا چاہیے اور محض کسی اخبار میں شائع ہونے والے ادھورے بیان کی بنیاد پر مخالفانہ بیان بازی پر نہیں اتر آنا چاہیے۔

سازشوں سے خبردار رہنے کی ضرورت

سردار محمد عبدالقیوم خان نے مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے سازشوں کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں دشمن کی سازشوں سے خبردار ضرور رہنا چاہیے لیکن ان کو زیادہ شکوہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دشمن کا تو کام ہی یہی ہے کہ اسے جب موقع ملے گا وہ سازش کرے گا، اس لیے ہر وقت سازشوں کا واویلا کرتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ دشمن کو سازش کا موقع نہ دیں کیونکہ اسے زیادہ تر سازشوں کا موقع ہماری کمزوریوں اور غفلت کی وجہ سے ملتا ہے۔ اگر ہم اپنا کردار صحیح رکھیں گے اور چوکنا رہیں گے تو دشمن کو بھی سازشوں کو پروان چڑھانے کی گنجائش کم ملے گی۔

سردار صاحب نے سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان اور بھارت کی پہلی جنگ بندی کا تذکرہ کیا اور کہا کہ یہ جنگ بندی بھی سازش تھی اور اس میں پاکستان کو جان بوجھ کر نقصان پہنچایا گیا۔ وہ خود جس بریگیڈ میں تھے اس کے سامنے بارہ مولا سے آگے تک کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور کافی دور تک کا علاقہ کسی مزاحمت کے بغیر قبضہ میں لیا جا سکتا تھا لیکن انہوں نے قادیانی بریگیڈیئر سے پیش قدمی کی اجازت مانگی تو انہیں اجازت نہ دی گئی اور اس طرح ہم اچھے خاصے علاقے سے محروم ہو گئے۔ اس قسم کی سازشوں کی چھان بین ہونی چاہیے اور اہل قلم کو اس سلسلہ میں محنت کر کے انہیں بے نقاب کرنا چاہیے۔

اس ضمن میں سردار صاحب نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے متحرک عالمی اداروں اور مختلف ملکوں کے سفارتکاروں کی سرگرمیوں کا حوالہ دیا اور کہا کہ ان میں سے ہر کوشش کو سازش تصور کر لینا درست نہیں ہے کیونکہ دنیا میں بہت سے حلقے ایسے موجود ہیں جو فی الواقع جنوبی ایشیا میں امن کے خواہاں ہیں اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں، اس لیے ہر کوشش کو سازش قرار دے کر مسترد کر دینا درست طرز عمل نہیں ہے۔ جبکہ یہ بات طے ہے کہ مسئلہ کشمیر کا حل اسی قسم کی بین الاقوامی کوششوں سے ہی نکلے گا اس لیے اگر ہم اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور پورے شعور، ادراک اور آگہی کے ساتھ بین الاقوامی کوششوں سے استفادہ کریں تو ان مجموعی

کوششوں کے درمیان میں سے اپنے لیے راستہ نکالنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

مجاہدین کشمیر اور ان کا جہاد

جہاد کشمیر میں مجاہدین کی قربانیوں اور شہداء کے خون کا ذکر کرتے ہوئے سردار صاحب نے کہا کہ یہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے، ان عظیم مجاہدین کے ایثار اور قربانیوں کے نتیجہ میں ہی آج مسئلہ کشمیر عالمی سطح پر زندہ ایشو کے طور پر موجود ہے اور صدر امریکہ سمیت عالمی رہنماؤں کو اس مسئلہ کے حل کے لیے پیشرفت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عام طور پر ستر ہزار شہداء کا تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن ان شہداء کی تعداد کافی بڑھ چکی ہے جو میرے اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ ان شہداء نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد میں نئی روح پھونک دی ہے اور ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

سردار صاحب نے کہا کہ جہاد کے حوالہ سے دو تین باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

(۱) ایک یہ کہ جہاد کا مطلب پوری دنیا کے کفر کو للکارنا اور اس کے خلاف صف آراء ہو جانا نہیں ہے اور نہ ہی دور نبوتؐ سمیت کسی دور میں ایسا ہوا ہے۔ ہماری جنگ ان کفار سے ہے جو ہمارے خلاف برسر جنگ ہیں اور یہ جہاد ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ مگر پوری دنیائے کفر کے خلاف محاذ آراء ہو جانا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ اگر ہم شرعی اصولوں کے مطابق یہ بات واضح طور پر کہیں گے کہ دنیا کے ہر کافر کے خلاف ہماری جنگ نہیں ہے بلکہ ہم صرف ان کافروں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں جو ہمارے خلاف صف آراء ہیں اور ہمارے جائز حقوق غصب کیے ہوئے ہیں تو عالمی سطح پر جہاد کے خلاف جو پراپیگنڈا ہو رہا ہے اس کا زور بھی ہم کم کر سکیں گے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ میدان جنگ میں جہاد کے شرعی احکام اور آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں واضح طور پر ہدایات دی ہیں کہ کون سے کافر کو مارنے کی اجازت ہے اور کسے مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ غیر متعلقہ لوگوں کو تنگ کرنا، نہتے لوگوں کو قتل کرنا، اور بلاوجہ خوف و ہراس کی فضا قائم کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ اگر ہم جہاد میں شرعی احکام اور آداب کو ملحوظ رکھیں گے تو ہمارے خلاف دنیا کو غلط

پراپیگنڈا کا موقع نہیں ملے گا اور ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور برکات کے مستحق بھی ہوں گے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ مجاہدین کے مختلف گروہوں کی باہمی مخاصمت بالخصوص مسلکی فرق کے حوالہ سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش بہت بڑے نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور اس سلسلہ میں مجھے مستقبل قریب میں بہت بڑے خطرات و خدشات دکھائی دے رہے ہیں۔ اس لیے مجاہدین کے مختلف گروپوں کے قائدین کو صورتحال پر کڑی نظر رکھنا ہوگی۔ اس ضمن میں سردار محمد عبدالقیوم خان نے بتایا کہ ۱۹۴۸ء کے جہاد کشمیر میں معروف مجاہد رہنما مولانا فضل الٰہی وزیرآبادیؒ نے، جو خود اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے، جب ہمارے ایک گروپ کو جہاد کے لیے رخصت کیا تو ہمارے گروپ میں شامل ایک پرجوش اہل حدیث مجاہد حافظ محمد یوسف گکھڑوی مرحوم کو بطور خاص یہ تلقین کی کہ آپ لوگ جس علاقہ میں جہاد کے لیے جا رہے ہیں وہ حنفیوں کا علاقہ ہے اس لیے وہاں رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے فروعی مسائل چھیڑنے سے گریز کرنا ورنہ مشکلات پیدا ہوں گی اور جہاد کو نقصان پہنچے گا۔ اس تلقین کو آج پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ جہاد کشمیر میں ہر مسلک اور فقہی مکتب فکر کے لوگ شریک ہیں اور کشمیر کے عوام کی اکثریت پہلے سے ایک فقہی مسلک پر قائم ہے۔ اس لیے اگر مسلکی بنیاد پر کام کرنے والے مختلف جہادی گروہ جہاد کے عمل کے ساتھ ساتھ مسلک کی ترویج اور دوسرے مسالک کی مخالفت کے مشن کو بھی شامل کرلیں گے تو اس سے فساد پیدا ہوگا اور باہمی محاذ آرائی سے خوفناک صورتحال پیدا ہو جائے گی۔

سردار صاحب سے اور بھی بہت سے امور پر گفتگو ہوئی مگر طوالت کے خدشہ کے پیش نظر سب باتوں کا تذکرہ مشکل ہے۔ اور ضروری نہیں کہ سردار صاحب کے ان خیالات میں سے ہر بات سے ہمیں اتفاق ہو مگر ایک تجربہ کار، جہاندیدہ اور باخبر بزرگ سیاستدان کے طور پر ان کے ارشادات پر غور کرنا اور ان سے راہنمائی حاصل کرنا یقیناً ہمارے لیے فائدہ کی بات ہوگی۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد...... ۳۰ جون ۲۰۰۰ء)

اسرائیل کوتسلیم کر لینے کا مشورہ

......محترم سردار عبدالقیوم خان کی اس وضاحت سے مجھے اتفاق ہے کہ وہ یقیناً اسرائیل نہیں گئے ہوں گے، اس لیے کہ ان جیسا جہاندیدہ اور تجربہ کار بزرگ کسی طرح بھی ایسے رسک کا متحمل نہیں ہوسکتا، البتہ سردار صاحب محترم نے اس وضاحت کے ساتھ اسرائیل کو ایک حقیقت قرار دیتے ہوئے اسے تسلیم کر لینے کا جو مشورہ دیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ سردار محمد عبدالقیوم خان صاحب کا ارشاد ہے کہ

☆ بھارت کے ساتھ حالت جنگ کے باوجود سفارتی تعلقات قائم ہیں تو اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے میں کیا حرج ہے؟

☆ دوسری بات انہوں نے یہ فرمائی کہ اسرائیل ایک حقیقت ہے اس لیے اسے تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆ اس حوالے سے ان کا تیسرا ارشاد یہ ہے کہ اسرائیل کے ساتھ ہمارا کوئی تنازعہ نہیں ہے۔

میرے خیال میں سردار صاحب محترم ان تینوں امور کے بارے میں مغالطّوں کا شکار ہیں، لہٰذا ان کی کچھ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جہاں تک پاکستان اور بھارت کے سفارتی تعلقات کا مسئلہ ہے اس کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ جموں وکشمیر کے متنازعہ علاقہ کے سوا باقی تمام برصغیر کی تقسیم دونوں ملکوں نے تسلیم کر رکھی ہے جو ۱۹۴۷ء میں عمل میں آئی تھی۔ دونوں ملک ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، ایک دوسرے کے درمیان سرحد کو بین الاقوامی سرحد کا درجہ دیتے ہیں، دونوں ملکوں کی حکومتیں وعوام اور دینی و سیاسی جماعتیں سب کی سب اسے ذہنی وعملی طور پر قبول کر چکی ہیں، اوران کے درمیان سرحدی حوالے سے ریاست جموں وکشمیر کے سوا اور کوئی تنازعہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات کے قیام اور تسلسل میں حالت جنگ کے باوجود کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا۔

جبکہ فلسطین اور اسرائیل کی صورتحال اس سے قطعی مختلف ہے۔ دونوں کے درمیان سرے سے کوئی سرحد موجود ہی نہیں بلکہ اسرائیل کا کہنا ہے کہ اگر اسے فلسطین کی ریاست کو تسلیم کرنا پڑا تو وہ

اس شرط پر اس ریاست کو تسلیم کرے گا کہ اس کی کوئی سرحد نہ ہو اور اس کی اپنی کوئی فوج نہ ہو۔ پھر فلسطین کے عوام کی اکثریت، بیشتر عرب ممالک، متعدد غیر مسلم ممالک، اور بہت سی دینی و سیاسی جماعتیں فلسطین کی اس تقسیم کو ابھی تک قبول نہیں کر رہے جس کی بنیاد پر اسرائیل کی ریاست وجود میں آئی تھی۔ اس پس منظر میں اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات کرنا اور اسے پاک بھارت سفارتی تعلقات پر قیاس کرنا نہ صرف حقائق اور انصاف کے اصولوں سے انحراف ہے بلکہ بچے کھچے فلسطینیوں کو ہمیشہ کے لیے یہودی حکمرانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے مترادف بھی ہے۔

سردار محمد عبد القیوم خان صاحب کا یہ ارشاد بھی ہمارے نزدیک محل نظر ہے کہ اسرائیل ایک حقیقت ہے۔ اس لیے کہ اسرائیل کا وجود اور اس کا حقیقت نظر آنا ایک مصنوعی امر ہے جو امریکی بیساکھیوں کے سہارے کھڑا ہے۔ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کے لیے برطانیہ نے ۱۹۱۷ء میں فلسطین پر طاقت کے زور سے قبضہ کر کے برطانوی وزیر خارجہ کے ''بالفور ڈکلیریشن'' کے مطابق یہودی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی تھی اور برطانوی فوجوں کی قوت پر یہودیوں کو فلسطین کے بہت سے حصوں کا قبضہ دلایا تھا۔ پھر اسرائیل کے قیام کے بعد امریکہ اس کی پشت پناہی کے لیے خود موجود ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکی اتحاد کی فوجیں اسرائیل کو تحفظ فراہم کر رہی ہیں، عراق پر امریکہ کا قبضہ اسرائیل کی پشت پناہی کے لیے ہے، اور فلسطین میں یہودیوں کی موجودگی امریکی طاقت کے بل پر قائم ہے۔ اسے اگر سردار صاحب ''حقیقت'' قرار دیتے ہیں تو انہیں کشمیر کے مسئلہ پر بھی اپنے موقف سے دستبرداری اختیار کرنا پڑے گی کیونکہ اسی طاقت کے بل پر بھارت کشمیر میں موجود ہے۔ اس لیے اگر کسی جگہ طاقت کے زور پر کسی کی موجودگی اس کے ''حقیقت'' ہونے کے لیے کافی ہے تو پھر کشمیر میں بھارت کی موجودگی بھی ایک حقیقت ہے اور سردار صاحب کی منطق کی رو سے اسے تسلیم کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

کشمیر کے بارے میں سردار عبد القیوم خان صاحب کا موقف یہ ہے کہ بھارتی فوجیں کشمیر سے نکل جائیں اور کشمیریوں کو اپنا فیصلہ کسی مداخلت کے بغیر خود کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہمیں سردار صاحب کے اس موقف سے سو فیصد اتفاق ہے لیکن ہم فلسطین کے حوالے سے بھی یہی موقف رکھتے ہیں کہ امریکی فوجیں عراق اور خلیج سے نکل جائیں اور فلسطین کے باشندوں کو اپنے معاملات

کسی بیرونی مداخلت کے بغیر خود طے کرنے کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ امریکہ کی سرپرستی اور اس کی فوجوں کی موجودگی میں عربوں اور فلسطینیوں سے اسرائیل کو تسلیم کرانا بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح کشمیر میں بھارتی فوجوں کی موجودگی میں ہونے والے انتخابات کو کشمیری عوام کی مرضی قرار دے کر بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں کو مسلسل مسترد کرتا آ رہا ہے۔ اور یہ بات سردار صاحب کے علم میں ہے کہ بھارت اپنے اس موقف پر عالمی برادری کے ایک بڑے حصے کو قائل بھی کر چکا ہے جسے مطمئن کرنے کے لیے سردار صاحب پاکستان کو اسرائیل کا وجود تسلیم کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

سردار محمد عبدالقیوم خان صاحب سے ہماری گزارش صرف اتنی ہے کہ وہ لینے اور دینے کا پیمانہ ایک ہی رکھیں کیونکہ انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ اس لیے کہ اگر فلسطین میں طاقت کے زور پر اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا تو کشمیر میں اس اصول کو لاگو ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

سردار صاحب کا یہ کہنا کہ اسرائیل کے ساتھ ہمارا کوئی تنازعہ نہیں ہے، یہ بات اگر کوئی سیکولر لیڈر یا دانشور کہتا تو ہمیں کوئی اشکال نہ ہوتا لیکن سردار محمد عبدالقیوم خان کی زبان سے یہ جملہ سن کر انا للہ وانا الیہ راجعون کا مسلسل ورد کرنے کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اگر ۱۹۶۷ء کے اسرائیلی حملے میں شام کی گولان پہاڑیوں، مصر کے صحرائے سینا اور غزہ کی پٹی، اردن کے مغربی کنارے اور یروشلم (جس میں بیت المقدس واقع ہے) کا مسلمان سے چھن جانا، لاکھوں فلسطینیوں کا قتل عام، اور باقی ماندہ فلسطینیوں کو کسی سرحد اور فوجی تحفظ کے بغیر اسرائیلی حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہمارے مسائل نہیں ہیں اور ان تنازعات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر سردار صاحب ہی فرمائیں کہ کشمیری مسلمانوں کے قتل عام اور کشمیر پر بھارت کے جارحانہ تسلط کے مسئلہ سے پنجاب، سندھ، سرحد، اور بلوچستان کے عوام کا کیا تعلق باقی رہ جاتا ہے؟ اور پھر مسئلہ کشمیر کو عالم اسلام کا مسئلہ قرار دینے اور تنظیم تعاون اسلامی (OIC) سے اس کے لیے قراردادیں منظور کرانے کی کیا تک باقی رہتی ہے؟

(روزنامہ پاکستان، لاہور......۱۵ جولائی ۲۰۰۳ء)

تین کشمیر

ہم ۵ فروری کو ایک بار پھر قومی سطح پر ’’یوم یکجہتی کشمیر‘‘ منا رہے ہیں۔ یہ دن کشمیری بھائیوں کی حمایت اوران کے ساتھ ہم آہنگی کے اظہار کے لیے ایک عرصہ سے جوش وخروش کے ساتھ منایا جا رہا ہے۔اس دن سرکاری تعطیل ہوگی، جلسے جلوس ہوں گے،اور ریلیاں نکالی جائیں گی۔ جبکہ اس دن حسن اتفاق سے جمعۃ المبارک ہے، علماء کرام خطبات جمعہ میں کشمیری بھائیوں کی حمایت اور آزادی کے لیے ان کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کریں گے اوراجتماعات میں آزادیٔ کشمیر کے لیے دعائیں کی جائیں گی۔

کشمیر کو اپنے حسن، آب و ہوا اور سبزہ زاری کی وجہ سے جنت نظیر کہا جاتا ہے اور ایشیا کے سویٹزرلینڈ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔مگر وہ خطہ جو صدیوں جموں وکشمیر اوراس کے ملحقات کے عنوان سے وحدت سے بہرہ ور تھا اب عملاً انتظامی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہے:

(۱) ایک بڑے حصے پر بھارت نے ناجائز قبضہ جما رکھا ہے،

(۲) دوسرا حصہ پاکستان کے زیرانتظام آزاد ریاست جموں وکشمیر کے نام سے اپنی حکومت، اسمبلی اور خودمختار عدالت رکھتا ہے،

(۳) جبکہ تیسرا حصہ جو گلگت بلتستان، سکردو اور ہنزہ وغیرہ پر مشتمل ہے، پاکستان ہی کے انتظام کے تحت انتظامی صوبہ کے طور پر اپنے الگ تشخص سے بہرہ ور ہو چکا ہے۔

یہ تینوں حصے بین الاقوامی دستاویزات ومعاہدات کی رو سے پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی بارہا اس خطہ کے عوام کا یہ حق تسلیم کر چکی ہے کہ انہیں استصواب رائے کے ذریعہ اپنے مستقبل کا اپنی آزادانہ رائے کے ساتھ خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا

جائے۔ بلکہ اقوام متحدہ نے یہ استصواب رائے اپنی نگرانی میں کرانے کا وعدہ بھی کر رکھا ہے مگر اس بین الاقوامی معاہدہ اور عالمی وعدہ کو ساتواں عشرہ مکمل ہونے کے قریب ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا۔

کشمیری عوام اس وعدہ کی تکمیل اور اپنا یہ مسلمہ جائز حق حاصل کرنے کے لیے سیاسی اور عسکری دونوں محاذوں پر مسلسل مصروف پیکار ہیں۔ ہزاروں نوجوان جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور اس جدوجہد میں اب چوتھی نسل آگے بڑھتی نظر آرہی ہے، لیکن اقوام متحدہ اور عالمی رائے عامہ کے وعدے سلامتی کونسل کے فریزر میں منجمد پڑے ہیں اور اقوام متحدہ کی جس سلامتی کونسل نے مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان میں عوامی ریفرنڈم کرا کے انہیں الگ ریاستیں بنوانے میں عملی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے، کشمیری عوام کو آزادانہ ریفرنڈم کا حق دلوانے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ عالمی راہ نماؤں کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ کشمیری عوام کو یہ حق دینے میں سوسائٹی کی مذہب کی بنیاد پر تقسیم کا رجحان بڑھے گا، جبکہ مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کی تقسیم انہی عالمی راہ نماؤں کی نگرانی میں مذہبی بنیادوں پر ہوئی ہے، اور یہ دونوں ریاستیں مسیحی اکثریت کی بنیاد پر دنیا کے نقشے کا حصہ بنی ہیں۔

کشمیری عوام کی بدنصیبی کا آغاز اس دن ہو گیا تھا جب برطانوی استعمار نے اس خطہ کو چند ٹکوں کی خاطر ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ اور دنیا کی آئیڈیل جمہوریت ہونے کا دعویٰ کرنے والے برطانیہ نے نہ صرف اس خطہ کے لاکھوں عوام کو خطہ سمیت ایک راجہ کے ہاتھ فروخت کیا تھا بلکہ جنوبی ایشیا سے رخصت ہوتے وقت بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا کشمیری عوام کو حق دینے کی بجائے راجہ کے شخصی فیصلہ کو سپورٹ کر کے کشمیری عوام کے مستقبل کو اس کے حوالہ کر دیا تھا۔ آج بعض برطانوی دانش ور کہتے ہیں کہ کشمیر کا تنازعہ پیدا کرنے میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے۔ مگر تاریخ کے صفحات سے ان حقائق کو کیسے کھرچا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں برطانیہ نے یہ خطہ پچھتر لاکھ روپے کے عوض ڈوگرہ مہاراجہ کو فروخت کیا تھا اور اس کے ایک سو سال بعد اسی برطانیہ نے رخصت ہوتے وقت کشمیر کے بارے میں راجہ کے شخصی فیصلے پر آنکھیں بند کر کے اسے ریاست کے عوام کی غالب اکثریت کے علی الرغم اپنا قبضہ برقرار رکھنے میں مدد دی تھی۔ بہر حال تب سے جموں و کشمیر کا ایک بڑا حصہ بھارت کے جارحانہ قبضہ میں ہے اور وہ کشمیری

عوام کو اپنی آزادانہ رائے کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا مسلمہ حق دینے کی بجائے فوجی طاقت کے زور پر وہاں اپنا تسلط قائم رکھے ہوئے ہے۔

اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام نے جن میں مقبوضہ کشمیر، آزاد ریاست جموں وکشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقوں کے عوام شامل ہیں، آزادانہ رائے کے ذریعہ یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ بھارت یا پاکستان میں سے کس کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں؟ اس لیے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام اور بھارت کی تقسیم کے موقع پر جن ریاستوں کو پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کا حق دیا گیا تھا، ان میں جموں وکشمیر کی ریاست بھی شامل ہے اور اس کے راجہ نے اپنی ریاست کے عوام سے رائے لیے بغیر بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تھا جسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ یہ فیصلہ کرنا کشمیری عوام کا کام ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان میں سے کون سے ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بھارت ڈوگرہ راجہ کے جس فیصلہ کو کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی بنیاد قرار دیتا ہے اسے اقوام متحدہ اور عالمی برادری مسترد کر چکی ہے۔ اور اقوام متحدہ کی اس قرارداد کو تسلیم کرنے کے بعد بھارت کے پاس بھی راجہ کے فیصلے کو الحاق کا جواز قرار دینے کا کوئی حق باقی نہیں ہے۔

کشمیر کے مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ اقوام متحدہ اپنے فیصلے کے مطابق کشمیری عوام کو استصواب رائے کا آزادانہ حق دے اور خود اپنی نگرانی میں ریفرنڈم کرا کے جنرل اسمبلی کے فیصلے پر عملدرآمد کا اہتمام کرے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا کشمیری عوام کی جدوجہد جاری رہے گی اور دنیا کے ہر منصف مزاج شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی حمایت کرتا رہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور...... ۵ فروری ۲۰۱۶ء)

کشمیریوں کی قربانی

اس دفعہ عیدالاضحیٰ اور یومِ آزادی اکٹھے آرہے ہیں اور وطن عزیز کے مسلمان جہاں جانوروں کی قربانی کریں گے وہاں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے ماحول کی انسانی قربانیوں کو یاد کریں گے اور عالمِ اسلام خصوصاً اپنے پڑوس مقبوضہ کشمیر میں انہی قربانیوں کے تسلسل میں قربان ہونے والے مظلوم مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہم آہنگی اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں ان کے لیے دعاگو ہوں گے۔

گزشتہ روز عرفات کے میدان میں اس سال کے امیر حج معالی الشیخ محمد بن حسن آل الشیخ حفظہ اللہ تعالیٰ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا ہے اس میں کشمیر، فلسطین، اراکان اور دیگر خطوں کے مظلوم مسلمانوں کا تذکرہ نہ ہونا مجھے بھی محسوس ہوا ہے اور خطبہ سن کر دل میں حسرت ابھری کہ کاش دعا میں ہی کچھ ذکر ہوجاتا لیکن بہرحال شیخ محترم حفظہ اللہ تعالیٰ کی دنیا بھر کے مسلمانوں کو یہ تلقین اچھی لگی کہ (۱) سیاسی قوت بنو (۲) باہمی وحدت کو فروغ دو (۳) دیانت اختیار کرو (۴) اچھے اخلاق کا عملی مظاہرہ کرو کہ شاید ہماری اجتماعی اور ملی بیماریوں کی تشخیص یہی ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں مسلسل کرفیو کے ماحول میں عسکری یلغار اور جبر وتشدد کا جو بازار گرم ہے وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی انہی قربانیوں کا تسلسل ہے جس میں ہزاروں مسلمان صرف اس جرم میں ذبح اور لاکھوں بے گھر ہوگئے تھے کہ وہ ''پاکستان'' چاہتے تھے اور اسے اپنی منزل سمجھتے تھے۔ وہ پاکستان جو مسلمانوں کی تہذیبی شناخت اور نظریاتی تشخص کے تحفظ کے لیے قائم کیا جا رہا تھا اور جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس میں مسلمان حفظ وامان میں ہوں گے، اپنی تہذیبی وثقافتی روایات کو برقرار رکھ سکیں گے، اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وتعلیمات پر

عملدرآمد کے ماحول میں زندگی گزار سکیں گے، اور انہیں ہندو اکثریت کے معاشی تسلط، عددی بالادستی اور سیاسی حاکمیت کے خوف سے نجات ملے گی۔ اس منزل سے ہمکنار ہونے کے لیے ایک بڑی تعداد ذبح ہوگئی، اس سے بڑی تعداد گھر بار چھوڑ کر جلاوطن ہوئی اور آگ وخون کا دریا عبور کر کے پاکستان پہنچ پائی۔

کشمیریوں کا جرم بھی یہی ہے کہ وہ قیامِ پاکستان کے وقت سے ہی پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں، اپنے دینی اور تہذیبی تشخص سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور چونکہ اپنے خطہ میں واضح اکثریت رکھتے ہیں اس لیے وہ آزادی اور خودمختاری کا حق مانگ رہے ہیں۔ اگرچہ عالمی برداری اور اقوامِ متحدہ نے اس معاملہ میں کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کو تسلیم کرتے ہوئے کشمیری عوام سے اس کے اہتمام کا وعدہ کر رکھا ہے مگر ستر سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود عالمی برادری یا بھارت کی جانب سے اس سلسلہ میں کوئی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی، بلکہ بھارت اس کے برعکس عسکری تسلط اور جبر وتشدد کے ذریعے آزادیٔ کشمیر کی ہر کوشش کو ناکام بنانے کا طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہے، جبکہ دنیا کی صورتحال کچھ اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ عالمی برادری کا اختیار اور قوت صرف بے بس ملکوں کو دبانے کے ہی کام آتا ہے اور بڑے اور بااثر ملکوں کے معاملہ میں سب خاموش سادھو بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔

بہرحال ۱۹۴۷ء کی انسانی قربانیوں کی یاد، مقبوضہ کشمیر اور بہت سے دیگر خطوں میں ظلم و جبر کا شکار ہونے والے مسلمانوں کی قربانیاں، اور دنیا بھر میں سنتِ ابراہیمیؑ کے مطابق لاکھوں جانوروں کی قربانیوں کا ماحول ان تین دنوں میں جمع ہو گئے ہیں جو بلاشبہ ملتِ اسلامیہ خصوصاً اسلامیانِ پاکستان کے لیے کسی بڑے امتحان سے کم نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس میں سرخروئی نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(۱۲ اگست ۲۰۱۹ء)

مسئلہ کشمیر

﴿پاکستان کا موقف اور کردار﴾

مسئلہ کشمیر پر پاکستان کا موقف

صدر جنرل پرویز مشرف کے دورۂ بھارت کی تیاریاں جاری ہیں اور اس کے ساتھ ہی مختلف حلقوں کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے مختلف فارمولے سامنے آ رہے ہیں جن میں خودمختار کشمیر سے لے کر کشمیر کی تقسیم تک کی متعدد تجاویز شامل ہیں، جس سے عوام کی تشویش مسلسل بڑھ رہی ہے۔

کشمیری عوام نصف صدی سے آزادی کی جنگ میں مصروف ہیں اور اقوامِ متحدہ نے واضح قراردادوں کی صورت میں کشمیری عوام سے دوٹوک وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا۔ مگر بین الاقوامی حلقے اور عالمی قوتیں بالخصوص امریکہ مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ کشمیری عوام اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کو بھول جائیں اور نئے سرے سے ان عالمی قوتوں کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کسی ملے جلے حل پر آمادہ ہو جائیں، اور یہ ساری تگ ودو اسی مقصد کے لیے ہو رہی ہے۔ ہمارے خیال میں کشمیری عوام کے ساتھ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی صورت میں عالمی برادری کے دوٹوک وعدوں کو نظر انداز کرنا اسلامیانِ کشمیر کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کے ساتھ بے وفائی ہوگی اور اس سے مسئلہ کشمیر حل ہونے کی بجائے مزید الجھ جائے گا۔

اس پس منظر میں روزنامہ جنگ لاہور ۱۸ جون ۲۰۰۱ء کے مطابق وفاقی وزارتِ خارجہ کے ترجمان کا یہ اعلان اطمینان بخش ہے کہ مسئلہ کشمیر اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہی حل ہوسکتا ہے اور حکومتِ پاکستان اپنے اس موقف سے قطعاً دستبردار نہیں ہوگی۔

ہمیں امید ہے کہ جنرل پرویز مشرف بھارتی حکمرانوں کے ساتھ مذاکرات میں پاکستان کے

اس اصولی موقف، اور کشمیری عوام کے آزادانہ حقِ خودارادی کے جائز اور مسلّمہ حق کے بارے میں کوئی لچک اختیار نہیں کریں گے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... جولائی ۲۰۰۱ء)

بین الاقوامی علماء کانفرنس قاہرہ ۱۹۶۵ء سے
مولانا مفتی محمودؒ کا خطاب

گزشتہ روز ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کی پرانی فائیلوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر پر قائد جمعیۃ علماء اسلام مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا ایک اہم خطاب نظر سے گزرا جوانہوں نے مئی ۱۹۶۵ء کے دوران قاہرہ میں ''مجمع البحوث الاسلامیہ'' کی سالانہ کانفرنس میں ارشاد فرمایا تھا۔ حکومت مصر کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی علماء اسلام کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے اس فکر انگیز خطاب کا ترجمہ قارئین کے مطالعہ کے لیے ہفت روزہ ترجمان اسلام سے نقل کیا جا رہا ہے:

''محترم صاحب صدر اور معزز علماء کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد والہ واصحابہ ومن تبعھم اجمعین۔ اما بعد۔ میرا ارادہ ہے کہ آپ حضرات کی خدمت میں اس بابرکت وقت کے اندر ایک مختصر سا مقالہ پیش کروں۔

معزز حضرات! میں سب سے قبل جامعہ ازہر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے ہمیں اس بلند مقام میں مل کر بیٹھنا میسر کیا اور علماء اسلام کو اسلام کے دفاع اور دینی مشکلات کے حل کرنے کے لیے جمع کیا۔ جامعہ ازہر ہی اس عظیم منقبت

کے لائق ہے کیونکہ یہ وہ قدیم علمی مدرسہ ہے جس نے تمام ممالک میں خواہ وہ نزدیک ہوں یا دور، اسلامی علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ تک اسے محفوظ و مضبوط رکھے اور سپاہ اسلام اور اسلامی عساکر کے لیے مضبوط قلعہ کی حیثیت سے قائم رکھے۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے قطعی مسائل میں الحاد و تحریف کا فتنہ پیدا ہوگیا ہے اور یہ تقریباً تمام عالم اسلام میں پھیل گیا ہے۔ اور میں بڑے افسوس سے کہتا ہوں کہ بعض حکومتیں اپنے خصوصی اغراض کی خاطر اس فتنہ کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ اس فتنہ کے حاملین یہ کہا کرتے ہیں کہ بینکوں کا سود جائز اور حلال ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا۔ یہی لوگ شراب کی بعض قسموں کو حلال کہتے ہیں، زکوٰۃ کو عبادت نہیں جانتے بلکہ اس کو ایک مالی ٹیکس کی سی حیثیت دیتے ہیں۔ زکوٰۃ کی مخصوص شرح کو جو شریعت میں منصوص ہے ضروری نہیں جانتے بلکہ ضروریات کے تحت اس کی شرح میں کمی بیشی کے قائل ہیں۔ نیز یہی لوگ حکومت وقت کو کلی اختیار دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کی شرح اور اس کے شرائط و حدود اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرے اور اس میں کمی بیشی کرے۔ لہٰذا میں ممبران مجمع البحوث الاسلامیہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ ان مسائل کی صحیح تشریح فرمائیں گے اور تمام مسلمانوں کو ان واضح گمراہیوں سے نجات دلائیں گے۔

تیسری بات یہ کہ مغربی استعماریوں نے افریقہ اور ایشیا میں بڑا اندوہناک فساد پھیلا رکھا ہے۔ اور مسلمان قوم اگرچہ درحقیقت ساری کی ساری ایک ملت ہے لیکن ان ظالم استعماریوں نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور ان کو آپس میں دشمن بنا دیا ہے العیاذ باللہ۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس کانفرنس میں مغربی استعمار کے خلاف قراردادیں پیش فرمائیں گے۔ اور ان استعماریوں کو مسلمان ملکوں میں دخل دینے سے شدت سے روکیں گے۔

آخر میں یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ پاکستان میں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ ہے لیکن ان کے باوجود ان کو ایک بڑا مشکل اور اہم مسئلہ درپیش ہے جس نے ان کو حیران و سرگرداں کر دیا ہے۔ اور وہ ہے مسئلہ کشمیر جس کو امریکہ اور برطانیہ کے استعمار نے ہمارے اور ہندوستان کے درمیان کھڑا کر دیا ہے۔ مسئلہ کشمیر مسئلہ فلسطین کے ساتھ بہت مشابہ ہے۔ چالیس لاکھ مسلمان آج بھی کشمیر میں مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی آفت ان کے سر پر آپڑتی ہے اور وہاں کے مسلمانوں کے عمائدین سب کے سب جیلوں میں ہیں۔

جیسا کہ فلسطین کا مسئلہ تمام مشرق و مغرب میں بسنے والے مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا، بعینہ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بھی عالم اسلام کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ حکومت پاکستان نے آج تک اسرائیل کی حکومت تسلیم نہیں کی اور نہ آئندہ کسی وقت بھی اس کو تسلیم کر سکتی ہے کیونکہ حکومت پاکستان کی نظر میں اسرائیلی باشندے تمام عرب اور اسلام کے سخت ترین دشمن ہیں۔ لہٰذا ہم اسلامی ممالک بالخصوص حکومت جمہوریہ عربیہ متحدہ (مصر) سے مسلمانان کشمیر کو ظالم ہندوؤں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے میں تعاون کی امید رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مشرک ہندوؤں کو ذلیل و خوار کر دے،

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔‘‘

(روزنامہ اسلام، لاہور ......۲۹ اپریل ۲۰۱۷ء)

مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی سفارتی ناکامی!

جنیوا کے انسانی حقوق کمیشن میں کشمیر کے حوالے سے پاکستان کی قرارداد کی واپسی ان دنوں قوم حلقوں میں زیر بحث ہے۔ یہ قرارداد مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کے مظالم اور انسانی حقوق کی پامالی کی مذمت کے لیے پیش کی گئی تھی لیکن ووٹنگ سے قبل چین اور ایران کے کہنے پر واپس لے لی گئی۔

☆ حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ قرارداد کا مقصد مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنا تھا جو ووٹنگ کے بغیر حاصل ہوگیا ہے اور چین اور ایران جیسے دوست ممالک کے مشورہ کو نظر انداز کرنا مشکل تھا اس لیے قرارداد موخر کر دی گئی۔

☆ جبکہ اپوزیشن کے راہنماؤں کا کہنا ہے کہ حکومت نے قرارداد واپس لے کر مسئلہ کشمیر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور ان مجاہدین کشمیر کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے جو اس وقت مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کے ظلم وتشدد کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔

حکومتی حلقوں اور اپوزیشن کی اس کشمکش سے قطع نظر بین الاقوامی پریس کا یہ تجزیہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرارداد کے لیے جو محنت ضروری تھی پاکستان کی وزارت خارجہ اس کا اہتمام نہیں کر سکی حتیٰ کہ قرارداد کی حمایت میں مسلم ممالک سے روابط اور انہیں قائل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی جس کی وجہ سے انسانی حقوق کمیشن میں قرارداد کی منظوری کے امکانات مخدوش تھے اور پاکستان نے شکست سے بچنے کے لیے قرارداد کو واپس لینے یا موخر کرنے میں عافیت سمجھی ہے۔

بہر حال جو ہوا اس کے اسباب کچھ بھی ہوں اس سے مجاہدین کشمیر کو نقصان پہنچا ہے، پاکستان

کی ساکھ مجروح ہوئی ہے اور بھارت کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ اسے اپنی سفارتی فتح قرار دے کر پاکستان کو اپنی شرائط پر دوبارہ مذاکرات کی دعوے دے رہا ہے۔ اور اس بات میں بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ پاکستان کی وزارت خارجہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہی ہے جس کا نوٹس قومی سطح پر لیا جانا ضروری ہے۔

چین اور ایران کا طرز عمل

اس مرحلہ پر چین اور ایران کا طرز عمل بھی سنجیدہ غور و فکر اور تجزیہ کا متقاضی ہے کہ یہ دونوں ملک مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کے ہمیشہ حامی رہے ہیں اور ان کی حمایت پاکستان اور کشمیری حریت پسندوں کے لیے تقویت کا باعث رہی ہے، لیکن اب انسانی حقوق کمیشن میں پیش کردہ قرارداد بھی انہی کے کہنے پر پاکستان کو واپس لینا پڑی ہے۔ اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے پاکستان کو واضح شکست سے بچانے کے لیے قرارداد واپس لینے کا مشورہ دیا ہو لیکن ہم اس مسئلہ کے ایک اور پہلو کو سامنے لانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جب سے امریکی حلقوں کی طرف سے کشمیر یا اس کے ایک بڑے حصے کو خود مختار ملک کی حیثیت دینے کی تجویز سنجیدگی کے ساتھ سامنے آئی ہے اور کشمیر میں رائے شماری کے لیے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے علاوہ خود مختاری کا تھرڈ آپشن شامل کرنے پر زور دیا جا رہا ہے اس وقت سے یہ خدشات بڑھتے جا رہے ہیں کہ امریکہ دراصل خود مختار کشمیر کو اپنے فوجی اڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد چین کے متوقع عالمی کردار سے نمٹنا ہے۔

اس صورتحال میں اگر مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے چین کے طرز عمل میں تبدیلی آتی ہے تو اسے اس کے قومی مفادات سے الگ کر کے دیکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ ایران کی صورتحال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

ان حالات میں جبکہ ایک طرف مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین اور نہتے کشمیری عوام پر بھارتی افواج کے مظالم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے بین الاقوامی اور علاقائی طور پر دوست ممالک کی ترجیحات میں واضح تبدیلیاں دکھائی دے رہی ہیں، وزارت خارجہ کی سست روی اور مسئلہ سے نمٹنے کے لیے روایتی طرز عمل پر قناعت انتہائی تکلیف دہ بات ہے۔ اور

اس سے زیادہ اذیت ناک بات یہ ہے کہ حکومتی پارٹیوں اوراپوزیشن نے مسئلہ کی نزاکت کا احساس کرنے اور مسئلہ کشمیر پر مشترکہ قومی موقف اختیار کرنے کی بجائے اس نازک قومی مسئلہ کو باہمی کشمکش اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔

ہم حکومت اور اپوزیشن سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں اور مل بیٹھ کر مسئلہ کشمیر پر مشترکہ موقف اور پالیسی اختیار کریں تاکہ اہل پاکستان آزادیٔ کشمیر کے سلسلہ میں اپنی قومی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرسکیں۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... اپریل ۱۹۹۴ء)

تحریکاتِ آزادی کا جہاد

افغان جہاد اور راجہ انور صاحب کا مغالطہ

راجہ انور صاحب محترم کو روسی استعمار کی فوج کشی کے خلاف افغان عوام اور علماء کا جہاد سمجھ نہیں آرہا لیکن وہ برطانوی استعمار کے خلاف متحدہ ہندوستان کے مختلف گروپوں کی عسکری جدوجہد کو جہاد تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ راقم الحروف نے یہی سوال کیا تھا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے کہ ایک کو جہاد کہا جائے اور دوسرے کو جہاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ راجہ صاحب نے لکھا ہے کہ

> ''جہاں مسلم ریاست اپنا وجود یا اپنا اقتدار اعلیٰ کھو دے وہاں عوامی حمایت (اجتہاد) کے ذریعے مسلح تحریک آزادی (یعنی جہاد) کا آغاز تو کسی حد تک قابل فہم معاملہ ہے لیکن جہاں مسلم ریاست مکمل طور پر اپنا وجود رکھتی ہو اور اس کا اقتدار اعلیٰ بھی کلیتاً اس کے پاس ہو وہاں جہاد کا اعلان کون کرے گا؟''

گویا اس طرح راجہ صاحب محترم نے متحدہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف مسلمانوں کے جہاد آزادی اور روسی استعمار کے خلاف افغان عوام کے جہاد میں فرق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہاں بھی تاریخی تناظر اپنی اصلی شکل میں ان کے سامنے نہیں ہے اس لیے کہ متحدہ ہندوستان میں جب شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جانشین حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا اس وقت دہلی میں مغلوں کی بادشاہت ابھی قائم تھی، حکم و قانون مغل بادشاہ کے نام سے ہی نافذ ہوتا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجیں اسی طرح مغل بادشاہ کی معاونت کے عنوان سے دہلی پر مسلط

تھیں جس طرح ببرک کارمل کی حمایت وحفاظت کے نام سے روسی فوجیں کابل میں براجمان ہوگئی تھیں۔ دہلی کے مغل حکمران شاہ عالم ثانی اور کابل کے کمیونسٹ حکمران ببرک کارمل کے ''اقتدار اعلیٰ'' کی نوعیت ایک جیسی تھی اور دونوں کی قوت نافذہ غیرملکی اور غیرمسلم مسلح افواج کی صورت میں مسلم ریاست کے وجوداوراس کے اقتداراعلیٰ کوگھن کی طرح چاٹ رہی تھی۔اس لیے اگر دہلی میں مغل بادشاہ کے موجود ہوتے ہوئے شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ جہاد درست تھا تو کابل میں ببرک کارمل کی حکومت کے باوجود افغان علماء کا فتویٰ جہاد بھی درست تھا اور دونوں کی اصولی اور شرعی حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

راجہ صاحب محترم نے سوال کیا ہے کہ کیا کسی جنگ کے ''جہاد'' ہونے کے لیے صرف علماء کا فتویٰ ہی کافی ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والی تین جنگوں میں جہاد کا فتویٰ کس نے دیا تھا؟

راجہ صاحب سے گزارش ہے کہ کسی جنگ کے جہاد ہونے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ باقاعدہ اسلامی ریاست قائم ہواورامیرالمومنین کی طرف سے جہاد کا اعلان کیا جائے۔لیکن جہاں اسلامی ریاست موجود نہ ہو یا مسلم حکمران خود غیرمسلم اور حملہ آور قوتوں کا یرغمال ہو جائے وہاں اعلان جہاد کا یہ فریضہ علمائے کرام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ فقہی اصول ہےاور بہت سے ایسے شرعی احکام میں جن کا نفاذ حکومت پر موقوف ہے مگر کوئی اسلامی حکومت موجود نہیں ہے یا مسلم حکومت اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے گریز کر رہی ہے، مثلاً اقامت صلوٰۃ، اقامت جمعہ وعیدین، نکاح و طلاق کے تنازعات،اورزکوٰۃ کی وصولی وصرف وغیرہ جیسے معاملات،تو ان میں خلاء کو قبول نہیں کیا جائے گا اوراحکام کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے علمائے کرام اس فریضہ کو سنبھال لیں گے اور ہر دور میں علماء نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور نبھایا ہے۔اسی طرح جہاں مسلم حکومت موجود نہ ہو یا موجود ہولیکن کافروں کے نرغے میں ہواوراس وقت کے معروضی حالات جہاد کا تقاضا کرتے ہوں تو علماء کا فریضہ بن جاتا ہے کہ وہ اس خلاء کو پر کریں اورایسی صورت میں ان کے اعلان اورفتویٰ سے ہی کوئی جنگ ''شرعی جہاد'' کی حیثیت اختیار کرے گی۔

جہاں تک تین پاک بھارت جنگوں کا تعلق ہے تو راجہ انور ان کے حوالہ سے بھی اپنا ریکارڈ

درست کر لیں کہ پہلی جنگ میں باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دیا گیا تھا جس سے مولانا مودودیؒ نے اختلاف کیا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ جہاد کشمیر کی شرعی حیثیت سے مولانا مودودیؒ کا یہ اختلاف تو راجہ صاحب محترم کو ضرور یاد ہوگا لیکن جس فتویٰ جہاد سے انہوں نے اختلاف کیا تھا وہ راجہ صاحب کے ذہن کے کسی گوشے میں شاید محفوظ نہ ہو اس لیے بطور یاددہانی میں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی علمائے کرام نے جہاد کا باقاعدہ فتویٰ صادر کیا تھا اور دیگر علمائے کرام کے علاوہ دو رسالے تو مجھے اچھی طرح یاد ہیں جو اس وقت کے دو بڑے علماء نے اسی مسئلہ پر لکھے تھے۔ ایک رسالہ ''جہاد'' کے نام سے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ نے لکھا تھا جو اب بھی چھپ رہا ہے جبکہ دوسرا رسالہ ''شوق جہاد'' کے عنوان سے میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے تحریر کیا تھا۔ ضیاء الحق مرحوم ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ضلع سیالکوٹ میں نندی پور کے مقام پر تعینات تھے اور کبھی کبھار جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے گکھڑ میں حضرت والد صاحب کے پاس آجاتے تھے، ان کی فرمائش پر والد صاحب نے یہ رسالہ لکھا تھا اور بٹ دری فیکٹری گکھڑ کے مالک حاجی اللہ دتہ صاحب مرحوم نے کئی ہزار کی تعداد میں اسے چھپوا کر ضیاء الحق مرحوم کو فوجی جوانوں میں تقسیم کرنے کے لیے دیا تھا۔

اسی طرح ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی علمائے کرام کے مختلف حلقوں نے اس جنگ کو جہاد قرار دینے کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کی مجلس شوریٰ کی طرف سے اس جنگ کو جہاد قرار دینے کے اعلان تو مجھے بھی یاد ہے جسے خود میں نے اخبارات کے لیے رپورٹ کیا تھا اور قومی اخبارات نے اسے شائع کیا تھا۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۱۵ مئی ۲۰۰۰ء)

حکومتی اعلان کے بغیر جہاد اور جنرل مشرف

......دوسری بات جنرل پرویز مشرف نے جہاد کے بارے میں کہی ہے اور یہ ''فتویٰ'' صادر کیا ہے کہ جہاد کے اعلان کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے اور حکومت کے اعلان کے بغیر کسی جہاد کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے بعض دانشور مسلسل کہہ رہے ہیں اور ہوسکتا ہے کسی

ایسے دانشور نے ہی صدر محترم کو یہ پٹی پڑھائی ہو، لیکن یہ بات اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے تسلسل سے مطابقت نہیں رکھتی، اس لیے اس کی وضاحت ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے خلاف ''اعلانِ جہاد'' حکومت ہی کا حق ہے اور کسی فرد یا طبقہ کا یہ استحقاق نہیں ہے کہ وہ کسی ملک یا قوم کے خلاف اپنے طور پر جہاد کا اعلان کرے، لیکن مسلم سوسائٹی پر مسلط ہونے والے کفر سے نجات حاصل کرنے کے لیے جہاد کے اعلان کے لیے کسی حکومت کی اجازت ضروری نہیں اور اگر کسی مسلم آبادی پر کافروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے تو اس تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کسی حکومتی اعلان کے بغیر عام مسلمانوں کو بھی حق ہے کہ اگر وہ مزاحمت کر سکتے ہیں تو علمِ جہاد بلند کریں اور مسلم آبادی کو کافروں سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کریں۔

☆ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جنوبی ایشیا کی تمام تحریکات آزادی جو جہاد کے عنوان سے لڑی گئیں اسی اصول پر تھیں۔ شہدائے بالاکوٹ، بنگال میں حاجی شریعت اللہؒ اور تیتو میرؒ کی مسلح تحریکات، پنجاب میں احمد خان کھرل شہیدؒ کی تحریک مزاحمت، ۱۸۵۷ء کا معرکہ حریت، سرحد میں حاجی صاحب ترنگ زئیؒ اور فقیر ایپیؒ کی تحریکات،

☆ الجزائر کی جنگ آزادی،

☆ سوڈان میں مہدی سوڈانی کا معرکہ حریت،

☆ اور دنیائے اسلام کی دیگر مسلح تحریکات آزادی کے ساتھ ساتھ روسی جارحیت کے خلاف افغان عوام کی مزاحمت بھی جہاد کے عنوان سے تھی اور اس کا اعلان کسی حکومت نے نہیں کیا تھا، بلکہ افغانستان کے اس جہاد کو پاکستانی حکومت اور فوج نے بھی سپورٹ کیا۔

☆ اسی طرح کشمیر کی جنگ آزادی بھی جہاد کے پرائیویٹ فتویٰ سے شروع ہوئی تھی اور اس وقت آزاد کشمیر کے نام سے جو خطہ پاکستان کے ساتھ ہے وہ ''پرائیویٹ جہاد'' ہی کا ثمرہ ہے اور اس کے بعد بھی کشمیر کے عوام آزادی کے لیے جس جہاد میں مصروف ہیں وہ کسی حکومت کے اعلان کی بنیاد پر نہیں ہے۔

☆ اس کے علاوہ فلسطین کے عوام گزشتہ نصف صدی سے جو مسلح مزاحمت جہاد کے نام سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے اسرائیلی درندگی کے سامنے

ڈٹے ہوئے ہیں اس کا اعلان کس حکومت نے نہیں کیا تھا بلکہ پرائیویٹ جماعتیں ہیں جو مسلم حکمرانوں اور حکومتوں کی بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے جہاد کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اسرائیلی جبر وتشدد کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

اس لیے یہ کہنا کہ جہاد کے اعلان کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے اور اس کے سوا کسی اور کو جہاد کا اعلان کرنے کا حق نہیں ہے، مسلم دنیا کی ان تمام مسلح تحریکات آزادی کی نفی کے مترادف ہے جو برطانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور روسی استعماروں کے تسلط کے خلاف مسلم ممالک میں لڑی گئیں اور جن کے نتیجے میں آج مسلم ملکوں کے دارالحکومتوں میں کچھ لوگ اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہیں۔

کسی جہادی تحریک کا وقتی طور اپنے اہداف کا حاصل نہ کرسکنا اور بات ہے اور اس کی اصولی و اخلاقی حیثیت اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ یہ غلامانہ نفسیات کا کرشمہ ہے کہ کسی مہم میں کامیابی حاصل نہ کرسکنے پر اس کے اسباب کا جائزہ لینے اور ان کا سدِ باب کرنے کی بجائے ہم سرے سے اس مہم کے جواز کے بارے میں ہی شک وشبہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت کی ناکامی کے بعد بھی ایسا ہوا تھا کہ جب انگریزوں کے خلاف مسلح مزاحمت کامیاب نہ ہوسکی تو مشروعیت اور جواز کی بحث شروع ہوگئی اور مرزا غلام احمد قادیانی جیسے لوگوں نے تو جہاد کی منسوخی کا ہی اعلان کر دیا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، وہی منظر ہے، وہی کردار ہیں اور وہی میدان ہے، البتہ برطانوی استعمار کی جگہ امریکی استعمار نے لے لی ہے، جہادی تحریکات امریکی قوت کے سامنے بے بس ہوتی جا رہی ہیں اور یار لوگوں نے اس بے بسی کے اسباب کی نشاندہی اور اس کے پس منظر میں متحرک کرداروں کو بے نقاب کرنے کی بجائے سرے سے جہاد کے جواز کو ہی موضوع بحث بنا لیا ہے۔ ان دوستوں سے گزارش ہے کہ یہ بحث برطانوی استعمار کے تسلط کے دور میں بہت ہو چکی ہے اس پر دونوں طرف سے بہت سے دلائل دیے جا چکے ہیں اور زمانہ اس بحث کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ چکا ہے۔ اس موقف کو کہ کسی مسلم آبادی پر کافروں کے تسلط سے نجات کے لیے جہاد کے اعلان کے لیے بھی حکومت کی اجازت ضروری ہے، مسلم امہ کے کسی حصے نے قبول نہیں کیا اور اس

کے بعد بھی درجنوں مسلم ممالک میں جہاد کے پرائیویٹ فتویٰ کی بنیاد پر آزادی کی جنگیں لڑی گئی ہیں جو کامیاب بھی ہوئی ہیں اور آج جو مسلم حکمران ''آزاد مسلم ممالک'' کے اصحاب اقتدار کہلاتے ہیں ان کا یہ اقتدار اور کروفر اسی ''پرائیویٹ جہاد'' میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے عظیم شہداء کے مقدس خون کا صدقہ ہے۔

ہمارے ان دوستوں کا ارشاد ہے کہ اگر کسی مسلم معاشرہ پر کافروں کا غلبہ ہو جائے اور مسلمان اپنے اقتدار سے محروم ہو جائیں تو انہیں مزاحمت اور جہاد کے لیے حکومت کا انتظار کرنا چاہیے جو کافروں کی تسلط کی وجہ سے پہلے ہی ختم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ کوئی کٹھ پتلی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ کافروں کے غلبہ اور تسلط کو جواز فراہم کرنے کی اس سے زیادہ آسان صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ

''نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی''۔

(روزنامہ اسلام، لاہور...... یکم مارچ ۲۰۰۴ء)

جہادی تحریکات، سی ٹی بی ٹی اور قرآن کا حکم

ایک قومی اخبار کے لاہور ایڈیشن کی رپورٹ کے مطابق چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے ساتھ ملاقات کے دوران ان پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جا سکتا ہے جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جا سکا تھا۔ مذکورہ رپورٹ میں اعلیٰ عسکری ذرائع کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتا دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ اور اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں نہیں دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرمِ عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جا سکتا۔

اس سے قبل یہ خبریں قومی پریس کے ذریعے سامنے آ چکی ہیں کہ امریکی سینٹروں نے جنرل پرویز مشرف کے ساتھ ملاقاتوں میں جن امور پر زور دیا ہے ان میں سی ٹی بی ٹی (Comprehensive Test Ban Treaty) پر دستخط کرنے، حرکۃ المجاہدین اور دیگر جہادی تنظیموں پر پابندی لگانے، مولانا مسعود اظہر کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے، ان کے خلاف دہشت گردی کے الزام میں مقدمہ درج کرنے، اور عرب مجاہد اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں تعاون کرنے کے تقاضے بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن جنرل پرویز مشرف نے یہ کہہ کر پاکستانی عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے کہ وہ جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ جنرل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جہاد اور جہادی تنظیمیں صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کا دائرہ پورے عالمِ اسلام تک پھیلا ہوا ہے اور جہاد کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے اسے لیے اسے روکنا

ممکن نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی قوتوں کے لیے پریشانی کی اصل بات بھی یہی ہے کہ جہاد کا دائرہ پوری دنیا میں وسیع ہوتا جا رہا ہے، ورنہ جب تک جہاد کا یہ عمل صرف افغانستان تک محدود تھا اور اس کی زد صرف روس پر پڑ رہی تھی اس وقت تک مغربی ملکوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ اس سے خوش تھے اور جہادی تنظیموں کی حمایت و امداد میں بھی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس وقت ان کا خیال یہ تھا کہ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد افغانستان کی مجاہد تنظیمیں شاید امریکہ کے سامنے اظہارِ تشکر میں سجدہ ریز ہو جائیں گی اور امریکہ بہادر آسانی کے ساتھ انہیں کچھ اور تھپکی دے کر سنکیانگ میں چین کے خلاف صف آرا کر دے گا۔ مگر ان مجاہدین تنظیموں نے چین کی طرف رخ کرنے کی بجائے پہلے خود امریکہ سے نمٹ لینا زیادہ ضروری سمجھا اور نہ صرف یہ کہ فلسطین، کشمیر، صومالیہ، بوسنیا، کسوو، چیچنیا، مورو، اراکان اور اب انڈونیشیا میں جہاد کا چرچا ہونے لگا۔ بلکہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی مسلح افواج کی موجودگی ان مجاہدین کو زیادہ کھٹکنے لگی اور مختلف مسلم ممالک سے جہاد افغانستان میں شرکت کے لیے آنے والے نوجوانوں نے اپنے اپنے ملکوں کی مغرب نواز اور امریکہ پرست حکومتوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں تو امریکہ بہادر کو یہ بات سمجھ آئی کہ یہ مجاہدین تو فی الواقع جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں۔ اسی جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کے لیے برطانوی استعمار کو مرزا غلام احمد قادیانی اور زارشاہی روس کو محمد علی باب اور بہاء اللہ شیرازی جیسے جھوٹے نبی کھڑے کرنا پڑے تھے اور جس جہاد سے جان چھڑانے کے لیے ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کا تیا پانچہ کیا گیا تھا۔

امریکہ بہادر کو یہ بات بھی تکلیف دے رہی ہے کہ جن مجاہدین کو روس کے خلاف اسلحہ خود اس نے فراہم کیا تھا اور ان میں سے بہت سے نوجوانوں کو ٹریننگ بھی دی تھی وہی مجاہدین اب خود امریکہ کے سامنے کھڑے ہیں اور پوری دنیا میں اس کے لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس لیے اب امریکہ جہاد کی آواز کو دنیا سے ختم کرنا چاہتا ہے، مجاہدین کے عالمی نیٹ ورک کو توڑنے کے درپے ہے اور جہادی تحریکوں کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں بدنام کرنے اور مسلم ممالک کی ریاستی قوت کے ذریعے انہیں کچلنے کی منصوبہ بندی کیے بیٹھا ہے۔ مگر اب وقت گزر چکا

ہے کیونکہ جہادی تحریکات نے پوری دنیا میں وسیع نیٹ ورک قائم کرلیا ہے اور ان کی جڑیں مسلمان عام میں اتنی گہری ہوچکی ہیں کہ انہیں ختم کرنے کی امریکی خواہش حسرت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ مغرب استعمار کے لیے اب دانت پیسنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔

اس لیے ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو جہادی تحریکات کے بارے میں ملت اسلامیہ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے اور امریکی سینٹروں کو معروضی حقائق سے آگاہ کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جنرل صاحب! یہ سی ٹی بی ٹی کا چکر بھی اسی ایجنڈے کا حصہ ہے اور امریکی خواہشات اور مطالبات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو جہادی تحریکات پر پابندی لگانے اور ایٹمی پروگرام پر بین الاقوامی کنٹرول قبول کرنے کے ان دونوں مطالبات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں تقاضوں کی عِلت اور پس منظر ایک ہی ہے اور دونوں کا مقصد بھی ایک ہے کہ عالمِ اسلام اس قابل نہ رہے کہ وہ بھارت اور اسرائیل جیسی مسلمان دشمن طاقتوں کے لیے خطرہ بن سکے، تاکہ خلیج عرب میں اسرائیل کی بالادستی اور جنوبی ایشیا میں بھارت کی تھانیداری قائم کرنے کا منصوبہ کسی رکاوٹ کے بغیر پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اور مسلم دنیا کو ایک بار پھر صدیوں کی غلامی کے نئے شکنجے میں جکڑا جا سکے۔ امریکہ بھارت کو ایٹمی طاقت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے اور اسرائیل کے پاس ایٹم بموں کی موجودگی پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر پاکستان کا ایٹمی قوت ہونا اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے، اور وہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک کو اسلام، جہاد اور ایٹمی قوت تینوں سے محروم کر دینے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے اور اسی لیے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے لیے پاکستان پر مسلسل دباؤ بڑھایا جا رہا ہے۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حامی عناصر کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس معاہدے پر دستخط کر دینے سے پاکستان کی ایٹمی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اس کے عوض ملک کو بہت سی مراعات حاصل ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ جب ایٹمی قوت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا تو بہت سی مراعات آخر کس چیز کے عوض حاصل ہوں گی؟ اور مغرب کا یہودی ساہوکار ہم پر کس لیے اتنا مہربان ہو رہا ہے کہ کوئی معاوضہ وصول کیے بغیر وہ ہمیں مراعات سے مالا مال کر دینا چاہتا ہے؟

ہمیں جن اقتصادی سہولتوں کی خوشخبری دی جا رہی ہے اور جس معاشی خوشحالی کے سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں آخر وہ کس چیز کے بدلے میں ہیں؟ سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں سے پاکستان کی ایٹمی پوزیشن میں کوئی فرق نہ پڑنے کا ڈھنڈورا پیٹنے والے دانشور اگر اس گتھی کو سلجھا سکیں اور مغرب کے یہودی سرمایہ کاروں کی ہم پر متوقع بے تحاشا نوازشات کی وجہ بتا سکیں تو ان کی بے حد نوازش ہوگی۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دینے کی حمایت میں یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ دستخط کر دینے کا مطلب ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنا نہیں بلکہ مزید آگے بڑھنے سے روکنا ہے، جبکہ ہم اس وقت اتنی ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں کہ ہمیں اس میں مزید پیشرفت کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اگر اپنے ایٹمی پروگرام پر سی ٹی بی ٹی کے ذریعے بین الاقوامی کنٹرول قبول کر لیتے ہیں اور خود کو ایک معاہدہ کا پابند کر لیتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس بین الاقوامی کنٹرول کی کنٹرولنگ اتھارٹی آئندہ ہمیں اس ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے کے لیے کبھی نہیں کہے گی؟ آخر اس معاملہ میں کنٹرولنگ اتھارٹی خود ہم تو نہیں ہیں بلکہ یہ پوزیشن انہی بین الاقوامی اداروں اور قوتوں کو حاصل ہے جو نصف صدی سے ہمارے خلاف بھارت اور اسرائیل کو ہر طرح سپورٹ کرتے چلے آ رہے ہیں اور ہماری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان قوتوں اور اداروں کو ہم گزشتہ پچاس برس سے دیکھ رہے ہیں بلکہ بھگت رہے ہیں اس لیے ان کی کسی بات اور کسی وعدے پر بھروسہ آخر کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

چنانچہ ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے یہ گزارش کریں گے کہ جس طرح انہوں نے جہاد اور جہادی تحریکات کے بارے میں امریکی سینٹروں کے سامنے اپنے ایمانی جذبات اور پاکستانی عوام کے دلی احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے اسی طرح ایٹمی پروگرام اور سی ٹی بی ٹی کے بارے میں بھی اپنے ملک کے غیور عوام کے جذبات سے امریکہ اور دیگر عالمی قوتوں کو پورے حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ آگاہ کر دیں۔ اور پھر یہ مسئلہ صرف جذبات و احساسات کا ہی نہیں بلکہ ہمارے عقیدہ و ایمان کا بھی ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ''جنگی قوت'' حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کی حد بھی بیان کی ہے **''ترهبون به عدو الله وعدوكم''** (الانفال) کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب قائم ہو یعنی مقابلہ میں طاقت کا توازن

مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے جب تک ایٹمی توانائی اور جدید ترین جنگی قوت کے حوالہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان طاقت کے تناسب میں توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آجاتا اور مسلم ممالک ''ترهبون به عدو اللّٰه'' کی پوزیشن میں نہیں آجاتے، ایٹمی قوت میں کسی پیشرفت پر پابندی قبول کرنا قرآن کریم کی منشا اور حکم کے خلاف ہے، وہی قرآن کریم جسے ہاتھ میں لے کر بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے لاکھوں مسلمانوں کے سامنے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا دستور یہ قرآن ہوگا اور اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور دستور کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے جنرل صاحب سے یہ استدعا ہے کہ جہاد اور جہادی تحریکات کی طرح ''جہادی قوت'' کے بارے میں بھی قرآن کریم کے حکم اور مسلمانوں کے دینی وملی جذبات سے مغربی قوتوں کو دوٹوک طور پر آگاہ کر دیں کہ ملک اور قوم دونوں کا مفاد اسی میں ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۲۳ جنوری ۲۰۰۰ء)

جہادی تربیتی کیمپ
وزیر داخلہ کے نام کھلا خط

بعداز سلام مسنون!

گزارش ہے کہ گزشتہ روز ایک قومی اخبار نے آنجناب کے حوالہ سے خبر شائع کی ہے کہ

''امریکہ کی طرف سے پاکستان سے دہشت گردی کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنے کے مطالبہ پر لندن میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وزیر داخلہ نے صحافیوں کو بتایا کہ انہوں نے طالبان کی حکومت پر واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر موجود تمام تربیتی کیمپ بند کر دے جہاں پر پاکستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مسلح تربیت حاصل کرتے ہیں۔ وزیر داخلہ معین الدین حیدر نے کہا ہے کہ انہوں نے سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ پر بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ قتل و غارت گری بند کر دیں اور اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو حکومت ان کے خلاف سختی سے نمٹے گی''۔

میں اس سلسلہ میں آنجناب کی توجہ چند حقائق کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ افغانستان میں موجود عسکری تربیت کے کیمپوں اور طالبان کی اسلامی حکومت کے بارے میں ایک عرصہ سے عالمی سطح پر اس تاثر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کیمپوں میں دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے اور طالبان حکومت اس دہشت گردی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں سنی شیعہ کشمکش اور باہمی قتل

وغارت کے عنصر کو شامل کر کے اس تاثر کو یہ رخ دیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کرنے والے سب لوگ انہی کیمپوں میں تربیت پاتے ہیں اس لیے پاکستان میں فرقہ وارانہ امن کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ افغانستان کے ان جہادی تربیتی مراکز کو بند کر دیا جائے۔

یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے جو مغربی میڈیا اور مغرب کی سیکولر لابیاں منظّم طور پر پھیلا رہی ہیں اور امریکہ اس میں قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے جس نے جنوبی ایشیا میں اپنے استحصالی اور استعمار پسندانہ عزائم کو بروئے کار لانے کے لیے یہ تکنیک اختیار کی ہے اور میں آنجناب سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کا اصل منظر یہ نہیں ہے جو ورلڈ میڈیا کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور آپ جیسے سنجیدہ حضرات نے بھی اگر اس کی تائید شروع کر دی ہے، اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ امریکہ جنوبی اور وسطی ایشیا کے حوالہ سے اپنے ایجنڈے کے لیے اس خطہ کے حکمران طبقہ کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور جنوبی ایشیا کے دورہ سے صدر کلنٹن کے خالی ہاتھ واپس جانے کا تاثر امریکی ذرائع ابلاغ کی طرف سے طے شدہ پالیسی کے تحت اندرون خانہ طے ہونے والے معاملات پر پردہ ڈالنے کے لیے دیا جا رہا ہے۔

جناب والا! امریکہ اس خطہ میں جو کچھ چاہتا ہے وہ یقیناً آپ سے مخفی نہیں ہوگا، میں یاد دہانی کے طور پر بعض اہم امور کا ذکر اس عریضہ میں مناسب سمجھتا ہوں:

☆ امارت اسلامی افغانستان کی حکومت نے مغربی ثقافت اور اقوام متحدہ کے منشور کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی بنیاد پر خالص اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا جو عزم کر رکھا ہے وہ امریکہ کے لیے قابل قبول نہیں ہے اور امریکہ طالبان پر دباؤ ڈال کر انہیں ''وسیع البنیاد حکومت'' کے نام پر ایک ایسی مشترکہ حکومت کا حصہ بننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے جو دنیا کی بہت سی دیگر مسلم حکومتوں کی طرح ''اسلام اسلام'' کا راگ تو الاپتی رہے مگر افغانستان میں اقوام متحدہ کے منشور کے نفاذ اور مغربی ثقافت اور کلچر کے فروغ میں رکاوٹ نہ بنے۔

☆ اس خطہ کی معیشت پر پہلے سے حاصل بالادستی کو امریکہ ''آزادانہ تجارت'' اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے مکمل اجارہ داری اور کنٹرول میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور چین سمیت

کسی بھی دوسری قوت کے اس میں در آنے کے امکانات کو مکمل طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔

☆ امریکہ چین کے خلاف بھارت کی سربراہی میں متحدہ محاذ کے قیام میں اسلامی جمہوریہ پاکستان اور امارت اسلامی افغانستان کو رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان رکاوٹوں کو اس قدر کمزور کر دینا چاہتا ہے کہ وہ امریکہ یا بھارت کے کسی بھی اقدام کی راہ میں کسی درجہ میں بھی حائل نہ ہو سکیں۔

☆ امریکہ اور بھارت کو مشترکہ طور پر پریشانی یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کے خلاف جو مجاہدین سالہا سال سے نبرد آزما ہیں اور جن کی جدوجہد اور قربانیوں کی وجہ سے مسئلہ کشمیر ایک بار پھر عالمی ایجنڈے میں اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے ان مجاہدین نے افغانستان کے انہی تربیتی مراکز میں ٹریننگ حاصل کی ہے اور ان تربیتی مراکز کو بند کرائے بغیر کشمیری مجاہدین کی سپلائی لائن کو کاٹا نہیں جا سکتا اور نہ ہی مسئلہ کشمیر کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

☆ امریکہ کو یہ بھی پریشانی ہے کہ افغانستان میں جو تربیتی مراکز خود اس کے تعاون سے قائم ہوئے تھے اور جن مراکز نے افغان قوم کو روسی افواج کے مقابلہ میں صف آرا کر کے سوویت یونین کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تھا ان مراکز سے دنیا بھر کے دیگر مسلم مجاہدین نے بھی عسکری تربیت حاصل کر لی ہے اور بوسنیا، کوسوو، فلسطین، کشمیر، چیچنیا، مورو، اراکان اور صومالیہ وغیرہ میں اسلام کی سربلندی کے نام سے صف آرا ہو چکے ہیں جس سے دینی حلقے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے ہیں جس سے مسلم دنیا میں جہاد کا وہ عمل اور جذبہ ایک بار پھر عالمی سطح پر منظّم ہو رہا ہے جسے ختم کرنے کے لیے مغربی طاقتیں دو صدیوں سے اپنے تمام وسائل کے ساتھ مصروف کار رہی ہیں مگر ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود فلسطین سے انڈونیشیا تک اور چیچنیا سے صومالیہ تک پوری دنیائے اسلامی میں پھر سے جہاد کے نعرے پورے جوش و خروش کے ساتھ گونج رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے امریکہ افغانستان کے ان تربیتی مراکز کو جلد از جلد بند کرانے کے لیے بے چین ہے۔

جناب وزیرداخلہ! جہاں تک پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اورفرقہ وارانہ قتل وغارت گری کا تعلق ہے یہ بلاشبہ انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے اوراس کی روک تھام کے لیے حکومت پاکستان اورتمام ترقومی حلقوں کوسنجیدگی کے ساتھ پیشرفت کرنی چاہیے۔لیکن اس فرقہ وارانہ قتل وغارت کا ذمہ دارافغانستان کے تربیتی کیمپوں کوٹھہرانااوراس کی آڑ میں طالبان حکومت سے ان مراکز کی بندش کا مطالبہ کرنا سراسرناانصافی اورظلم ہے۔ مجھےاس سے انکارنہیں ہے کہ ان کیمپوں سے تربیت پانے والے کچھ افراد پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت میں ملوث ہوئے ہوں گےلیکن یہ ہرادارے میں ہوتا ہے۔اگر پاکستان کی جیلوں اورمقدمات کے ریکارڈ کااس نقطۂ نظر سے جائزہ لے لیا جائے کہ ملک بھرمیں قتل وغارت کرنے والے افراد نے اسلحہ چلانے کی ٹریننگ کہاں کہاں حاصل کی ہےتو ان میں یقیناً ایسے افرادنکل آئیں گے جنہوں نے اسلحہ کی تربیت پاک فوج اور پولیس کےتربیتی مراکز میں حاصل کی ہوگی۔لیکن کوئی بھی باہوش شخص محض اس بناپر پاک فوج اور پولیس کےتربیتی مراکزکوملک میں بدامنی اورقتل کا ذمہ دارقرارنہیں دے گااس لیے کہ چندافراد کی انفرادی کارروائیوں کواداروں اورمراکز کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا۔اسی طرح افغانستان کےتربیتی مراکزکوبھی پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کا باعث اورذمہ دارقرار دیناقرین انصاف نہیں ہے۔......

(روزنامہ اوصاف،اسلام آباد......۱۸اپریل ۲۰۰۰ء)

جہادِ کشمیر اور بعض حلقوں کے تحفظات

پاکستان کے بعض علمی حلقوں اور شخصیات کو اشکال ہے کہ کشمیر کا جہاد افغانستان کی طرح کا نہیں ہے اس لیے کہ افغانستان میں جہاد کا فتویٰ علماء نے دیا تھا اور جہادی گروپ اس کی بنیاد پر روسی استعمار کے خلاف جہاد کر رہے تھے، جبکہ ان کے خیال میں کشمیری مجاہدین کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ اپنے عمل اور فیصلوں میں آزاد نہیں ہیں بلکہ ایجنسیوں کا کنٹرول ان پر حاوی ہے اور کنٹرولر قوت نے خود جہاد کا کوئی اعلان نہیں کیا، اس لیے ان حضرات کے نزدیک جہاد کشمیر کو افغانستان کی طرح کے شرعی جہاد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

لیکن میرے نزدیک اس کی حیثیت ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے اس لیے کہ یہ مفروضہ صرف اس صورت میں قبول کیا جا سکتا ہے جب جہاد کشمیر کا نقطہ آغاز موجودہ جہادی گروپوں کی حالیہ جدوجہد کو قرار دیا جائے جبکہ فی الواقع صورتحال یہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل تاریخی تناظر یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد کشمیری علماء نے جن میں امیر شریعت مولانا عبد اللہ کفل گڑھی، مولانا غلام حیدر جنڈالوی، مولانا محمد یوسف خان آف پلندری، مولانا عبد الحمید قاسمی، مولانا محمد عبد اللہ سیا کھوی، مولانا مظفر حسین ندوی اور دیگر سرکردہ علماء شامل تھے، ڈوگرہ حکمرانوں کے تسلط کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا اور اس کی بنیاد پر خود میدان جہاد میں نکل کر آزادیٔ کشمیر کے لیے جہاد کا آغاز کیا تھا جس کے نتیجے میں آزاد کشمیر کی موجودہ ریاست قائم ہوئی۔ اس کے بعد نہ ان علماء نے اپنا یہ فتویٰ واپس لیا اور نہ ہی کشمیری عوام آزادی کے مطالبہ اور جدوجہد سے دستبردار ہوئے۔

اس لیے جہاد کشمیر کا موجودہ راؤنڈ اسی تسلسل کا حصہ ہے اور اس کی شرعی اساس بھی مذکورہ بالا علماء کرام کے اسی فتویٰ پر ہے جس کے ذریعے انہوں نے ڈوگرہ استعمار سے جنگ لڑ کر آزاد کشمیر کا

خطہ آزاد کرایا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی جہاد کشمیر میں زیادہ تر حصہ دینی جماعتوں، دینی مدارس کے طلبہ اور علماء کرام کا ہے جو اصل فریق ہیں جبکہ حکومت پاکستان اور ایجنسیوں کی حیثیت آج بھی اسی طرح کے معاون کی ہے جس طرح کی معاونت ان کی طرف سے جہاد افغانستان کو حاصل رہی ہے۔ البتہ سرحدی حالات اور علاقائی مجبوریوں کا دائرہ اس سے قطعی مختلف ہے اور وہی فرق بعض ذہنوں کو بلاوجہ الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔ میرا خیال ہے کہ جہاد کشمیر کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرنے والے حضرات اس مسئلہ کو وقتی حالات کی بجائے تاریخی تناظر کے وسیع دائرہ میں دیکھیں تو ان کا اشکال خود بخود درفع ہو جائے گا اور وہ بھی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ کشمیری عوام کی یہ جدوجہد شرعی جہاد کا درجہ رکھتی ہے جس کی حمایت وامداد ہماری دینی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۲۳ اپریل ۲۰۰۱ء)

مسئلہ کشمیر اور نو آبادیاتی نظام کی جکڑ بندی

جماعۃ الدعوۃ کے امیر پروفیسر حافظ محمد سعید نے جب دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر مسئلہ کشمیر پر جدو جہد کو آگے بڑھانے کے لیے ''تحریک آزادیٔ کشمیر'' کے نام سے نیا مشترکہ فورم تشکیل دیا اور ملک بھر میں از سرِ نو سرگرمیاں شروع کر دیں تو مجھے یہ بات کھٹک گئی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اسے جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے بریکر کی طرف مسلسل بڑھتے جا رہے تھے جو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن کسی کے لیے آسانی کے ساتھ عبور کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔

''عملیات'' کی دنیا میں ایک معمول چلا آرہا ہے کہ عامل لوگ کچھ وظائف اور معمولات کے ساتھ اپنے اردگرد حصار قائم کر لیتے ہیں تاکہ کوئی ان تک نہ پہنچ پائے۔ ایسا روحانی عملیات میں بھی ہوتا ہے اور کالے علم کے سفلی عملیات میں بھی اس کا معمول موجود ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے ہماری اسٹیبلشمنٹ نے بھی اپنے اردگرد ایک مضبوط حصار قائم کر رکھا ہے کہ قوم کے مختلف حلقے جس حوالہ سے بھی متحرک ہوں اور جتنی بھی اچھل کود کرتے رہیں وہ اس حصار کا دائرہ کراس نہ کرنے پائیں جس کے اندر نو آبادیاتی نظام کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور کسی طرف سے بھی کوئی ایسی گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی کہ نو آبادیاتی نظام کے کسی شعبہ کے بنیادی ڈھانچے، پالیسی اور طریق کار میں کوئی تبدیلی لائی جا سکے۔ اس میں نفاذِ شریعت، تعلیمی اہداف، معاشرتی اقدار، معاشی خودمختاری، انتظامی و عدالتی ڈھانچے اور سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ مسئلہ کشمیر بھی شامل ہے۔

ان سب شعبوں میں گزشتہ سات عشروں کی صورتحال پر نظر ڈال لیں آپ کو تبدیلی کے مطالبات نظر آئیں گے، اصلاح و تجاویز کی فائلیں ادھر سے ادھر گھومتی دکھائی دیں گی، بیانات اور تجزیوں کا وسیع تناظر سامنے آئے گا، وعدوں اور تسلیوں کے سبز باغ آپ کی نگاہوں کے سامنے

رہیں گے، احتجاج واضطراب کی لہریں بھی مسلسل موجود ملیں گی لیکن کیا مجال ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود کسی شعبہ میں کوئی عملی تبدیلی دیکھنے میں آ جائے۔ ہم ستر سال کے بعد بھی کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھوم رہے ہیں بلکہ بعض معاملات میں تو ہم اس سے بھی پیچھے جا چکے ہیں۔ اور سیانوں کی محفلوں میں یہ کہا جانے لگا ہے کہ اس سے تو انگریزوں کا دور ہی بہتر تھا۔ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کرتا ہوں کہ یہ بات واقعتاً درست بھی ہے اس لیے کہ نوآبادیاتی نظام کو اس دور میں جن اہداف کے لیے تشکیل دیا گیا تھا، اسے جو لوگ چلا رہے تھے وہ ان اہداف سے واقف بھی تھے اور ان کے ساتھ مخلص بھی تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں نہ اس نظام کے اہداف کا علم ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ ہماری قومی درجہ کی کمٹمنٹ موجود ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک کمپاؤنڈر کی طرح چھوٹے موٹے اور وقتی مسائل تو حل کر رہے ہیں لیکن بڑی بیماریوں کو مزید سے مزید خراب کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس عمل میں عالمی استعمار کا کردار وہی ہے جو کاروباری دنیا کے ان بڑے کھلاڑیوں کا ہوتا ہے جو نئے اور کم تجربہ کار لوگوں کو سر اٹھانے سے ہر جائز و ناجائز اقدام کے ذریعے روکتے ہیں۔

گزشتہ دنوں مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے پارلیمنٹ کی ''قومی کشمیر کمیٹی'' کے غیر متحرک ہونے پر بہت زوردار تبصرے ہوئے اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں، اب مسئلہ کشمیر پر ''متحرک کردار'' کا حشر دیکھ کر ان دوستوں کی بھی تسلی ہوگئی ہوگی کہ یہاں تو قومی مقاصد کی طرف بڑھنے والوں کے قدموں کا باہمی فاصلہ بھی ماپا جاتا ہے اور نوآبادیاتی نظام کے حصار کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کا اس سے فاصلہ کم ہونے پر چاروں طرف خطرے کے الارم چنگھاڑنے لگ جاتے ہیں۔

تحریک آزادی کشمیر کے نام سے قائم ہونے والے نئے فورم نے سالِ رواں کو مسئلہ کشمیر کے لیے جدوجہد کا سال قرار دیا ہے، مختلف شہروں میں اجتماعات کا نظام ترتیب دیا ہے اور ۵ فروری کو ''یوم کشمیر'' بھرپور طریقے سے منانے کی حکمت عملی طے کی ہے۔ راقم الحروف بھی گزشتہ جمعہ کے روز گوجرانوالہ کے مرکز اقصیٰ میں منعقد ہونے والی ''آل پارٹیز کشمیر کانفرنس'' میں شریک ہوا، اس موقع پر جدوجہد کے اس نئے راؤنڈ کے ساتھ ہم آہنگی اور یک جہتی کے لیے جن خیالات کا اظہار

کیاان کا خلاصہ یہ ہے:

☆ مسئلہ کشمیر ہمارا قومی مسئلہ ہے کہ یہ تقسیم ہند کا ادھورا ایجنڈا ہے۔ اور مسئلہ کشمیر حل ہوئے بغیر پاکستان کی بین الاقوامی سرحدوں کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

☆ یہ ہمارا علاقائی مسئلہ ہے جو جنوبی ایشیا کے ممالک کے درمیان تعاون و اشتراک میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اور اس مسئلہ کو حل کیے بغیر جنوبی ایشیا کے ممالک آپس میں کوئی قابل عمل رابطہ کا نظام قائم نہیں کر سکتے۔

☆ یہ ہمارا دینی اور ملی مسئلہ ہے کہ کشمیر کی مسلم اکثریت اپنی آزادی اور اسلامی شناخت کی جنگ لڑ رہی ہے اور اسے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا مسلمہ حق نہیں دیا جا رہا ہے۔ اس لیے اس کی حمایت وامداد ہمارا شرعی فریضہ ہے۔

☆ یہ ایک بڑا عالمی مسئلہ بھی ہے کہ دنیا کے امن کے لیے فلسطین، شام اور کشمیر جیسے مسائل سنگین خطرہ بنے ہوئے ہیں اور عالمی امن کو کسی وقت بھی تباہ کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

چنانچہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے قومی سطح کی مشترکہ اور مربوط جدوجہد ضروری ہے اور تمام دینی وسیاسی جماعتوں اور طبقوں کو اس کے لیے بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔ ۵ فروری کو ملک بھر میں منایا جانے والا ’’قومی یوم کشمیر‘‘ یقیناً اس سلسلہ میں قومی موقف اور جذبات کے ازسرِ نو اظہار کا ذریعہ ہوگا جس کی بھرپور کامیابی کے لیے سب حلقوں اور طبقوں کو محنت کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہماری قومی ضرورت ہے کہ نوآبادیاتی نظام اور ماحول ونفسیات سے آزادی کے لیے سنجیدگی کے ساتھ محنت کی جائے کیونکہ ہمارا اصل مسئلہ ’’قومی خودمختاری‘‘ کی بحالی کا ہے۔

ہمارے دینی حلقے اگرچہ تحریک آزادی میں اپنے قائدانہ کردار کا فخر ساتھ ذکر کرتے ہیں جو بلاشبہ ان کا حق اور تاریخی حقیقت ہے لیکن نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ اور قومی خودمختاری کی بحالی کے معاملات میں وہ مفاد پرست سیاستدانوں اور اسٹیبلشمنٹ پر انحصار کر رہے ہیں جو خود فریبی سے کم نہیں ہے۔ اس پر بہرحال نظرثانی کرنا ہوگی اور تحریک آزادی کی طرح تحریک خودمختاری کی قیادت کے لیے بھی دینی حلقوں اور علماء ہی کو آگے بڑھنا ہوگا۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ دینی قوتیں

نوآبادی نظام کے خاتمہ کے لیے منظّم تحریک چلائیں اوراس کے ساتھ ساتھ اپنی نئی نسل کو مذہبی و عصری تعلیم وتربیت سے بہرہ ورکر کے ملکی نظام کا حصہ بنائیں۔ ورنہ موجودہ رولنگ کلاس سے نوآبادیاتی نظام میں کسی تبدیلی اورقومی خودمختاری کی طرف عملی پیشرفت کی توقع کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

(روزنامہ اسلام، لاہور......۴ فروری ۲۰۱۷ء)

فلسطین اور کشمیر کے تنازعات پر ہمارا موقف

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے اس سوال پر گفتگو کرنی ہے کہ آج کل اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی جو بات ہو رہی ہے اس کے بارے میں پاکستان کا اصولی موقف کیا ہے؟ کیا موقف ہونا چاہیے؟ اور معروضی حالات میں پاکستان کا مفاد کیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے مسئلہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے اسرائیل کے قیام کے پس منظر پر کچھ گفتگو کرنا ہوگی، اس کے بعد موجودہ معروضی صورتحال صحیح طور پر سامنے آئے گی اور پھر میں اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔

آج سے ایک صدی پہلے اسرائیل کا کوئی وجود نہیں تھا اور فلسطین کا سارا علاقہ خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ بیت المقدس اور یہ پورا خطہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا اور حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراحؓ اس علاقہ کے فاتح ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے خود تشریف لا کر بیت المقدس کا چارج مسیحی قیادت سے لیا تھا۔ طیطس رومی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے تقریباً پون صدی بعد بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کو نکال دیا تھا، ان کا معبد ختم کر کے ان کے داخلہ پر پابندی لگا دی تھی، وہ پابندیاں حضرت عمرؓ نے اس حد تک ختم کر دیں کہ یہودیوں کو اپنی عبادت گاہ میں آ کر عبادت کرنے کی اجازت حاصل ہوگئی اور یہ اجازت خلافت عثمانیہ کے خاتمہ تک انہیں حاصل رہی ہے۔ اب سے ایک صدی قبل تک فلسطین میں یہودیوں کی آبادی بہت کم تھی، ایک سے دو فیصد بتائی جاتی ہے، یا شاید کچھ زیادہ ہوگی، یہودیوں کو یہ اجازت حاصل رہی ہے کہ وہ آئیں اور دیوار گریہ کے ساتھ جو کہ ان کی عبادت گاہ ہے وہاں عبادت کریں، البتہ فلسطین

میں خلافت عثمانیہ کے دور میں، جو کہ چار صدیوں کے عرصہ تک محیط ہے، یہودیوں کو وہاں زمین خریدنے اور کاروبار وغیرہ کرنے کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ یہ خدشہ تھا کہ یہودی دو ہزار سال قبل کی پوزیشن پر جا کر فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان تحفظات کی بنیاد پر کہ فلسطینی جو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے وہاں آباد ہیں ان کی آبادی متاثر ہوگی اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا کنٹرول کمزور ہوگا اس لیے یہودیوں کو وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی، البتہ عبادت کے لیے آنے جانے کی سہولت انہیں حاصل رہی۔

اب سے تقریباً سوا صدی پہلے یہودیوں نے عالمی سطح پر ایک تنظیم بنائی اور اس کے تحت یہ پروگرام بنایا کہ ہم نے فلسطین میں دوبارہ آباد ہو کر اور دنیا بھر سے یہودیوں کو وہاں اکٹھا کر کے اپنا سابقہ دور واپس لانا ہے اور اسرائیل کے نام سے ریاست قائم کرنی ہے۔ ''اسرائیل'' حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک بڑی ریاست تھی جسے بحال کرنے کے لیے یہودیوں نے تگ و دو شروع کر دی۔ یہ خلافت عثمانیہ کا دور تھا جس کے تاجدار اس وقت خلیفہ عبد الحمید ثانیؒ تھے، ان سے یہودیوں کے رابطے شروع ہوئے کہ ہمیں فلسطین میں جگہ خرید کر آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ خلیفہ عبد الحمید ثانیؒ نے یہودیوں کے اس مطالبے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ مجھے معلوم تھا کہ ان کا پروگرام کیا ہے اس لیے میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ خلیفہ سے عالمی یہودی لیڈر ہرتزل کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں لیکن خلیفہ کا انکار برقرار رہا۔ اس کے بعد خلافت عثمانیہ خود مسائل کا شکار ہوگئی اور خلیفہ عبد الحمید ثانیؒ کو معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ لیکن یہودیوں کا یہ مشن تھا کہ ہمیں فلسطین میں جگہ خرید کر آباد ہونے کا موقع دیا جائے اور دنیا بھر سے یہودی یہاں جمع ہوں تاکہ ہم اسرائیل کی ریاست بحال کریں، جسے خلافت عثمانیہ نے قبول نہیں کیا۔ یہ جنگ عظیم اول کا زمانہ تھا، یہودیوں نے اس مقصد کے لیے برطانیہ سے رابطہ قائم کیا، اور عیسائی جو کہ یہودیوں کے روایتی حریف تھے کہ عیسائی یہودی دشمنی تو دنیا کی معروف دشمنی ہے، لیکن بہرحال ان کا برطانیہ کے ساتھ معاہدہ ہوا اور برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ۱۹۱۶ء میں ''بالفور ڈیکلیریشن'' کے نام سے یہ اعلان کیا کہ سلطنت عظمیٰ برطانیہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتی ہے، اور ان کا یہ حق تسلیم کرتی ہے کہ وہ دوبارہ یہاں آ کر آباد ہوں

اور اپنی ریاست اور وطن بنائیں، اور یہ کہ سلطنت عظمیٰ برطانیہ یہ وعدہ کرتی ہے کہ جب بھی اسے موقع ملا وہ فلسطین میں یہودیوں کو آباد ہونے کا موقع فراہم کرے گی۔

اس دوران جنگ عظیم اول کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ ختم ہوگئی، یہ علاقے مختلف ملکوں کے پاس چلے گئے، کچھ فرانس کے پاس، کچھ برطانیہ کے پاس، اس تقسیم میں جو جنگ عظیم اول کے بعد فاتح اتحادی ممالک کے درمیان ہوئی، اس میں فلسطین کا علاقہ برطانیہ نے سنبھال لیا اور اپنا وائسرائے یا گورنر جنرل وہاں مقرر کر کے یہ اعلان کر دیا کہ یہودی دنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں وہ یہاں آکر آباد ہو سکتے ہیں۔ یہ ۱۹۱۷ء کے زمانے کی بات ہے کہ یہودیوں نے یہاں آکر آباد ہونا شروع کیا جس کے خلاف فلسطینیوں نے مزاحمت کی اور مختلف مراحل میں تصادم وغیرہ ہوئے، لیکن بہرحال برطانیہ کے انتداب کے دور میں جب انہوں نے فلسطین کو اپنی نوآبادی کے طور پر سنبھال رکھا تھا، اعلان بالفور کے مطابق یہودیوں کو مواقع اور وسائل مہیا کیے اور یہودی یہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔ اور پھر جب یہودی اس حد تک یہاں آباد ہوگئے کہ ایک علاقہ ان کے لیے ایک ریاست کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا تھا تو ۱۹۴۵ء میں وہ اقوام متحدہ میں فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کا کیس لے کر گئے جسے منظور کر لیا گیا، اور پھر برطانیہ اس علاقہ سے چلا گیا اور اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

اقوام متحدہ کے فیصلے کے مطابق فلسطین کو تقسیم کر کے ایک حصے کو اسرائیلی ریاست قرار دے دیا گیا اور دوسرا حصہ فلسطینیوں کے حصے میں رہا جو کہ ابھی تک نیم ریاست اور نیم نوآبادی اور اس نوعیت کا علاقہ چلا آ رہا ہے۔ اس وقت اقوام متحدہ نے فلسطین کی تقسیم قبول کر کے اسرائیلی ریاست کے قیام کی جو منظوری دی، مسلمان ممالک نے مجموعی طور پر اسے قبول نہیں کیا، نہ عرب ممالک نے اور نہ دیگر مسلمان ممالک نے، مسلمانوں نے اسے فلسطینیوں پر ظلم اور بیت المقدس کے خلاف سازش قرار دیا۔ یہ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے کا زمانہ تھا اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کا یہ واضح بیان بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ اسرائیل ایک ناجائز ریاست ہے اور یہ مسلمانوں کے دل میں خنجر گھونپنے والی بات ہے جسے ہم تسلیم نہیں کریں گے، البتہ بڑی طاقتیں امریکہ، یورپ اور روس وغیرہ اسرائیل کو سپورٹ کرتے رہے۔

اگلا مرحلہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۷ء میں ایک اور جنگ ہوئی جس میں اسرائیل کو مغربی طاقتوں کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور اس نے مصر، اردن اور شام کو شکست دے کر (۱) مصر کے صحرائے سینا (۲) شام کی گولان پہاڑیوں (۳) اور بیت المقدس کے علاقہ پر قبضہ کر لیا جو کہ اس وقت اردن کے پاس تھا۔ یوں اسرائیل نے اپنی سرحدوں میں توسیع کر لی، یہ میری ہوش کا زمانہ تھا اور یہ مناظر میری آنکھوں کے سامنے ہیں، میں بھی اس وقت مظاہروں اور احتجاجی کیمپین میں شریک ہوتا تھا۔ خیر یہ معاملات چلتے رہے، چند سال بعد مصر کی ایک بار پھر اسرائیل سے جنگ ہوئی اور مصر نے صحرائے سینا واپس حاصل کیا، جبکہ گولان پہاڑیاں، یروشلم اور بیت المقدس ابھی تک اسرائیل کے قبضہ میں ہیں۔ اقوام متحدہ نے ۱۹۶۷ء کے بعد کی اسرائیل کی حدود کو تسلیم نہیں کیا اور اس کی ابھی تک مسلسل یہ قراردادیں چلی آ رہی ہیں کہ اسرائیل کو ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس چلے جانا چاہیے، عملاً عالمی سطح پر خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن یونائیٹڈ نیشنز کا سرکاری موقف یہ ہے کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ انہیں خالی کر دے۔

اس کے بعد صورتحال آگے بڑھی، سرد جنگ میں ایک طرف امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک تھے اور دوسری طرف سوویت یونین اور اس کے اتحادی ممالک تھے۔ کچھ عرب ممالک کو امریکہ اور کچھ کو سوویت یونین سپورٹ کر رہا تھا، جبکہ اسرائیل کو تقریباً سبھی سپورٹ کر رہے تھے، اس ساری کشمکش میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ عربوں سے یہ کہا گیا کہ اگر آپ اسرائیل کی ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن تسلیم کر لیں تو ہم اسرائیل کو واپس جانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں گولان کی پہاڑیاں شام کو واپس ہوں گی اور یروشلم اور بیت المقدس کا علاقہ آزاد ہوگا۔ چنانچہ اس فارمولا کی بنیاد پر کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ ہوا جس میں عربوں سے وعدہ کیا گیا تو اس کے نتیجے میں مصر، شام اور چند دیگر عرب ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ البتہ سعودی عرب، پاکستان، ایران اور دیگر مسلم ممالک اپنے سابقہ موقف پر قائم رہے کہ ہم سرے سے اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ اس وقت مسئلہ فلسطین کے حوالے سے تین موقف عالمی فورم پر سامنے ہیں:

(۱) ایک موقف یہ ہے کہ اسرائیل وجود میں آ گیا ہے اور یہ ایک معروضی حقیقت ہے اس لیے اسے تسلیم کر کے اس کے ساتھ معاملات کرنے چاہئیں، ہمارے بعض دانشور بھی یہ بات

بار بار کر رہے ہیں۔

(۲) دوسرا موقف ان عرب ممالک کا ہے جنہوں نے اسرائیل کو اس شرط پر تسلیم کیا تھا کہ وہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس چلا جائے گا اور جن علاقوں پر اس نے قبضہ کیا تھا انہیں چھوڑ دے گا۔ یہ نہ صرف چند عرب ممالک کا موقف ہے بلکہ اقوام متحدہ کا سرکاری موقف بھی یہی ہے۔

(۳) تیسرا موقف حماس، سعودی عرب، پاکستان اور ایران وغیرہ کا ابھی تک یہی چلا آ رہا ہے کہ ہم اسرائیل کو ایک جائز ریاست کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ان تین موقفوں کی بنیاد پر مسئلہ فلسطین اور اسرائیلی ریاست کے حوالے سے کشمکش جاری ہے اور اس پس منظر اور تناظر میں پاکستان سے یہ تقاضہ کیا جا رہا ہے، پاکستان کے اندر سے بھی یہ آوازیں آ رہی ہیں اور باہر سے بھی یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے، کہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کرے۔ اس حوالہ سے ایک بڑی مہم چلائی جا رہی ہے جس میں ممکن ہے مزید اضافہ ہو کیونکہ بہت لابنگ اور پراپیگنڈا ہو رہا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ بات واضح نہیں ہے کہ ہمارے جو دانشور اس مہم کا حصہ ہیں وہ اسرائیل کو کس تناظر میں تسلیم کرنے کی بات کر رہے ہیں؟ کیا یہ کیمپ ڈیوڈ کے تناظر میں اسرائیل کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں جس کے تحت عرب ممالک نے اسرائیل کو ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جانے کی شرط کے ساتھ تسلیم کیا تھا؟ یا اسرائیل کو اس کے بیت المقدس اور دیگر علاقوں پر قبضہ سمیت تسلیم کرنا چاہتے ہیں؟ لیکن اس صورتحال کو سامنے رکھ کر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ پاکستان کا مفاد کیا ہے اور پاکستان کی اپنی ضرورت کیا ہے؟

(۱) سب سے پہلے تو قائداعظم مرحوم کی بات دہراؤں گا۔ ہم اگر اس وطن کو قائداعظم کا پاکستان کہتے ہیں، قائداعظم مرحوم کو پاکستان کا بانی تسلیم کرتے ہیں اور پاکستان کی پالیسیوں کا سرچشمہ قائداعظم کے اعلانات کو مانتے ہیں، تو پھر جس طرح ہمیں ان کی یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ (۱) کشمیر پاکستان کی شہہ رگ ہے (۲) اسی طرح ہمیں قائداعظم کی یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اسرائیل ایک ناجائز ریاست ہے جو کہ مسلمانوں

کے دل میں خنجر گھونپنے والی بات ہے جسے ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔

(۲) اس کے علاوہ معروضی صورتحال بھی دیکھ لیں، مجھے اس پر تعجب ہوتا ہے کہ مسلم امہ سے تو مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اسرائیل کی ریاست کو تسلیم کرے، لیکن اسرائیل پر کسی طرف سے کوئی دباؤ ڈالنے والا نہیں ہے کہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جاؤ۔ میں اگرچہ خود یہ موقف نہیں رکھتا لیکن بالفرض اگر یہ موقف تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ دباؤ تو دوطرفہ ہونا چاہیے۔ اگر مسلم ممالک پر دباؤ ہے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کریں تو اسرائیل سے یہ کیوں نہیں کہا جا رہا کہ وہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جائے؟ اسرائیل کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ۱۹۶۷ء کی پوزیشن پر واپس لے جائے بغیر مسلم ممالک پر یہ دباؤ ڈالنا کہ وہ اسرائیلی ریاست کو تسلیم کریں، یہ یکطرفہ بات ہے، ناانصافی کی بات ہے، ظلم کی بات ہے، دھاندلی کی بات ہے۔

(۳) بلکہ میں اس سے ایک قدم آگے کی بات کروں گا کہ اسرائیل کی ایک حیثیت ۱۹۶۷ء سے پہلے والی ہے جسے اقوام متحدہ تسلیم کرتی ہے۔ اسرائیل کی ایک حیثیت ۱۹۶۷ء کے بعد مختلف علاقوں کے قبضہ کے ساتھ ہے۔ لیکن اس سے اگلا دائرہ گریٹر اسرائیل کا بھی ہے کہ وہ اس سے اگلے مرحلہ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ گریٹر اسرائیل کا نقشہ انٹرنیٹ پر موجود ہے جس میں مصر ہے، شام ہے، آدھا سعودی عرب ہے، عراق ہے اور سوڈان وغیرہ ہے۔ یعنی صورتحال یہ ہے کہ اسرائیل نہ صرف یہ کہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جانے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کا اس سے آگے گریٹر اسرائیل کا ایجنڈا بھی ہے۔ اسے کوئی کچھ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن مسلم ممالک سے کہا جا رہا ہے کہ اسرائیل جیسا کیسا ہے اسے تسلیم کر لیں۔ یہ غیر منطقی بات ہے، غیر اصولی بات ہے، ناانصافی کی بات ہے، یکطرفہ بات ہے، زیادتی کی بات ہے، اور مطالبہ کرنے والوں کو خود اندازہ نہیں ہے کہ وہ کس بات کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ اگر اسرائیل ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس چلا جائے تو اقوام متحدہ کے دائرہ میں کسی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن وہ تو اقوام متحدہ کی قراردادوں کو تسلیم ہی نہیں کرتا، وہ بین الاقوامی موقف نہیں مان رہا، وہ گریٹر

اسرائیل کا ایجنڈا ابھی رکھتا ہے جس میں مختلف عرب ممالک پر قبضے کا پروگرام شامل ہے، لیکن ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اسرائیل جیسا کیسا ہے اسے قبول کر لیا جائے۔

اس مسئلہ کے ایک اور پہلو پر بھی کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ یہ بات دیکھیے کہ کشمیر پر ہمارا موقف کیا ہے؟ ہم کشمیر پر انڈیا کے قبضے کو ناجائز کہتے ہیں اور کشمیر کو متنازعہ علاقہ مانتے ہیں، جبکہ اقوام متحدہ کی قراردادیں اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں موجود ہیں کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور استصواب رائے کشمیری عوام کا حق ہے، یعنی وہ اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ کس ملک کے ساتھ ان کا الحاق ہو۔ اگر ہم کشمیر کے معاملہ میں اس بات پر قائم ہیں کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی رائے عامہ کے مطابق کشمیری عوام کو اعتماد میں لیے بغیر ہم کشمیر کے متعلق کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتے، تو پھر فلسطین کے معاملہ میں ہم اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی رائے عامہ کو نظر انداز کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ اور وہاں فلسطینیوں کو اعتماد میں لیے بغیر اسرائیل کے قبضہ کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرنے کی بات کیسے کر رہے ہیں؟ اگر ہم اسرائیل کو موجودہ حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں کشمیر سے دستبرداری بھی اختیار کرنا ہوگی، یہ نہیں ہو سکتا کہ کشمیر پر ہمارا موقف مختلف ہو اور فلسطین پر ہمارا موقف کچھ اور ہو۔

میں نے تین باتیں عرض کی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اسرائیل کو تسلیم کرنا قائداعظم مرحوم کے اعلان کے خلاف بات ہوگی۔ دوسری یہ کہ اسرائیل کو کم از کم ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر بھیجے بغیر اسرائیل کو تسلیم کرنا ظلم کی بات ہوگی۔ اور تیسری بات میں نے یہ عرض کی ہے کہ کشمیر اور فلسطین دونوں بڑے مسئلے ہیں، دونوں کی پوزیشن تقریباً ایک جیسی ہے کیونکہ کشمیر کے معاملہ میں انڈیا اقوام متحدہ کی قراردادوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، جبکہ فلسطین کے معاملہ میں اسرائیل اقوام متحدہ کی قراردادوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ہم اگر ایک مسئلہ پر لچک اختیار کریں گے تو دوسرے مسئلہ پر ہمارے لیے کھڑے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان سے یہ بات کہنے والے، کہ وہ اسرائیل کو موجودہ حیثیت میں تسلیم کر لے، ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں اور یہ بالواسطہ کشمیر پر انڈیا کے قبضے کو تسلیم کروانے کی بات ہوگی۔ اس لیے ہمیں اس سازش کو سمجھنا چاہیے کہ اس سے مسئلہ فلسطین تو متاثر ہوگا ہی، اس کے ساتھ مسئلہ کشمیر بھی

متاثر ہوگا، اس لیے ہمیں بڑی سوچ سمجھ اور دیانتداری کے ساتھ زمینی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے فلسطینیوں اور کشمیریوں کے جائز حقوق اور امت مسلمہ کے مفاد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور محض لابنگ اور پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور ......۱۱ جنوری ۲۰۱۹ء)

کشمیر اور فلسطین:
اقوامِ متحدہ اور عالمی لیڈروں کی خدمت میں

مسئلہ کشمیر کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے وقت تقسیم کے فارمولا میں ریاستوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ دونوں ملکوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ اس موقع پر جموں وکشمیر کے ہندو راجہ نے ریاست کی غالب مسلم اکثریت کے جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا جسے کشمیری عوام نے مسترد کرتے ہوئے مزاحمت کی جدوجہد شروع کر دی اور جہاد کے ذریعے مظفر آباد، باغ اور دیگر علاقوں کو آزاد کراتے ہوئے جب وہ سری نگر تک پہنچ گئے تو ان سے یہ کہہ کر جنگ بندی کرائی گئی کہ ریاست کا فیصلہ عوام کی مرضی کے مطابق کرایا جائے گا۔ چنانچہ اقوام متحدہ درمیان میں آئی اور بین الاقوامی سطح پر طے پایا کہ جموں وکشمیر اور دیگر متعلقہ علاقوں میں آزادانہ استصواب کے ذریعے کشمیری عوام کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنی آزاد مرضی کے ساتھ پاکستان یا بھارت میں سے جس کے ساتھ شامل ہونا چاہیں خود اس کا فیصلہ کریں۔

کشمیریوں کے ساتھ اقوامِ متحدہ کا وعدہ

کشمیری عوام کے ساتھ عالمی برادری اور اقوام متحدہ نے یہ وعدہ کیا تھا جس کے لیے اقوام متحدہ کا دفتر آج بھی اسلام آباد میں موجود ہے مگر بھارت اس وعدہ کو پورا کرنے سے انکاری ہے۔ جبکہ عالمی برادری اور اقوام متحدہ اس سلسلہ میں زبانی جمع خرچ کے سوا کوئی پیشرفت نہیں کر رہی جس سے تنگ آ کر کشمیری عوام کی ایک بڑی تعداد ہتھیار بکف ہے اور مسلسل قربانیاں دے رہی ہے جسے

دبانے کے لیے بھارت مقبوضہ کشمیر میں ریاستی جبر کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ کشمیری عوام کے ساتھ یہ ناانصافی اور سراسر ظلم و جبر ہے جس میں پاکستان کی حکومت اور عوام کشمیری بھائیوں کے ساتھ ہیں اور ان کے موقف اور جدوجہد کی حمایت کر رہے ہیں۔ بعض حلقوں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ کشمیری عوام کو اقوام متحدہ کے فیصلوں کے مطابق آزادانہ استصواب رائے کے ذریعے اپنا فیصلہ خود کرنے کا حق دینے سے خطہ میں مذہب کی بنیاد پر تفریق میں اضافہ ہوگا اور میں آج اس پہلو سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

فلسطینیوں کے ساتھ اقوامِ متحدہ کا وعدہ

۱۹۴۵ء میں خود اقوام متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کر کے اسرائیل اور فلسطین کے نام سے دو الگ الگ ریاستیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے اس فیصلہ پر بھی اقوام متحدہ ابھی تک اس لحاظ سے عمل نہیں کرا سکی کہ فلسطین کی مکمل اور خود مختار ریاست کا قیام ہنوز مکمل نہیں ہو سکا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ تقسیم مذہب کی بنیاد پر نہیں تھی؟ ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف یہودی ہیں جنہیں دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ اقوام متحدہ نے کیا ہے اور اگرچہ فلسطینیوں نے، بعض عرب ممالک نے اور پاکستان نے بھی فلسطین کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا جن پر عالمی حلقوں کی طرف سے مسلسل زور دیا جا رہا ہے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کر کے اس تقسیم کو قبول کر لیں۔

مشرقی تیمور اور سوڈان کی تقسیم

اسی طرح اقوام متحدہ نے انڈونیشیا کے جزیرہ مشرقی تیمور میں ریفرنڈم کرا کے اسے دو ریاستوں میں تقسیم کیا اور اس کے ایک علاقہ میں مسیحی اکثریت کی بنیاد پر نئی مسیحی ریاست قائم کی، اس کی بنیاد بھی مذہب پر ہے اور یہ سارا کام اقوام متحدہ کے سائے میں مکمل کیا گیا ہے۔ پھر سوڈان کی تقسیم کا باعث بھی مذہب بنا ہے، وہاں اقوام متحدہ نے خود ریفرنڈم کرا کے جنوبی سوڈان کو مسیحی اکثریت کی بنیاد پر ایک نئی مسیحی ریاست کی شکل دی ہے۔

میں اقوام متحدہ اور عالمی لیڈروں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر اسرائیل، مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کی نئی ریاستیں اکثریت کے حوالہ سے وجود میں آ سکتی ہیں اور خود اقوام متحدہ اس کا اہتمام کر

رہا ہے تو کشمیر کے مظلوم عوام کا کیا قصور ہے کہ انہیں عالمی برادری اور اقوام متحدہ کے واضح فیصلوں کے باوجود اپنا فیصلہ خود کرنے کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے اور آزادانہ استصواب رائے سے مسلسل انکار کیا جا رہا ہے؟ اگر ریفرنڈم مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کے عوام کا حق ہے تو کشمیری عوام کا بھی یہ اسی طرح طے شدہ حق ہے جس میں ٹال مٹول کر کے خود اقوام متحدہ کشمیریوں پر ظلم کر رہی ہے اور اس ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

دوسری بات میں حکومت پاکستان سے کرنا چاہوں گا کہ ہم پورے ملک میں کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کا دن منا رہے ہیں اور سرکاری و غیر سرکاری سطح پر بھرپور آواز بلند کی جا رہی ہے جو خوش آئند ہے مگر اتنی بات کافی نہیں ہے۔ ہم مسئلہ کشمیر میں صرف کشمیری عوام کے حمایتی نہیں بلکہ ان کے وکیل ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر مدعی بھی ہیں کہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے کشمیر کو پاکستان کی شہہ رگ قرار دیا تھا اور یہ بات دریاؤں کے پانی کے حوالہ سے دن بدن بڑھتے چلے جانے والے تنازعات کی فضا میں عملاً بھی نظر آ رہی ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہہ رگ ہے اور اس کے بغیر پاکستان نہ صرف یہ کہ مکمل نہیں ہوگا بلکہ اس کی معیشت و زراعت بھی غیر محفوظ رہے گی۔ اس لیے کشمیر پاکستان کی نظریاتی اور تہذیبی ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر بھی ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ مگر مسئلہ کشمیر کے مدعی اور وکیل ہونے کی حیثیت سے عالمی سطح پر ہمارا وہ قومی کردار دکھائی نہیں دے رہا جو اس مسئلہ میں مؤثر پیشرفت کے لیے ضروری ہے۔

اس صورتحال کا ازسرنو جائزہ لینا چاہیے اور پاکستان کی قومی پالیسی کی ترجیحات اور سفارتی جدوجہد کو اس کے ضروریات کے مطابق پھر سے مرتب کرنا چاہیے۔ یہ مسئلہ نہ حکومتی پارٹی کا ہے اور نہ ہی اپوزیشن کا، یہ قومی مسئلہ ہے، وطن عزیز کا مسئلہ ہے اور پوری قوم کا مسئلہ ہے، اسے اسی دائرہ اور اسی سطح پر آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

(بزمِ اہلِ سنت پتوکی کے زیر اہتمام میونسپل گراؤنڈ میں خطاب...... ۵ فروری ۲۰۱۹ء)

آزاد کشمیر کے علماء اور وکلاء کی خدمت میں

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ پہلی بات تو یاددہانی کے لیے ہے کہ آپ حضرات کشمیر کی آزادی اور کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے لیے مسلسل مصروف عمل ہیں جس میں مجاہدین کے جہاد آزادی سے لے کر بین الاقوامی ماحول کی سفارتی محنت تک مختلف دائروں میں جدوجہد جاری ہے۔ یہ سعی و کاوش سات عشروں سے تجاوز کر چکی ہے اور ابھی تک نتیجہ خیز ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ کشمیر اور فلسطین کے دو حساس مسئلوں نے پورے عالم اسلام کو مضطرب اور بے چین کر رکھا ہے مگر جن قوتوں کے ہاتھ میں ان مسائل کا حل ہے وہ اس کے احساس وادراک سے محروم ہیں، یا ان دونوں مسئلوں کو اپنے مفادات کے لیے اسی طرح موجود و قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ جہاد آزادی میں مصروف مجاہدین اور مختلف شعبوں میں محنت کرنے والے طبقات کی حمایت وتعاون کے ساتھ ساتھ ہمیں موجودہ صورتحال کے اسباب وعوامل کی نشاندہی اور ان کے حل میں رکاوٹوں کو بھی اجاگر کرتے رہنا چاہیے اور عالمی رائے عامہ کو ان مسائل کے حل کے لیے مؤثر کردار کے لیے تیار کرنے پر محنت کرنی چاہیے۔ آج کی اس نشست میں چونکہ معزز وکلاء کے ساتھ محترم علماء کرام بھی موجود ہیں اس لیے میں بطور خاص یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ دونوں کو مل جل کر مشترکہ طور پر اس جدوجہد کو مؤثر بنانے کے راستے نکالنے چاہئیں۔

دوسری گزارش وکلاء اور علماء کے اس مشترکہ اجتماع میں یہ کرنا چاہوں گا کہ آزاد ریاست جموں وکشمیر میں عدالتی سطح پر اسلامی شریعت اور عصری قوانین کے امتزاج اور جج صاحبان اور قاضی حضرات میں اشتراک عمل کا جو تجربہ کیا گیا ہے وہ نفاذ اسلام کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسے مزید مؤثر اور کامیاب بنانے کی محنت کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا کو اس سے متعارف کرانے کا کام

بھی ہونا چاہیے۔ نفاذ شریعت کی جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر میرا یہ احساس ہے کہ موجودہ حالات میں آزاد کشمیر کے اس عدالتی تجربہ کو مختلف ممالک بالخصوص پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے راہنما بنایا جا سکتا ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کو اس سے متعارف کرایا جائے اور اسے مزید مستحکم اور موثر بنانے کی محنت کی جائے جو میرے خیال میں علماء کرام اور وکلاء کو مل کر کرنی چاہیے۔ میں ڈسٹرکٹ بار باغ سے اس طرف خصوصی توجہ کی گزارش کرتا ہوں۔

جبکہ میری تیسری گزارش یہ ہے کہ اس وقت مختلف بین الاقوامی معاہدات نے جس طرح پوری انسانی سوسائٹی اور دنیا بھر کے ممالک و اقوام کو حصار میں لے رکھا ہے ان سے آگاہی حاصل کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ مثلاً یورپی یونین پاکستان سے مسلسل کہہ رہی ہے کہ اسے یورپ کے ساتھ تجارتی مراعات کے دائرے میں شامل ہونے کے لیے ستائیس بین الاقوامی معاہدات پر مکمل عملدرآمد کی ضمانت دینا ہوگی اور اس ضمن میں توہین رسالت پر سزائے موت، قصاص کے قوانین، ختم نبوت کے تحفظ کے قوانین اور سزائے موت کو مکمل طور پر ختم کر دینے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے علماء کرام اور معزز وکلاء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان ستائیس معاہدات کا جائزہ لیں، اس سے عوام اور متعلقہ حلقوں کو واقف کرائیں اور اس سلسلہ میں قوم کی راہنمائی کریں۔

اس موقع پر ایک معزز وکیل نے سوال کیا کہ کیا ان بین الاقوامی معاہدات سے نکل کر ہم بطور ریاست اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں معاہدات سے نکلنے کی بات نہیں کر رہا بلکہ یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں کم از کم ان سے واقف تو ہونا چاہیے اور قوم کی راہنمائی کرنے والے طبقات بالخصوص علماء کرام، وکلاء، سیاسی راہنماؤں، اساتذہ، قوم کے نمائندوں اور میڈیا کے پالیسی سازوں کو پورے ادراک اور آگاہی کے ساتھ ان معاہدات کے ایسے حصوں کی نشاندہی کرنی چاہیے جن پر اسلامی تعلیمات، قومی مفادات اور ملکی وقار کے حوالہ سے ہمیں تحفظات درپیش ہیں۔ پھر ان تحفظات پر متعلقہ بین الاقوامی اداروں سے گفتگو کرنے اور انہیں اپنے مسائل و مشکلات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

میرے خیال میں بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں ملائیشیا کے وزیراعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد نے کچھ عرصہ قبل جو بات کی تھی اور اب ترکی کے وزیراعظم جناب طیب اردگان وہ بات کر رہے

ہیں، اسے منظّم طور پر آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، اور اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ جبکہ علماء کرام اور وکلاء کو اس کا ماحول اور اس سلسلہ میں بیداری اور شعور پیدا کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے۔

ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن باغ کی اس نشست میں بعض محترم وکلاء نے انتہائی اہم سوالات کیے جن کے جواب میں کچھ گزارشات میں نے پیش کیں۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ایک وکیل محترم نے کہا کہ اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی کنفیوژن نہیں ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب خلافت کا نظام قائم ہوا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے نہ تو اقتدار پر طاقت کے بل پر قبضہ کیا تھا اور نہ ہی خاندانی استحقاق اور وراثت کے طور پر حکومت حاصل کی تھی۔ بلکہ انہیں حکومت کا حق امت کی اجتماعی صوابدید کی بنیاد پر ملا تھا، جس سے یہ بات طے ہوگئی کہ اسلام میں حکمرانی کا حق عوام کی اجتماعی صوابدید سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ مطلق العنان حکمران نہیں ہوں گے بلکہ قرآن وسنت کے پابند ہوں گے۔ اس طرح اسلام کے سیاسی نظام کی دو بنیادیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ حکومت کی تشکیل عوام کی اجتماعی صوابدید پر ہوگی، اور دوسری یہ کہ حکومت وریاست قرآن وسنت کے احکام کی پابند ہوں گی۔ میرے خیال میں اس کے بعد اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں کسی کنفیوژن کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ایک وکیل محترم نے پوچھا کہ مسئلہ کشمیر کا آخر کیا حل ہوسکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مسئلہ کشمیر کا ایک ہی حل ہے کہ اقوام عالم اور بین الاقوامی برادری نے کشمیری عوام کا یہ حق تسلیم کر رکھا ہے کہ مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے عوام کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ استصواب رائے کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے اور متعلقہ عالمی طاقتوں اور اداروں کو کشمیری عوام کے ساتھ کیا گیا یہ وعدہ بہرصورت پورا کرنا چاہیے۔

ایک وکیل محترم نے سوال کیا کہ امریکہ جب افغانستان سے نکلنے کی بات کر رہا ہے تو افغان

طالبان اس کے لیے تعاون کیوں نہیں کر رہے؟ میں نے عرض کیا کہ امریکہ وہاں سے نکلنے سے پہلے افغان طالبان سے اس حکومت کو تسلیم کرانا چاہتا ہے جو اس نے کابل میں فوجی مداخلت کے نتیجے میں طاقت کے زور سے قائم کر رکھی ہے۔ افغان طالبان یہ بات نہیں مان رہے اور انہیں یہ بات تسلیم نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ اگر امریکہ اپنی مسلط کردہ حکومت کو تسلیم کرا کے افغانستان سے جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالواسطہ طور پر افغانستان میں موجود رہنا چاہتا ہے جو افغانستان کی قومی خودمختاری کے منافی ہے۔ اس لیے افغان طالبان کا موقف اس حوالہ سے بالکل اصولی اور درست ہے کہ امریکی اتحاد کی فوجیں افغانستان سے غیر مشروط طور پر نکلیں اور افغانستان کے عوام کا یہ حق تسلیم کریں کہ ان کے تمام طبقات باہم مل بیٹھ کر کسی دباؤ اور مداخلت کے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔

محترم وکیل صاحب نے سوال کیا کہ جب کابل کی موجودہ حکومت افغانوں کی ہی ہے تو اسے تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں نے گزارش کی کہ سری نگر کی موجودہ حکومت کشمیریوں کی ہی ہے اور بظاہر عوام کے ووٹوں کے ذریعے آئی ہے، اگر بھارت کی حکومت آپ سے کہے کہ آپ سری نگر کی موجودہ حکومت کو تسلیم کر لیں تو وہ کشمیر سے فوجیں واپس لے جائے گا تو کیا آپ اس پیشکش کو قبول کر لیں گے؟ میرے خیال میں دونوں کا مسئلوں کا یہی ایک حل ہے کہ بیرونی افواج وہاں سے نکلیں اور ان خطوں کے عوام کو مکمل آزادانہ ماحول میں اپنے فیصلے خود کرنے دیں۔ مسلط قوتوں کے نمائندوں کو حکمران تسلیم کر لینے کے بعد ان کے تسلط کا ظاہری خاتمہ کوئی معنی نہیں رکھتا، یہ نوآبادیاتی نظام کی ایک تبدیل شدہ شکل ہے جس کا عالم اسلام کے بیشتر ممالک میں ہمیں مسلسل سامنا ہے، اور یہ صورتحال حریت پسندوں سے آزادی کی ایک نئی جدوجہد کا تقاضہ کر رہی ہے۔

(ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن، باغ، آزاد کشمیر میں خطاب ......۱۳ جون ۲۰۱۹ء)

کشمیراورافغانستان کی تازہ صورتحال

پاکستان کے آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ اورامریکہ کی سنٹرل کمانڈ کے کمانڈر جنرل کینیتھ میکنزی کے درمیان گزشتہ روز جی ایچ کیوراولپنڈی میں ہونے والی ملاقات خطہ کی موجودہ صورتحال بالخصوص کشمیراورافغان مسئلہ کے حوالہ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہےاوراس سے دوررس نتائج کی توقع کی جارہی ہے۔

افغانستان کے حوالہ سے امریکہ اورافغان طالبان کے درمیان ایک عرصہ سے جاری مذاکرات اچانک ڈیڈلاک کا شکارہوگئے ہیں اورعین اس وقت جب کہ مذاکرات کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کی خبروں کے ساتھ ساتھ معاہدہ کے لیےصدرامریکہ کے ساتھ افغان طالبان کے وفدکی ملاقات کی تاریخ کا بھی تعین ہو چکا تھا،صدرٹرمپ نے اچانک مذاکرات روک دینے کا اعلان کردیاہے جس سے معاملات ایک ڈرامائی رخ کی طرف مڑ گئے ہیں۔ بین الاقوامی حلقے مذاکرات کی اچانک منسوخی کے اس عمل کووائٹ ہاؤس، پینٹا گان اورامریکی اسٹیبلشمنٹ کے درمیان معاہدہ کے معاملہ میں انڈراسٹینڈنگ کے فقدان کا نتیجہ قراردے رہے ہیں جبکہ صدرٹرمپ نے یہ کہہ کراس کا سارا ملبہ طالبان پرڈال دیاہے کہ مذاکرات کے آخری مرحلہ میں کابل میں ان کی طرف سے کیا جانے والاحملہ اس کی فوری وجہ بناہے۔حالانکہ اس قسم کے حملے مذاکرات کے دوران امریکی کیمپ کی طرف سے بھی افغان شہریوں اورطالبان کے خلاف مسلسل جاری رہے ہیں،اورابھی چندروزقبل ایسے ہی ایک حملہ میں بہت سے افغان شہری شہادت سے ہمکنارہوئے ہیں۔

افغان طالبان سے اصرارکے ساتھ یہ تقاضہ کیا جارہاہے کہ وہ معاہدہ سے قبل جنگ بندی کا اعلان کریں،مگرامارت اسلامیہ افغانستان کا کہنا ہے کہ معاملات کا حتمی طورپر باضابطہ اعلان ہو

جانے سے قبل وہ سیز فائر کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کی یہ بات دو حوالوں سے قابل توجہ ہے، ایک اس لیے کہ وہ خود امریکی اتحاد یا افغان فورسز سے معاہدہ کے باضابطہ اعلان سے پہلے فائر بندی کا تقاضہ نہیں کر رہے، اور دوسرا اس حوالہ سے کہ افغان عوام اس سے قبل جنیوا معاہدہ کی صورت میں اس چال کا شکار ہو چکے ہیں کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کے معاملات طے کیے بغیر معاہدہ کا اعلان افغانستان کو ایک نئے بحران اور خلفشار میں دھکیلنے کا باعث بن گیا تھا۔ باخبر حضرات جانتے ہیں کہ اس موقع پر جنرل ضیاء الحق شہیدؒ کا موقف یہ تھا کہ معاہدہ سے پہلے اس کے بعد کے معاملات سیٹ کر لیے جائیں تا کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کوئی نیا بحران کھڑا نہ ہو جائے، مگر ان کی بات نہیں سنی گئی اور جنیوا معاہدہ کرنے والوں نے من مانی کر کے افغانستان کو خانہ جنگی کی ایک نئی دلدل سے دوچار کر دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ افغان طالبان کی موجودہ قیادت اس تجربہ کے اعادہ سے بچنا چاہتی ہے اور تمام معاملات طے کرنے کے بعد فائر بندی کا اعلان کرنا چاہتی ہے اور یہ بات ناقابل فہم بھی نہیں ہے۔ اس لیے امریکہ اور پاکستان دونوں کی سیاسی وفوجی قیادتوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ افغان عوام کو ایک اور ''جنیوا معاہدہ'' میں یکطرفہ طور پر جکڑ دینے کی بجائے ان کی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور انہیں پوری طرح اعتماد میں لیے بغیر کسی ایسے معاہدے کا رسک نہ لیں جو خطہ میں ان کی بحالی کی بجائے کسی نئے خلفشار کا عنوان بن جائے۔

دوسری طرف مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہم آزاد کشمیر کے بزرگ عالم دین اور پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی نائب امیر اول مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی کے اس بیان کو انتہائی قابل توجہ سمجھتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کو بھارتی جبر وتشدد کی موجودہ سنگین صورتحال سے نجات دلانے اور انہیں اقوام متحدہ کے فیصلوں کے مطابق خودارادیت کا حق دلوانے کے لیے جہاد کے باقاعدہ اعلان کا آپشن بھی زیر غور لایا جائے، یہ بات جہاد کے شرعی احکام کے حوالہ سے تو ہماری ذمہ داری بنتی ہی ہے مگر اس لیے بھی سنجیدہ توجہ کی طلبگار ہے کہ آزاد جموں وکشمیر کی موجودہ ریاست جہاد ہی کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی اور جہاد کا وہ شرعی فتویٰ جو ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف ۱۹۴۷ء میں سرکردہ علماء کرام کی طرف سے جاری کیا گیا تھا اور جس پر عملدرآمد کے ذریعے آزاد جموں وکشمیر کے

موجودہ خطہ کو آزاد کرایا گیا تھا، اس کا وجود اور تسلسل ابھی جاری ہے اور پیشرفت کا تقاضہ کر رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہے کہ حکومت آزاد کشمیر، ریاست آزاد جموں وکشمیر کے ذمہ دار مفتیان کرام کا اجلاس طلب کر کے مشترکہ موقف اور سفارشات طے کرے اور پھر اس کی بنیاد پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وفاقی وزارت مذہبی امور تمام مکاتب فکر کے سرکردہ مفتیان کرام کا قومی اجلاس منعقد کر کے مشترکہ لائحہ عمل کا تعین کرے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ جہاد کے باضابطہ اعلان کا حق صرف ریاست کو ہے اور پرائیویٹ سیکٹر میں کوئی شخص یا ادارہ اس کا مجاز نہیں ہے، مگر ریاست کا یہ اختیار اور حق اس استحقاق کو کام میں لانے کے لیے ہے، خاموشی اختیار کرنے یا شرعی ضرورت کو نظر انداز کرتے چلے جانے کے لیے نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں حکومت آزاد کشمیر اور پاکستان کی وفاقی وزارت مذہبی امور دونوں کو اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۱۲ستمبر۲۰۱۹ء)

آزاد کشمیر کی حکومت اور علماء کرام سے چند گزارشات

۱۲ اکتوبر ۲۰۱۹ء کو راولاکوٹ آزاد کشمیر میں متحدہ علماء کونسل کے زیر اہتمام ''جہادِ کشمیر اور ہماری ذمہ داریاں'' کے موضوع پر ہل ٹاپ ہوٹل میں منعقدہ سیمینار میں کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا جس کی صدارت مولانا مفتی عبد الخالق نے کی جبکہ مہمانان خصوصی میں پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی نائب امیر مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی اور جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے سابق امیر سردار اعجاز افضل ایڈووکیٹ شامل تھے۔ ان گزارشات کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ گزشتہ کل مجھے منگ آزاد کشمیر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، وہاں حاضری کے لیے مولانا محمد یاسین اور مولانا قاری سعید الرحمان تنویر کا ایک عرصہ سے تقاضہ تھا، ان کے حکم پر کل مرکزی جامع مسجد منگ میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کیا اور آج راولاکوٹ میں متحدہ علماء کونسل کے اس پروگرام میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

خطہ کشمیر کی موجودہ صورتحال آپ کے سامنے ہے، کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ گزشتہ سات عشروں سے کشمیری عوام کو ان کے مسلمہ حق خود ارادیت سے مسلسل محروم رکھا جا رہا ہے اور حالیہ صورتحال یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام دو ماہ سے زیادہ عرصہ سے کرفیو کے ماحول میں ہیں، آزادانہ نقل و حرکت کے حق سے محروم ہیں اور اشیائے خورد و نوش کی قلت کا شکار ہیں، جبکہ ان کی بے بسی اور مظلومیت پر ارباب فہم و شعور کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے مگر عملاً کوئی بھی کچھ کرنے کی پوزیشن میں دکھائی نہیں دے رہا۔ اس پس منظر میں علماء کشمیر اور آزاد حکومت کی خدمت میں چند

گزارشات پیش کرنا چاہ رہا ہوں۔ یہ جنگ ابتدا سے دو محاذوں پر لڑی جا رہی ہے:

☆ پہلا جہاد کا ہے کہ ڈوگرہ راجہ کے خلاف ۱۹۴۷ء میں جہاد کے شرعی فتویٰ کی بنیاد پر جنگ کا آغاز کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں ریاست جموں وکشمیر کا موجودہ خطہ آزاد ہوا اور یہاں آزاد حکومت قائم ہوئی۔ جہاد کا یہ عمل سری نگر کے دروازے تک جا پہنچا تھا اور پونچھ شہر کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا کہ اقوام متحدہ درمیان میں کود پڑی اور اس وعدہ کے ساتھ جنگ بندی کرا دی کہ جموں وکشمیر اور دیگر متعلقہ علاقوں کے عوام کو اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا، اور اقوام متحدہ کے زیر اہتمام آزادانہ استصواب رائے کا اہتمام کر کے اس خطہ کے لوگوں کو یہ فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس وعدہ کو سات دہائیاں گزر چکی ہیں مگر ابھی تک اس کی تکمیل کے لیے کوئی سنجیدگی سامنے نہیں آئی بلکہ عالمی استعماری قوتوں کے سامنے اقوام متحدہ کی بے بسی دیکھتے ہوئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر اقوام متحدہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو اسے دنیا کے سامنے اپنی لاچارگی کا اقرار کرنا چاہیے کیونکہ ایک قوم کو اس سلسلہ میں مسلسل گومگو کی کیفیت میں رکھنا بجائے خود ظلم اور ناانصافی ہے۔

☆ دوسرا سفارت کاری کا ہے کہ بہت سے ممالک کی حکومتیں بھارتی مفادات کے تحفظ کا عندیہ ظاہر کرتی نظر آ رہی ہیں اور اس سلسلہ میں کشمیری عوام کی مظلومیت اور اسلامی دنیا کے عوامی رجحانات کو نظر انداز کرتے ہوئے محض اپنے معاشی وسیاسی مفادات بچانے کو ترجیح دے رہی ہیں۔ سفارتی محاذ پر بھارت کا پلڑا وزنی دکھائی دے رہا ہے اور کشمیر کے مسئلہ پر عالمی برادری کی خاموشی کی بڑی وجہ بھی یہی ہے، اس لیے عالمی اور علاقائی سطح پر سفارت کاری کو ازسرنو منظّم کرنا اور کشمیری عوام کی مظلومیت و بے بسی سے دنیا کو آگاہ کرتے ہوئے بین الاقوامی لابنگ میں زیادہ مؤثر کردار ادا کرنا ہماری ناگزیر ضرورت ہے۔

جہاں تک جہاد کا تعلق ہے میرا علماء کشمیر سے یہ سوال ہے کہ انہوں نے جہاد کے جس شرعی فتوے پر ۱۹۴۷ء میں جنگ لڑی تھی اور یہ آزاد ریاست قائم کی تھی، کیا وہ فتویٰ باقی ہے یا ختم ہو گیا

ہے؟ علماء کرام کو اس سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا ہوگا اور اگر ان کے خیال میں وہ فتویٰ ابھی باقی ہے اور ختم نہیں ہو گیا تو اس پر آج کے حالات میں عملدر آمد کے راستے تلاش کرنا بہرحال علماء کرام کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلہ میں میری تجویز یہ ہے کہ پہلے مرحلہ میں آزاد کشمیر کے سرکردہ مفتیان کرام کو مل بیٹھ کر اس فتویٰ کی موجودہ شرعی حیثیت کا جائزہ لینا چاہیے اور طے کرنا چاہیے کہ جہاد کے شرعی فریضہ کی آج کے دور میں ادائیگی کی کیا صورت ہوگی۔ اس کے بعد علماء کرام کی تجاویز کی روشنی میں آزاد جموں وکشمیر کی ریاستی حکومت ایک وسیع تر قومی کانفرنس کا اہتمام کر کے اجتماعی موقف طے کرے اور حکومت پاکستان سے اس سلسلہ میں بات چیت کی جائے۔ میں ذاتی طور پر جہاد کے ''پرائیویٹ فتویٰ'' کے حق میں نہیں ہوں اور اس بات کا قائل ہوں کہ ریاست کی موجودگی میں جہاد کے اعلان کا حق صرف ریاست کو ہے، مگر یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ صرف حق نہیں بلکہ ذمہ داری بھی ہے، اسے صرف ریاست کا حق کہہ کر ٹالتے رہنا درست نہیں بلکہ حق اور ذمہ داری کے دونوں پہلو سامنے رکھ کر حکومت آزاد کشمیر اور حکومت پاکستان کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

جہاں تک شرعی ضرورت کا تعلق ہے وہ تو واضح ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں آغاز سے ہی خوف و ہراس کا ماحول موجود ہے، اور کچھ عرصہ کے وقفہ سے آزادی کی جدوجہد کو بار بار کچلنے کے لیے ظلم و جبر اور دہشت کی جو فضا قائم کر دی جاتی ہے وہ جہاد کا تقاضہ کر رہی ہے اور ہمیں اپنی ذمہ داریوں کی طرف مسلسل توجہ دلا رہی ہے۔ اس لیے میں آج کے اس اجتماع کی وساطت سے (۱) علماء آزاد کشمیر (۲) حکومت آزاد کشمیر (۳) اور حکومت پاکستان، تینوں سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی کا مظاہرہ کریں اور تمام ریاستی ادارے باہمی مشاورت و مفاہمت کے ساتھ اس کا کوئی عملی طریق کار طے کریں، یہ ایک پڑوسی مسلم ملک ہونے کی وجہ سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو ظلم و جبر کے ماحول سے نکالیں۔

جہاد کے حوالہ سے بھی اور عالمی رائے عامہ اور اداروں کو متحرک کرنے کے حوالہ سے بھی میری پاکستان اور آزاد کشمیر کے متعلقہ حلقوں، طبقات، اداروں اور جماعتوں سے گزارش ہے کہ وہ خدا کے لیے سنجیدہ ہو جائیں، کشمیری عوام کے مستقبل اور موجودہ صورتحال کو امریکی صدر ٹرمپ اور اقوام

متحدہ کی موجودہ پالیسیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا سراسر زیادتی کی بات ہے، اس لیے کہ وہ اس وقت تک کچھ نہیں کریں گے جب تک ہم متحرک و بیدار نہیں ہوں گے۔ متعلقہ عالمی اداروں کو ان کی ذمہ داریاں پورا کرنے کے لیے آمادہ کرنے کا ماحول ہم نے بنانا ہے اور یہ محنت طلب کام ہے جو محض تقریروں اور بیانات سے نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے مسلسل سفارتی محنت کرنا ہوگی۔

میں ایک بار پھر متحدہ علماء کونسل راولاکوٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان معروضات پر توجہ دینے کی گزارش کر رہا ہوں، خدا کرے کہ ہم تاریخ کے اس نازک مرحلہ میں کشمیری بھائیوں کے لیے صحیح رخ پر محنت اور جدوجہد کا اہتمام کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

آزاد کشمیر کی دینی وسیاسی قیادتوں سے درخواست

۱۶ نومبر ہفتہ کو میرپور آزاد کشمیر جانے کا اتفاق ہوا، ہمارے عزیز شاگرد مولانا حافظ نوید ساجد فاضل جامعہ نصرۃ العلوم کے فرزند ابوعبیدہ نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے، اس کا آخری سبق سننے کی تقریب کا جامع مسجد تقوٰی میں اہتمام تھا جس میں اہل خاندان کے ساتھ علماء کرام کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ بچے کا آخری سبق سن کر اس کی دستار بندی کی گئی اور میں نے اس موقع پر کچھ گزارشات پیش کیں جن کا زیادہ حصہ حفظ قرآن کریم کی اہمیت اور فضائل قرآن کریم کے حوالہ سے تھا، مگر اس اجتماع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے تحریک آزادیٔ کشمیر کی تازہ ترین صورتحال پر بھی کچھ عرض کیا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں آج آزاد کشمیر کے ایک بڑے شہر میں آپ حضرات کے سامنے اپنے دل کے درد کا ایک بار پھر اظہار کر رہا ہوں۔ اب سے ایک ماہ قبل منگ اور راولاکوٹ کے اجتماعات میں یہ گزارشات پیش کر چکا ہوں مگر صورتحال جوں کی توں ہے اس لیے دوبارہ عرض کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہوں کہ مقبوضہ کشمیر میں کرفیو کی صورتحال پر ایک سو سے زیادہ دن گزر چکے ہیں، لاکھوں لوگ آزاد نقل وحرکت کی سہولتوں سے محروم ہیں، ان کے شہری اور سیاسی حقوق معطل ہیں، جبر وتشدد کی فضا ہے، آزادیٔ رائے پر مسلسل پہرے ہیں اور خورد ونوش کے اسباب و وسائل بھی ضرورت کے مطابق میسر نہیں، مگر یہاں ہم سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے پاکستان اور آزاد کشمیر کی صورتحال میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، دونوں طرف کی دینی وسیاسی قیادتیں معاملات کو ایک

دوسرے پر ڈالنے اور ٹالنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہیں اور مقبوضہ کشمیر کے محصور شہریوں کو بتدریج مایوسی کی دلدل کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ ہم ابھی تک ریاست آزاد جموں وکشمیر یا پاکستان کی قومی سطح پر کہیں بھی باہم مل بیٹھ کر اس مسئلہ کا کوئی حل تلاش کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور کشمیری عوام پر نریندر مودی حکومت کے جبر کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ ظلم بھی کچھ کم سنگین نہیں ہے۔

میں اپنا یہ سوال ایک بار پھر آزاد کشمیر کے علماء کرام اور مفتیان کرام کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں اس خطہ کے سرکردہ علماء کرام نے جہاد کا فتویٰ دے کر آزادی کی مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا جس میں تمام قبیلوں اور کشمیری عوام کی قومی قیادتوں نے ساتھ دیا تھا اور سب نے مل جل کر یہ خطہ آزاد کرایا تھا جس پر جموں وکشمیر کی یہ آزاد ریاست تشکیل پائی ہے اور یہ ریاست آج تک جہاد کے اس فتوے اور جدوجہد کی اساس پر کھڑی ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ فتویٰ قائم ہے یا ختم ہوگیا ہے؟ اگر وہ فتویٰ قائم ہے تو اس کے تسلسل کو بحال کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ میری یہ درخواست ہے کہ جہاد کے اس شرعی فریضہ کے اعلان سے جھجھک محسوس نہ کی جائے، آپ کی تو بنیاد ہی اس پر ہے اور اسے نظر انداز کر کے اپ کے پاس آزاد ریاست کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ جہاد کے اعلان کا مطلب یہ نہیں کہ آپ حضرات ہتھیار اٹھا کر ازخود کنٹرول لائن کی طرف دوڑ پڑیں۔ جہاد کے عمل کو ترک کرنا بھی غلط ہے اور جہاد کے نام پر نجی سطح پر مسلح کاروائیاں بھی درست نہیں ہیں۔ ہمیں اس کے درمیان کوئی راستہ نکالنا ہوگا جو باہمی مشاورت ومفاہمت کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ سب سے پہلے آزاد جموں وکشمیر کے ذمہ دار علماء کرام مل بیٹھ کر صورتحال کا جائزہ لیں اور موجودہ عالمی اور علاقائی ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی ایسا لائحہ عمل تجویز کریں جس سے مقبوضہ کشمیر کے عوام کو کرفیو اور محاصرہ کے ماحول سے نجات دلا کر ان کی شہری آزادیوں کو بحال کرایا جا سکے۔ اور اس کے بعد علماء کرام تجاویز کا خاکہ مرتب کریں جس پر حکومت آزاد کشمیر ریاست کی دینی، سیاسی اور مختلف طبقات کی قیادتوں کو جمع کر کے آزادئ کشمیر کی جدوجہد کا روڈ میپ طے کرے اور پھر حکومت پاکستان اور متعلقہ ریاستی اداروں سے بات کی جائے اور سب مل کر باہمی اعتماد اور مفاہمت کے ساتھ طریق کار کا فیصلہ کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد کو تین بڑے دائروں کا سامنا ہے:

(۱) **ایک یہ** کہ ''جہادِ کشمیر'' کو موجودہ حالات اور ماحول کے تناظر میں ازسرنو منظّم کیا جائے۔

(۲) دوسرا یہ کہ عالمی سطح پر اقوام متحدہ کو اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے پر آمادہ کی کرانے کے لیے سفارتی اور عوامی مہم منظّم کی جائے۔ مغربی ممالک میں ہر جگہ مؤثر کشمیری لابیاں موجود ہیں مگر انہیں راہنمائی کی ضرورت ہے، انہیں راہنمائی مہیا کر کے ان سے سفارت کاری، لابنگ، رائے عامہ کی بیداری اور اسٹریٹ پاور کے اظہار کا کام لیا جائے۔ اور یہ کام سب سے زیادہ حکومت آزاد کشمیر کی ذمہ داری بنتا ہے۔ مجھے مغربی ممالک میں کشمیری لابیوں کا علم ہے، ان کی قوت کار سے واقفیت ہے، اور میں ان کے مؤثر ہونے کے امکانات سے بھی بے خبر نہیں ہوں، مگر وہ راہنمائی اور سرپرستی کی تلاش میں ہیں جو انہیں ابھی تک میسر نہیں ہے۔

(۳) جبکہ تیسرا دائرہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مختلف خطوں مثلاً آزاد کشمیر، مقبوضہ کشمیر، گلگت، بلتستان، لداخ اور جموں وغیرہ کے شہریوں کے درمیان موقف کی یکجہتی کو برقرار رکھنے کی شعوری محنت کی جائے کیونکہ کشمیریوں کے اجتماعی موقف کو علاقائی سوچوں میں تقسیم کرنے کی سازش واضح نظر آرہی ہے جو سب سے زیادہ خطرناک بات ہے۔

میری آزاد جموں وکشمیر کے علماء کرام اور ان کے بعد سیاسی قیادتوں سے ایک درخواست یہ بھی ہے کہ خدا کے لیے ''سیریس'' ہو جائیں، ورنہ اگر ان کی موجودہ روش سے آزادیٔ کشمیر کی تحریک خدانخواستہ سبوتاژ ہوگئی تو وہ تاریخ کے مجرم تو ہوں گے، کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی سرخروئی حاصل نہیں کر پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ...... ۲۰ نومبر ۲۰۱۹ء)

آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد: نئی سفارتی صف بندی کی ضرورت

وزیرخارجہ جناب شاہ محمود قریشی نے پانچ اگست کو کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کا دن منانے کا اعلان کیا ہے اور دیگر پروگراموں کے علاوہ قومی سطح پر ایک منٹ کی خاموشی اختیار کرنے کی ترتیب بھی بتائی ہے، جو آج کی دنیا میں جذبات کے اظہار کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت وافادیت سے انکار نہیں ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ اس میں شریک ہوں گے، مگر کیا اس سے مسئلہ کشمیر کے حل اور کشمیریوں کی مظلومیت میں کمی کا کوئی راستہ نکل آئے گا؟ یہ محل نظر بات ہے اور ہم سب کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

کشمیر کا مسئلہ اصلاً یہ ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت کشمیر اور جموں وغیرہ کے جو علاقے ایک ریاست کے طور پر ڈوگرہ راجہ کے تسلط میں تھے اور اس سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کشمیری عوام کی جدوجہد پہلے سے جاری تھی، اس خطے کے جغرافیائی محل وقوع، آبادی کے تناسب اور عوامی جذبات تینوں حوالوں سے یہ استحقاق بنتا تھا کہ اسے پاکستان میں شامل کیا جائے۔ مگر ڈوگرہ راجہ نے ان تینوں معروضی حقائق کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا جسے کشمیری عوام نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف مسلح مزاحمت شروع کر دی۔ ڈوگرہ راجہ کے زیر تسلط ریاست جموں، کشمیر، گلگت بلتستان وغیرہ کے لوگ ہتھیار بکف ہو کر میدان میں نکل آئے اور جنگ کرتے ہوئے سری نگر کے دروازے تک جا پہنچے۔ اس مرحلہ میں بھارت کی درخواست پر اقوام متحدہ درمیان میں آئی اور دونوں فریقوں سے جنگ بند کرنے کی اپیل کرتے

ہوئے یہ طے کیا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق راجہ کا نہیں کشمیری عوام کا ہے، جس کے لیے آزادانہ استصواب رائے کا اہتمام ضروری ہے، تاکہ کشمیری عوام اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ پاکستان یا بھارت میں سے جس کے ساتھ چاہیں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ جموں وکشمیر کے مجاہدین آزادی کو سری نگر اور جموں کے دروازے پر یہ کہہ کر آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تھا کہ اقوام متحدہ آزادانہ رائے شماری کا اہتمام کروائے گی اور کشمیری عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکیں گے۔

اس جنگ میں بھارتی فوجیں راجہ کی مدد کے لیے وادی میں داخل ہوئیں اور پاکستان کی مسلح افواج مجاہدین کی مدد کے لیے آگے بڑھیں اور دونوں ملک اس قضیہ میں عملاً فریق بن گئے۔ تب سے ان دونوں ملکوں کے درمیان دو بڑی جنگوں کے علاوہ کشمیری عوام کی مسلح مزاحمت کی تحریک مسلسل جاری ہے۔ ایک طرف مقبوضہ کشمیر میں مسلح بھارتی افواج بھاری تعداد میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ مجاہدین آزادی کو ناکام کرنے کے لیے فوج کشی کے تمام حربے ان کے زیر استعمال ہیں۔ دوسری طرف آزاد کشمیر میں پاکستانی افواج موجود ہیں لیکن کشمیری عوام کے ساتھ ان کی کسی نوعیت کی محاذ آرائی نہیں ہے بلکہ وہ بھرپور باہمی اعتماد کے ساتھ ان کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔

اس حوالہ سے میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں کہ اس سے بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کشمیری عوام کی مرضی کھلے بندوں دیکھی جا سکتی ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کی موجودگی اور آزاد کشمیر و شمالی علاقہ جات میں پاکستانی افواج کی موجودگی ایک حقیقت ہے۔ مگر دونوں طرف کے عوام کا طرز عمل سب کے سامنے ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کا بھارتی افواج کے ساتھ اور آزاد کشمیر کے عوام کا پاکستانی فوج کے ساتھ طرز عمل کیا ہے۔ اگر کوئی باشعور بین الاقوامی کمیشن دونوں طرف صرف اس بات کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینے کی زحمت کر سکے تو اپنے مستقبل کے بارے میں کشمیری عوام کے جذبات و احساسات کا اندازہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

اس لیے مسئلہ کشمیر کا اصل حل صرف اور صرف یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے ستر سال قبل کشمیری عوام کے ساتھ آزادانہ استصواب رائے کا جو وعدہ کیا تھا اور جس سے وہ اب بھی انکاری نہیں ہے، اس وعدہ کی جلد از جلد تکمیل کرائی جائے۔ جبکہ عملی صورتحال یہ ہے کہ اقوام متحدہ اب بھی اس وعدہ سے

منحرف نہیں ہے اور استصواب رائے کمیشن اس کی طرف سے باقاعدہ موجود ہے، مگر بعض بالا دست عالمی طاقتوں کے مفادات اس کے کام میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں جس کا المناک ترین پہلو یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کے جبر وتشدد نے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے اور غیر جانبدار بین الاقوامی حلقوں اور اداروں کے مطابق کشمیریوں کو جبراً غلام بنائے رکھنے کے لیے بھارت ظلم وجبر کی آخری حدوں کو بھی کراس کر رہا ہے۔

ان حالات میں کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کا اظہار ضروری ہے جو مسلسل ہوتے رہنا چاہیے، مگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اقوام متحدہ کو اس کا طے شدہ کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی مؤثر صورت نکالے۔ کیس واضح ہے، انتظامات موجود ہیں، اور جس نے اہتمام کروانا ہے خود اس کا کوئی انکار نہیں ہے، تو اس میں پیشرفت کے راستے تلاش کرنا اور اس کے عملی اظہار کی صورتیں نکالنا بہرحال اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ اس حوالہ سے بھی کہ وہ اس کیس میں خود فریق ہے، اس حوالہ سے بھی کہ کشمیری عوام اپنے جائز حق کے لیے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس طور پر بھی کہ جغرافیائی، نظریاتی، ثقافتی اور تاریخی حوالوں سے کشمیریوں کا یہ جائز حق ہے کہ وہ پاکستان کا حصہ بنیں، اور اس وجہ سے بھی کہ دنیا کے سب سے بڑے عالمی فورم اقوام متحدہ نے ان سے اس بات کا بار بار وعدہ کر رکھا ہے۔

یہ مسئلہ نہ حکمران پارٹی کا ہے اور نہ ہی اپوزیشن کا ہے، بلکہ مشترکہ قومی مسئلہ ہے، ہر پاکستانی کا مسئلہ ہے اور اس کے ساتھ اسلامی تعاون تنظیم اور عالم اسلام کا بھی مسئلہ ہے۔ ہمارے خیال میں عالمی ماحول میں پاکستان کی سفارتی جدوجہد لابنگ اور میڈیا دونوں حوالوں سے نئی صف بندی کا تقاضا کر رہی ہے، جو قومی ماحول میں، قومی جذبہ کے ساتھ اور قوم کے تمام طبقات کی بھرپور شرکت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر ہم کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کا دن مناتے ہوئے اپنی سیاسی اور سفارتی جنگ کی نئی صف بندی کی کوئی مؤثر صورت نکال سکیں تو کشمیریوں کے ساتھ حقیقی یکجہتی یہی ہوگی، اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حصے کا کام کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور.....۴ اگست ۲۰۲۰ء)

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا پس منظر اور نئی حکومت سے توقعات

ریاست آزاد جموں وکشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات مکمل ہو گئے ہیں اور حسبِ روایت پاکستان میں برسر اقتدار جماعت پاکستان تحریک انصاف نے الیکشن میں واضح پوزیشن حاصل کر کے آئندہ مدت کے لیے حکومت سازی کا محاذ سنبھال لیا ہے، جبکہ اپوزیشن نے حسبِ روایت دھاندلی کے الزامات کے ساتھ نتائج قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، لیکن اگر باقی سب کچھ بھی حسبِ روایت ہوا تو اگلی ٹرم میں آزاد جموں وکشمیر کے حکمران تحریک انصاف کے عنوان سے ریاست میں حکومت کے فرائض سرانجام دیں گے۔

ریاست آزاد جموں وکشمیر بین الاقوامی سطح پر ایک متنازعہ اور فیصلہ طلب خطے کا حصہ ہے جس کی انتظامی ذمہ داری پاکستان کے پاس ہے اور اس کے تحت وقتاً فوقتاً انتخابات اور حکومت سازی کے یہ مراحل سامنے آتے رہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ریکارڈ کے مطابق مقبوضہ کشمیر، آزاد جموں وکشمیر اور گلگت بلتستان سمیت وہ پورا خطہ اس وقت متنازعہ ہے جو قیامِ پاکستان سے قبل ''ریاست جموں وکشمیر'' کہلاتا تھا اور ڈوگرہ مہاراجہ اس پر حکمران تھا۔ تقسیمِ ہند کے فارمولا کے مطابق ریاست کے مہاراجہ نے پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرنا تھا جو اس وقت کے ڈوگرہ اور ہندو مہاراجہ نے بھارت کے حق میں صادر کر دیا۔ مگر ریاست کے عوام کی غالب اکثریت مسلمان تھی اور پاکستان کے ساتھ نظریاتی، تہذیبی اور علاقائی وحدت کے رشتہ میں منسلک تھی اس لیے عوام نے ڈوگرہ مہاراجہ کا یہ فیصلہ تسلیم نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ کم و

بیش ہر طبقہ کے لوگوں نے اس سلسلہ میں مجاہدینِ آزادی کا ساتھ دیتے ہوئے آزاد جموں وکشمیر کے موجودہ علاقہ اور گلگت بلتستان کے خطہ کو ریاستی فوج کے ساتھ جنگ لڑ کر اس کے تسلط سے آزاد کرالیا۔

اس موقع پر جب بھارت نے اپنی افواج کشمیر میں اتاریں تو پاکستان بھی مجاہدین آزادی کی مدد کے لیے اپنی فوج کو میدان میں لے آیا جس سے عملاً یہ دوملکوں کے درمیان جنگ کی شکل اختیار کرگئی۔ واقعاتی ترتیب کے مطابق جب مجاہدین آزادی جموں اور سری نگر کے دروازے پر پہنچ گئے اور یہ نظر آنے لگا کہ ان دوشہروں میں ان کے داخلہ کے بعد کشمیر پر بھارت کی فوج کشی کا مقصد ختم ہو جائے گا تو اقوامِ متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ بھارت کا موقف یہ تھا کہ مہاراجہ نے اس ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا ہے اس لیے اس پر بھارت کا حق فائق ہے، جبکہ کشمیری عوام اوران کی حمایت میں پاکستان کا موقف یہ تھا کہ چونکہ کشمیری عوام کی غالب اکثریت بھارت کے ساتھ الحاق کو قبول نہیں کر رہی اور بھارت کی بجائے پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتی ہے جسے بھارت نے فوجی قوت کے بل پر دبا رکھا ہے اس لیے کشمیری عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ الحاق کا خود فیصلہ کریں اور اس میں کوئی بیرونی مداخلت اور دباؤ کارفرما نہ ہو۔

چنانچہ اقوامِ متحدہ نے یہ موقف تسلیم کرلیا اور اس کے فورم پر پاکستان اور بھارت نے بھی کشمیری عوام کا یہ حق تسلیم کیا کہ اقوامِ متحدہ کے تحت آزادانہ استصوابِ رائے کے ذریعے کشمیری عوام جو فیصلہ دیں گے وہ دونوں کے لیے قابل قبول ہوگا۔ تب سے یہ پورا خطہ متنازعہ چلا آرہا ہے اور اقوامِ متحدہ کے اس فیصلے پر عملدر آمد کا پوری دنیا انتظار کررہی ہے مگر سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی بار بار قراردادوں اور واضح فیصلوں کے باوجود ابھی تک اس وعدہ کی تکمیل کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔

اس دوران کشمیری عوام کی مزاحمت سیاسی وعسکری دونوں محاذوں پر مسلسل جاری ہے جبکہ پاکستان اور بھارت تین باہمی جنگوں سے گزر چکے ہیں مگر اقوام متحدہ اور اس کے ذمہ دار ادارے مسلسل بے پرواہی سے کام لے رہے ہیں۔ اسی دوران ریاست آزاد جموں وکشمیر کی قانون ساز

اسمبلی نے ریاست میں شرعی قوانین کے نفاذ کا تاریخی فیصلہ کیا جس کے تحت ضلع اور تحصیل کی سطح پر پوری ریاست میں جج صاحبان کے ساتھ مل بیٹھ کر شرعی قاضی صاحبان عوام کے مقدمات کے فیصلے قرآن وسنت کی روشنی میں کرتے ہیں اوراس طرح شریعت اسلامیہ کو آزاد کشمیر میں ریاستی قانون کی حیثیت حاصل ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بھارت نے اپنے زیر تسلط مقبوضہ کشمیر کی دستوری حیثیت میں تبدیلی کر کے اس کی متنازعہ پوزیشن کو ختم کرنے کی متعدد بار کوشش کی ہے تاکہ وہ اس پر اپنے قبضہ کو جائز تسلیم کرا سکے مگر کشمیری عوام ایسی کسی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں حتیٰ کہ مودی حکومت کا حالیہ طویل ترین کریک ڈاؤن بھی کشمیری عوام کے موقف میں تبدیلی لانے میں ناکام ہو گیا ہے۔

دوسری طرف ہمارے بعض حلقوں میں بھی آزاد جموں وکشمیر اور گلگت بلتستان کو پاکستان کا باقاعدہ حصہ قرار دینے اوران علاقوں کی متنازعہ حیثیت کو تبدیل کرنے کی تجاویز وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں جنہیں پذیرائی حاصل نہیں ہوئی اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ریاستی موقف بدستور وہی چلا آرہا ہے کہ اس پورے خطے کے مستقبل کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ اس خطہ کے عوام اقوام متحدہ کے تحت آزادانہ استصواب کے ذریعے اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں گے اور وہی فیصلہ منصفانہ، قابل قبول اور قابل عمل ہوگا۔

اس پس منظر میں آزاد ریاست جموں وکشمیر میں حالیہ انتخابات کے ذریعے قائم ہونے والی نئی حکومت کو مبارکباد دیتے ہوئے ہم یاددہانی کے طور پر اسے توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے:

☆ کشمیری عوام کے مسلّمہ حقِ خود ارادیت کو روبہ عمل لانے کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ساتھ ساتھ دنیا کے مسلم ممالک اور آزادی پسند اقوام کے ساتھ مل کر جدوجہد کو قومی اور عالمی سطح پر از سرِ نو منظّم کیا جائے۔

☆ ریاست میں نافذ شرعی قوانین اور شرعی نظام عدل کا تحفظ اور اس کا مکمل طور پر عملی نفاذ کرتے ہوئے اسے ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے طور پر متعارف کرایا جائے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آزاد کشمیر کی نئی حکومت کو ان مقاصد میں کامیابی اور پیش قدمی نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۳۰ جولائی ۲۰۲۱ء)

مسلم وزرائے خارجہ کانفرنس اسلام آباد

...... یہ خبر ہمارے لیے اطمینان کا باعث بنی ہے کہ اس کانفرنس کے ایجنڈے میں مسئلہ کشمیر بھی شامل ہے جو کشمیری عوام کے ساتھ ہونے والے مسلسل ظلم کے باعث ان کا اپنا حق ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری بھی ہے، اور اس سے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر ایک بار پھر اجاگر کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ فلسطین، اراکان اور دیگر خطوں کے مسلمانوں کی مظلومیت اور ان کے حقوق کی پامالی بھی مسلم وزرائے خارجہ کی توجہات کی منتظر ہے۔ جبکہ معروضی صورتحال میں مسلم ممالک پر مغربی اداروں اور این جی اوز کی فکری اور تہذیبی یلغار انتہائی فکر انگیز اور توجہ طلب مسئلہ ہے۔ عالمی اداروں، بین الاقوامی لابیوں، مغربی حکومتوں اور سیکولر این جی اوز کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے معاشرتی اور تہذیبی بالخصوص خاندانی نظام و ماحول میں قرآن وسنت کے صریح احکام وقوانین سے دستبرداری کے لیے تیار کیا جائے، جس کے لیے پوری مسلم دنیا میں چند مخصوص حلقوں کے سوا عالمِ اسلام کا کوئی طبقہ تیار نہیں ہے، اور یہ کشمکش دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔......

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۲۲ مارچ ۲۰۲۲ء)

تجدیدِ عہد برائے دفاعِ وطن

''مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' کے سولہویں یومِ تاسیس کے موقع پر ۱۲ جنوری کو اسلام آباد ہوٹل اسلام آباد میں ایک پروقار تقریب منعقد ہوئی جس میں وفاقی وزیر مذہبی امور سردار محمد یوسف خان، سابق صدر آزاد کشمیر سردار محمد یعقوب، سابق وزیر اعظم آزاد کشمیر سردار عتیق احمد خان، ایم ایس او کے صدر محسن خان، تحریک انصاف کے ایم این اے جناب غلام سرور خان اور دیگر حضرات کے ہمراہ ''تجدید عہد اور دفاعِ وطن'' کے عنوان سے کچھ گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے نوجوانوں کو سولہویں یومِ تاسیس پر مبارکباد پیش کرنا چاہوں گا۔ میں ان نوجوانوں سے متعارف ہوں جو گزشتہ پندرہ سال سے اسلامی تعلیمات کے فروغ اور وطن کے استحکام و سالمیت کے لیے تعلیمی اداروں میں مسلسل سرگرم عمل ہیں، اور وقتاً فوقتاً ان کے پروگراموں میں بھی شریک ہوتا رہتا ہوں۔ میں انہیں اس بات پر مبارکباد دیتا ہوں کہ مشکلات و مصائب کے ہجوم اور رکاوٹوں کے تسلسل کے باوجود یہ حضرات اسلام اور وطن کے محاذ پر استقامت کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں اور ان کے اس جذبہ و عمل کو بھی سراہوں گا کہ یہ اپنی جدوجہد کے دائروں اور روابط کے حوالہ سے کسی مخصوص خول میں بند نہیں ہیں۔

آج مجھے ان کے اجتماع میں مختلف سیاسی جماعتوں، دینی حلقوں اور طبقات کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کیونکہ دین اور قوم کے لیے جدوجہد کا سب سے اولین تقاضہ یہی ہے کہ محدود دائروں سے نکل کر وسیع تر قومی ماحول میں دینی جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔

آج کی اس تقریب کا عنوان ''تجدیدِ عہد اور دفاعِ وطن'' ہے مگر میں اس میں ایک لفظی ترمیم کر

کے اسے ''تجدیدِ عہد برائے دفاعِ وطن'' کی صورت میں پیش کرنا چاہوں گا اور اپنے ان عزیز نوجوانوں کو جو اسلام، وطن اور قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، وطنِ عزیز پاکستان کے حوالہ سے چند باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ وطنِ عزیز پاکستان اس وقت ہم سے جن باتوں کا تقاضہ کر رہا ہے اسے سامنے رکھنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔

تکمیلِ پاکستان

وطنِ عزیز کا پہلا تقاضہ پاکستان کی تکمیل ہے، جغرافیائی تکمیل بھی، نظریاتی تکمیل بھی اور معاشی تکمیل بھی۔ کیونکہ قیامِ پاکستان کے وقت کشمیر کا مسئلہ کھڑا کر کے پاکستان کو نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا جس کی وجہ سے برصغیر کی تقسیم کا ایجنڈا ابھی تک ادھورا ہے۔ جن طاقتوں نے کشمیر کا مسئلہ کھڑا کیا تھا وہ اسے مسلسل الجھائے ہوئے ہیں اور ستر سال گزرنے کے باوجود پاکستان اپنی جغرافیائی سرحدوں کی تکمیل نہیں کر سکا۔ چنانچہ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان اس دن مکمل ہوگا جب کشمیر آزاد ہو کر پاکستان کا حصہ بنے گا۔ کشمیر کے نوجوان اس کے لیے قربانیاں دیتے آرہے ہیں مگر اپنے وطن کی سرحدات کو مکمل کرنے کے لیے ہماری بھی ذمہ داری ہے کہ اس جدوجہد میں مؤثر کردار ادا کریں۔

اسی طرح نظریاتی طور پر بھی پاکستان ابھی تک نامکمل ہے کیونکہ جس مقصد کے لیے پاکستان قائم ہوا تھا اس کی طرف کوئی عملی پیشرفت دکھائی نہیں دے رہی۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم اور تحریک پاکستان کے دیگر راہنماؤں نے واضح طور پر کہا تھا کہ پاکستان مسلم تہذیب کا تشخص قائم رکھنے اور اسلام کے نظام وقوانین کو روبہ عمل لانے کے لیے قائم کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے دستور میں تو اس کی ضمانت موجود ہے مگر عملی طور پر ملک میں اسلامی نظام وقوانین کے نفاذ وعملداری کا کوئی ماحول موجود نہیں ہے۔ پاکستان نظریاتی اور تہذیبی طور پر اس دن مکمل ہوگا جب قرآن وسنت کی تعلیمات کی عملداری قائم ہوگی اور مسلمانوں کی اپنی تہذیبی اقدار وروایات کی بالادستی کا ماحول نظر آئے گا۔

پاکستان کی تکمیل کی منزل ہم ابھی تک معاشرتی اور معاشی حوالہ سے بھی حاصل نہیں کر سکے۔ قائداعظم مرحوم نے مغربی معاشی فلسفہ کی بجائے اسلامی تعلیمات پر مشتمل معاشی نظام کا تقاضہ کیا

تھا مگر ابھی تک ہمیں سود کی لعنت سے نجات نہیں مل سکی اور دستور میں واضح طور پر طے ہو جانے کے بعد سودی نظام بدستور ہم پر مسلط ہے۔ جبکہ عالمی سطح پر آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دیگر مالیاتی اداروں کا شکنجہ ہمیں جکڑے ہوئے ہے۔ ہم معاشرتی اور معاشی طور پر اس وقت مکمل پاکستان کی منزل سے ہمکنار ہوں گے جب عالمی معاشی جبر سے نجات حاصل ہوگی، سودی نظام کا خاتمہ ہوگا اور پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی ویلفیئر اسٹیٹ کی صورت اختیار کرلے گا۔ چنانچہ پاکستان کا ہم سے اولین تقاضہ ''تکمیلِ پاکستان'' کا ہے، جغرافیائی لحاظ سے بھی، تہذیبی ونظریاتی حوالہ سے بھی، اور معاشی ومعاشرتی اعتبار سے بھی پاکستان کو مکمل کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

دفاعِ وطن

وطن عزیز کا دوسرا بڑا تقاضہ ہم سے دفاع کا ہے۔ ایک طرف پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کو مسلسل خطرات درپیش ہیں، ہماری سرحدات پر جو خطرات سامنے نظر آرہے ہیں ان کے ساتھ ساتھ وہ منصوبے بھی ہماری توجہ چاہتے ہیں جو خدانخواستہ پاکستان کو حصے بخرے کرنے کے لیے بین الاقوامی سازشوں کی فائیلوں میں موجود ہیں اور ان کے لیے مختلف سطحوں پر کام ہوتا بھی دکھائی دے رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کو بھی مسلسل یلغار کا سامنا ہے کہ وطنِ عزیز کی نظریاتی اور تہذیبی شناخت کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور قومی و بین الاقوامی سطح پر ایسی کاروائیاں جاری ہیں جو پاکستان کو اسلامی شناخت سے محروم کرکے بتدریج ایک سیکولر ریاست کی شکل میں بدل دینا چاہتی ہیں۔ قراردادِ مقاصد، دستور کی اسلامی دفعات، تحفظ ختم نبوت کا قانون، تحفظ ناموسِ رسالتؐ کا قانون اور دیگر اسلامی قوانین میڈیا اور این جی اوز کی ہمہ گیر یلغار کی زد میں ہیں۔

قومی وحدت

اس کے ساتھ وطنِ عزیز کا تیسرا بڑا تقاضہ قومی وحدت اور ملکی استحکام کا ہے، اس لیے کہ ان سب کاموں کے لیے قومی وحدت سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جبکہ نسل، قومیت، فرقہ واریت اور زبان کے مختلف حوالوں سے ہماری قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی مہم جاری ہے۔ اور مختلف

لابیاں اس کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتی ہیں جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم متحد اور ہم آہنگ ہو کر وطنِ عزیز کی تکمیل اور دفاع کے تقاضوں کی طرف توجہ نہ دے سکیں اور آپس کے جھگڑوں میں ہمیشہ الجھے رہیں۔

چنانچہ میں اپنے عزیز نوجوانوں کو ان دینی اور قومی تقاضوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ ہماری نئی نسل میں ان تقاضوں کا احساس موجود ہے اور وہ ان کے لیے سرگرم عمل ہونے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی جدوجہد کا تسلسل اور اس کا یہ سالانہ پروگرام دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے اور ملک وقوم کے محفوظ مستقبل کے حوالہ سے اچھی امید پیدا ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کی حفاظت فرمائیں اور دین وقوم کے لیے مثبت اور مؤثر خدمات کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور ......۱۶ جنوری ۲۰۱۷ء)

مسئلہ کشمیر

﴿ گلگت بلتستان اور شمالی علاقہ جات کا مسئلہ ﴾

آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کی تجویز

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کی تجویز پر جمعیۃ علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود نے قوم کو خبردار کیا تھا کہ اس سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کو نقصان پہنچے گا اور یہ تجویز عملاً مسئلہ کشمیر کو دفن کر دینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے سے تو اجتناب کیا لیکن آزاد کشمیر میں پارلیمانی نظام اور ''بالاتر کشمیر کونسل'' پر مشتمل نیا آئینی فارمولا پیش کر کے مذکورہ مقاصد کے لیے نئی راہ اختیار کر لی۔ اس فارمولے کے نتائج وثمرات رفتہ رفتہ واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کی بڑی سیاسی جماعتوں مثلاً مسلم کانفرنس اور جمعیۃ علماء آزاد کشمیر نے اسے مسترد کر دیا ہے اور سردار محمد عبد القیوم خان بھی اس پر دستخط کرنے کے بعد ''سجدہ سہو'' کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

ادھر مقبوضہ کشمیر میں ''کشمیر کونسل'' کے اس فارمولے کے بہانے بعض حلقوں نے بھارت کے ساتھ کشمیر کے باقاعدہ الحاق کی تحریک کو تیز تر کر دیا ہے۔ اور اس طرح کشمیریوں کا حق خودارادیت دونوں طرف سے بعض افراد کی سیاسی اغراض کا شکار ہوا چاہتا ہے۔

ہم حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ نئے آئینی فارمولے کو واپس لے کر آزاد کشمیر کی سابقہ آزاد حیثیت کو بحال رکھا جائے اور پوری ریاست جموں و کشمیر کے عوام کو آزادانہ رائے کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا انسانی و جمہوری حق دلوانے کے لیے اپنی جدوجہد کو مؤثر اور تیز تر کر دیا جائے۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ...... ۲۶ جولائی ۱۹۷۴ء)

گلگت بلتستان کا مسئلہ:
صدرِ پاکستان کے نام ایک عریضہ

بگرامی خدمت جناب سردار فاروق احمد لغاری صاحب، صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ کچھ دنوں سے قومی اخبارات میں وفاقی کابینہ کا ایک فیصلہ زیر بحث ہے جس کے تحت مبینہ طور پر گلگت اور اس سے ملحقہ شمالی علاقہ جات کو مستقل صوبہ کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں چند حقائق کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں:

☆ شمالی علاقہ جات بین الاقوامی دستاویزات کی رو سے کشمیر کا حصہ ہیں اور اس نقشہ میں شامل ہیں جو پاکستان اور بھارت کے درمیان ۱۹۴۷ء سے متنازعہ چلا آ رہا ہے۔

☆ اس خطہ کے بارے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا یہ فیصلہ موجود ہے کہ یہ غیر طے شدہ اور متنازعہ علاقہ ہے اور اس کے مستقبل کا فیصلہ اس خطہ کے عوام آزادانہ استصواب رائے کے ذریعے سے اپنی مرضی سے کریں گے۔

☆ کشمیری عوام اس مسلمہ حق خودارادیت کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں اور اس کے لیے لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں جبکہ پاکستان ان کے اس موقف کی مکمل حمایت و تائید کرتے ہوئے عالمی رائے عامہ کو ان کے حق میں ہموار کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

☆ آزادئ کشمیر کی جدوجہد کے اس فیصلہ کن مرحلہ میں عالمی سطح پر کشمیر کو تقسیم کرنے کی متعدد

سازشیں منظر عام پر آ چکی ہیں جو کشمیر اور کشمیریوں کی وحدت کو تباہ کرنے کے مترادف ہیں۔ اس پس منظر میں شمالی علاقہ جات کو صوبائی حیثیت دینے کے بارے میں حکومت پاکستان کا مذکورہ فیصلہ کشمیر کی وحدت اور کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کے سلسلہ میں پاکستان کے قومی موقف سے ہم آہنگ نہیں ہے اور اس سے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

☆ یہ درست ہے کہ شمالی علاقہ جات کے عوام سیاسی و عدالتی حقوق سے مسلسل محروم چلے آ رہے ہیں اور انہیں ان کے جائز حقوق سے مزید محروم رکھنا سراسر ناانصافی اور ظلم ہوگا لیکن اس کا کوئی ایسا حل جو کشمیری عوام کی جدوجہد اور مسلمہ موقف کو سبوتاژ کر دے اس سے بھی بڑا ظلم شمار ہوگا جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

☆ اس خطہ کے عوام کے جائز سیاسی و عدالتی حقوق کی بحالی کی واحد مناسب صورت یہ ہے کہ شمالی علاقہ جات کے عوام کو آزاد جموں و کشمیر کی قانون سازی اسمبلی میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے اور آزاد کشمیر سپریم کورٹ و ہائی کورٹ کا دائرہ شمالی علاقہ جات تک وسیع کر دیا جائے۔

اس لیے آنجناب اور آپ کی وساطت سے حکومت پاکستان سے گزارش ہے کہ شمالی علاقہ جات کو مستقل صوبہ کی حیثیت دینے کے مذکورہ فیصلہ پر نظر ثانی کی جائے اور کوئی بھی ایسی صورت اختیار کرنے سے مکمل گریز کیا جائے جو کشمیر کی وحدت اور کشمیری عوام کی جدوجہد کے لیے کسی بھی درجہ میں نقصان اور کمزوری کا باعث بن سکتی ہو۔

بے حد شکریہ، والسلام!

ابوعمار زاہد الراشدی

چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... جون ۱۹۹۴ء)

کشمیر کا مسئلہ اور شمالی علاقہ جات

روزنامہ پاکستان لاہور نے ۲۰ فروری ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی ہے کہ شمالی علاقہ جات گلگت، سکردو، ہنزہ وغیرہ کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے آئینی ترمیم لائی جا رہی ہے اور اس کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اس سے قبل روزنامہ جنگ لاہور نے گزشتہ دنوں خبر شائع کی تھی کہ وفاقی سطح پر شمالی علاقہ جات کے امور کو وزارتِ امورِ کشمیر سے الگ کر دیا گیا ہے۔

شمالی علاقہ جات بین الاقوامی دستاویزات کے مطابق اس متنازعہ خطہ کا حصہ ہیں جو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستان اور بھارت کے درمیان ابھی تک حل طلب ہے، اور ایک معاہدہ کے تحت حکومتِ پاکستان وزارتِ امورِ کشمیر کے ذریعے اس کا نظام چلاتی آ رہی ہے۔ مگر وقتاً فوقتاً اس خطہ کو پاکستان میں شامل کرنے اور ایک مستقل صوبے کی حیثیت دینے کی تجاویز بھی سامنے آتی رہی ہیں، اور اب پھر اسی طرف پیشرفت متوقع ہے۔ لیکن ملک کے دو حلقوں کی تشویش اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ توجہ ہے:

- ☆ مذہبی حلقوں کو یہ تشویش ہے کہ اگر شمالی علاقہ جات کو کشمیر سے الگ کر کے مستقل صوبہ بنایا گیا تو یہ اپنی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے شیعہ صوبہ بنے گا اور اسی وجہ سے آغا خان اس صوبے کے قیام کے لیے ایک عرصہ سے دلچسپی اور سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں۔
- ☆ جبکہ تحریکِ آزادی سے تعلق رکھنے والے کشمیری راہنماؤں کا موقف یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر حل ہونے سے پہلے پاکستان نے متنازعہ خطے کے کسی علاقے کو بھی باقاعدہ طور پر اپنے ملک کا حصہ بنا لیا تو بھارت کے لیے اتنی بات کافی ہوگی اور وہ اسے جواز بنا کر تمام معاہدات سے آسانی کے ساتھ منحرف ہو جائے گا۔

اس لیے کشمیری لیڈروں کا یہ مطالبہ ہمارے نزدیک جائز ہے، شمالی علاقہ جات کو پاکستان کا حصہ بنا کر مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر نقصان نہ پہنچایا جائے بلکہ اسے آزاد کشمیر میں شامل کر کے اس خطہ کے لوگوں کو آزاد کشمیر اسمبلی میں نمائندگی دی جائے، اور آزاد کشمیر سپریم کورٹ کا دائرہ شمالی علاقہ جات تک وسیع کر کے مظفر آباد ہائیکورٹ کا بینچ گلگت میں قائم کر دیا جائے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... مارچ ۱۹۹۸ء)

گلگت بلتستان کا اصل مسئلہ کیا ہے؟

ستمبر کے آخر میں بلتستان کے پانچ روزہ سفر کے دوران مجھے گلگت بلتستان کو داخلی خودمختاری کے پیکیج کے تحت صوبائی درجہ دینے کے بارے میں مختلف طبقات کے لوگوں سے گفت وشنید کا موقع ملا، ان میں علماء کرام بھی ہیں، سیاسی جماعتوں کے رہنما بھی ہیں، صحافی حضرات بھی ہیں اور انتظامیہ وعدلیہ کے بعض اعلیٰ افسران بھی شامل ہیں۔ ان حضرات کے تاثرات ملے جلے ہیں، حمایت کرنے والے لوگ بھی موجود ہیں اور مخالفت کرنے والوں کی کمی بھی نہیں، جبکہ حمایت کے باوجود تحفظات رکھنے والے حضرات بھی اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

گلگت بلتستان کے نام سے کم وبیش ساڑھے ۷۲ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل اس علاقہ کی آبادی ۲۲ لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ یہ دنیا کے تین بلند ترین پہاڑی سلسلوں ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش پر پھیلا ہوا ہے اور عوامی جمہوریہ چین اور جنوبی ایشیا کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ اس کی سرحدیں افغانستان، مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور وسطی ایشیا کی ریاستوں تک وسیع ہیں اور اس کا ایک حصہ لداخ کے ساتھ اور دوسرا حصہ چین کے صوبہ سنکیانگ سے ملا ہوا ہے۔ کسی زمانے میں اس خطہ میں بلورستان، دردستان اور بوشال کی آزاد ریاستیں قائم تھیں اور انہی میں سے ایک کی یاد میں ''بلورستان نیشنل فرنٹ'' کے نام سے جناب نواز ناجی کی قیادت میں آج بھی ایک سیاسی گروپ کام کر رہا ہے جس کا مقصد اس علاقہ کو ازسرنو ایک آزاد ریاست کی شکل دینا ظاہر کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں اس خطہ پر سکھوں کا قبضہ ہوا، پھر اسے جموں وکشمیر کی ڈوگرہ ریاست کا حصہ بنالیا گیا اور تقریباً ایک سو سال گلگت بلتستان کا یہ علاقہ ڈوگرہ حکومت کے زیر تسلط رہا۔

برطانوی حکومت نے کشمیر کا صوبہ جموں کو ڈوگرہ مہاراجہ کے ہاتھ فروخت کر دیا لیکن ۱۹۳۵ء

میں اسی ڈوگرہ مہاراجہ سے گلگت کا علاقہ ۶۰ سال کے لیے پٹہ پر حاصل کرلیا۔ جس کے بعد تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان تک یہ صورتحال رہی کہ گلگت پر انگریز ریزیڈنٹ کی حکومت تھی جبکہ سکردو میں ڈوگرہ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ گورنر حکومت کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے کچھ عرصہ پہلے برطانوی حکومت نے یہ پٹہ منسوخ کر کے گلگت کا علاقہ ڈوگرہ حکومت کو واپس کر دیا اور ڈوگرہ کی طرف سے بریگیڈیئر گھنسارہ سنگھ کو گلگت کا گورنر مقرر کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد گلگت کے عوام نے گھنسارہ سنگھ کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور شاہ رئیس خان نامی ایک راجہ نے ''جمہوریہ گلگت'' کے نام سے آزاد ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو جمہوریہ گلگت کے قیام کا اعلان کیا گیا اور گھنسارہ سنگھ کو گرفتار کر کے اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ مگر یہ آزاد ریاست دو ہفتے سے زیادہ نہ چل سکی۔ ایک روایت یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ معروف کشمیری رہنما چودھری غلام عباس مرحوم اس موقع پر حرکت میں آئے اور انہوں نے گلگت کے بعض ذمہ دار حضرات سے رابطہ کیا جن میں مرکزی جامع مسجد گلگت کے خطیب مولانا قاضی عبد الرزاق فاضل دیوبند بھی شامل تھے، ان لوگوں نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف گلگت کے عوام کی جنگ آزادی کی قیادت کی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ چودھری غلام عباس مرحوم کی تحریک پر ان رہنماؤں نے ''آزاد جمہوریہ گلگت'' کی مخالفت کی جس پر حکومت پاکستان کے ساتھ رابطہ کر کے ''معاہدۂ کراچی'' کے تحت اس خطہ پر حکومتِ پاکستان کی عملداری کو قبول کر لیا گیا اور ۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو حکومتِ پاکستان کے پولیٹیکل ایجنٹ سردار محمد عالم خان نے گلگت کا انتظام سنبھال لیا۔

دوسری طرف بلتستان کے عوام نے بھی ڈوگرہ گورنر کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور پاک فوج کے ایک کرنل محمد اسلم خان مرحوم نے، جو ایئر مارشل (ر) اصغر خان کے بھائی تھے، اس مسلح بغاوت میں بلتستان کے عوام کی قیادت کی۔ علاقہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ بلتستان کے لوگوں کو ڈوگرہ راج سے آزادی ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو حاصل ہوئی، پھر اسے بھی گلگت کے ساتھ معاہدۂ کراچی میں شامل کر لیا گیا۔ سکردو کے بعض حضرات نے یہ بھی بتایا کہ کرنل محمد اسلم خان مرحوم کی سربراہی میں عوامی فوج لداخ کے راستے سری نگر کے قریب پہنچ چکی تھی، وہ سری نگر میں داخل ہونے کی تیاری کر رہے تھے کہ پاک فوج کے انگریز کمانڈر انچیف کے حکم پر انہیں واپس آنا پڑا اور وہ پیش قدمی کی بجائے

پسپائی پر مجبور ہوگئے۔ کرنل محمد اسلم خان مرحوم نے، جو بعد میں بریگیڈیئر بنے،بلتستان میں ہی مستقل قیام اختیار کرلیا۔ میں نے سکردو کے قریب ایک خوبصورت جھیل کے کنارے ان کی رہائش دیکھی ہے۔

گلگت بلتستان کو اس کے بعد وفاق کے زیر انتظام علاقوں میں شامل کرلیا گیا اور چونکہ یہ خطہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جموں وکشمیر کا تنازع کھڑا ہونے سے قبل ریاست جموں وکشمیر کا ایک صدی سے حصہ چلا آرہا تھا اس لیے بین الاقوامی نقشوں میں یہ خطہ بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ علاقہ شمار ہونے لگا۔ اسے اگر آزاد ریاست جموں وکشمیر کا حصہ قرار دے کر اسی طرح کے سیاسی حقوق دے دیے جاتے جیسے آزاد جموں وکشمیر کی ریاست کے عوام کو دیے گئے تو شاید کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ لیکن ایک طرف آزاد جموں وکشمیر کی ریاست کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر کے وہاں کے عوام کو سیاسی وشہری حقوق دیے گئے، دوسری طرف گلگت بلتستان کے عوام ان حقوق سے مسلسل محروم رہے جس کی وجہ سے احساس محرومی نے جنم لیا اور اس خطہ کے عوام نے اپنے لیے سیاسی حقوق کے مطالبات شروع کردیے جو ان کا جائز حق تھا۔ مگر گلگت بلتستان کے عوام کے سیاسی وشہری حقوق کا مسئلہ دوطرفہ تحفظات کے دائرے میں محصور رہا:

(۱) ایک طرف کشمیری رہنماؤں کے یہ تحفظات تھے کہ چونکہ گلگت بلتستان کا علاقہ بین الاقوامی طور پر متنازعہ ہے اور اس کے مستقبل کا فیصلہ جموں وکشمیر کے ساتھ ہونا ہے اس لیے اسے پاکستان کا حصہ قرار دینے سے بین الاقوامی فورم پر مسئلہ کشمیر کو نقصان پہنچے گا اور پاکستان کا موقف کمزور ہوجائے گا۔

(۲) دوسری طرف گلگت بلتستان کے عوام کا یہ مطالبہ تھا کہ انہیں سیاسی وشہری حقوق سے محروم رکھنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے وزیراعظم محمد خان جونیجو مرحوم کے دور حکومت میں اس طرف پیشرفت ہوئی کہ انہوں نے سکردو کے دورے کا اعلان کیا کہ وہ وفاقی کابینہ میں شمالی علاقہ جات سے ایک مشیر لے کر اس خطہ کو حکومت میں نمائندگی دے رہے ہیں۔ اس اعلان کا کشمیری قیادت کی طرف سے نوٹس لیا گیا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے جمعیۃ علماء اسلام (درخواستی

گروپ) کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کشمیری وقومی رہنماؤں کو ایک عرضداشت ارسال کی تھی جس کا ایک حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے:

''گزشتہ دنوں پاکستان کے وزیراعظم جناب محمد خان جونیجو نے شمالی علاقہ جات کے دورے کے موقع پر سکردو میں اعلان کیا کہ وہ شمالی علاقہ جات کو پاکستان کی وفاقی کابینہ میں نمائندگی دینے پر غور کر رہے ہیں اور اس خطہ سے ایک مشیر لے رہے ہیں۔ وزیراعظم پاکستان کے اس اعلان کا کشمیری رہنماؤں نے بروقت نوٹس لیا اور اپنے بیانات میں واضح کر دیا ہے کہ یہ اعلان شمالی علاقہ جات کو پاکستان کا باقاعدہ حصہ قرار دینے اور صوبہ بنانے کی اسکیم کا آغاز ہے جس سے مسئلہ کشمیر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

آزاد کشمیر کے کم وبیش تمام قابل ذکر رہنماؤں کے علاوہ پاکستان کی ایک اہم سیاسی جماعت جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے بھی وزیراعظم پاکستان کے اس اعلان کو مسترد کر دیا اور جمعیۃ کے مرکزی رہنما علامہ ڈاکٹر خالد محمود نے پلندری میں جمعیۃ علماء اسلام آزاد جموں وکشمیر کے سربراہ شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف خان سے ملاقات کر کے انہیں مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے سے آگاہ کرنے کے علاوہ اس سلسلہ میں مشترکہ جدوجہد کے پروگرام پر گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ سینیٹر مولانا قاضی عبد اللطیف، مولانا عبد الحکیم ہزارویؒ، مولانا زاہد الراشدی اور مولانا قاری عزیز الرحمان ہزاروی پر مشتمل جمعیۃ کے ایک وفد نے صدر آزاد کشمیر سردار محمد عبد القیوم خان سے ملاقات کر کے انہی امور پر ان سے تبادلۂ خیال کیا ہے۔''

اس وقت سردار محمد عبد القیوم خان حکومتِ آزاد جموں وکشمیر کے صدر تھے اور پاکستان کی قومی سیاست میں بھی ان کی آواز خاصی مؤثر تھی، اس لیے یہ احتجاج کارگر ہوا اور جونیجو مرحوم نے اس طرف مزید پیشرفت نہ کی۔

اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں بے نظیر بھٹو مرحومہ کے دور حکومت میں اس طرف پیشرفت ہوئی اور

شمالی علاقہ جات میں ناردرن ایریا کونسل قائم کر کے وہاں کے عوام کو ووٹ کا حق دیا گیا اور اس نوعیت کی دیگر اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ کشمیری رہنماؤں کی طرف سے اس موقع پر بھی تحفظات کا اظہار کیا گیا کہ گلگت بلتستان کے عوام کو سیاسی حقوق اور شہری سہولتوں سے بہرہ ور کرنا ضروری ہے لیکن اس خطہ کو پاکستان کا حصہ ظاہر کرنے کی بجائے آزاد کشمیر کا انتظامی حصہ بنا دیا جائے، یا آزاد کشمیر کی طرز پر عارضی طور پر الگ انتظامی بندوبست کر دیا جائے، لیکن اس کے بارے میں ایسا تاثر نہ دیا جائے کہ اسے پاکستان کا حصہ بنایا جا رہا ہے کیونکہ اس سے بہرحال مسئلہ کشمیر کو نقصان پہنچے گا۔ اس مرحلہ میں کشمیری قیادت کے تاثرات کیا تھے؟ اس کے بارے میں اس وقت کے آزاد جموں و کشمیر کے وزیر اعظم سردار محمد عبد القیوم خان کے ایک بیان کا حوالہ دینا چاہوں گا جو لندن کے روزنامہ جنگ میں ۲۹ اپریل ۱۹۹۴ء کو شائع ہوا تھا:

> ’’آزاد جموں و کشمیر کے وزیر اعظم سردار محمد عبد القیوم خان نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے کہا کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ گلگت اور بلتستان ریاست جموں و کشمیر کا جزو لاینفک ہیں اور تمام ریاست کی حیثیت اس وقت تک متنازعہ اور غیر طے شدہ ہے جب تک ریاست کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ انہوں نے صدر مملکت سردار فاروق خان لغاری کو ارسال کردہ خط میں کہا ہے کہ یہ بات خوش آئند ہے کہ آخر گلگت بلتستان کے عوام کو قانون ساز کونسل منتخب کرنے کے لیے ووٹ دینے کا حق مل گیا ہے لیکن وفاقی وزیر اطلاعات نے اصلاحات کے جس پیکج کا اعلان کیا ہے ہم اس کے مفہوم اور مضمرات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وزیر اعظم پاکستان ریکارڈ درست رکھنے کے لیے اس بات کا اعلان کریں کہ اصلاحات کا پیکیج ایک عبوری اقدام ہے جس کا مقصد ان علاقوں کے عوام کی روزمرہ انتظامی اور دوسری مشکلات کا ازالہ کرنا ہے۔‘‘

آزاد کشمیر کے وزیر اعظم کی حیثیت سے سردار محمد عبد القیوم خان کے اس خط اور بیان نے یہ بات واضح کر دی کہ کشمیری رہنماؤں کو اس بات سے اختلاف نہیں کہ گلگت بلتستان کے عوام کو سیاسی

اور شہری حقوق دیے جائیں، البتہ وہ اس کی کسی ایسی عملی صورت کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں جس سے بین الاقوامی فورم پر مسئلہ کشمیر کو اور اس کے بارے میں پاکستان کے موقف کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ اس پس منظر میں جب میں نے بلتستان کے مختلف رہنماؤں سے بات کی تو ملے جلے خیالات سننے کو ملے:

(۱) بعض حضرات نے اس خطہ کے ماضی بعید کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس علاقہ کا جموں و کشمیر کے ساتھ تعلق صرف ڈوگرہ حکومت کے دور میں رہا ہے اس کے علاوہ یہ خطہ کبھی ریاست جموں و کشمیر کا حصہ نہیں رہا۔ اس کے علاوہ گلگت بلتستان کے عوام نے ڈوگرہ حکومت اور انگریز ریزیڈنسی سے نجات کے لیے الگ طور پر جنگ لڑی ہے اور پاکستان کے ساتھ اس کا براہ راست الحاق کیا ہے، اس لیے اسے پاکستان کا حصہ ہی ہونا چاہیے اور پاکستان کے صوبے کے طور پر یہاں کے عوام کو حقوق ملنے چاہئیں۔

(۲) ایک حلقے کی سوچ اس سے بھی آگے کی ہے کہ ماضی بعید کی طرح اسے ایک خودمختار ریاست کا درجہ ملنا چاہیے جس کے لیے ''بلورستان نیشنل فرنٹ'' کام کر رہا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ گلگت بلتستان کو حکومت پاکستان نے اس مصلحت کے تحت جموں و کشمیر کے بین الاقوامی طور پر متنازعہ علاقہ میں شمار کیا تھا کہ کشمیری عوام حقِ خودارادیت ملنے کی صورت میں گلگت بلتستان کے عوام کے ووٹ لازماً پاکستان کے حق میں جائیں گے اور پاکستان کو اس سے سیاسی فائدہ ہوگا۔

(۳) مگر دوسری طرف کے حضرات کا کہنا ہے کہ گلگت بلتستان کو جموں و کشمیر ریاست کا حصہ ہونے کی وجہ سے متنازعہ علاقہ شمار کیا گیا ہو یا مصلحتاً ایسا ہوا ہو، دونوں صورتوں میں معروضی حقیقت یہی ہے کہ بین الاقوامی دستاویزات میں یہ جموں و کشمیر کا حصہ ہے۔ اس لیے اسے اگر پاکستان کا صوبہ بنایا جاتا ہے تو اس سے نہ صرف ریاست جموں و کشمیر کی تقسیم کی راہ ہموار ہوگی بلکہ بین الاقوامی فورم پر بھارت کا موقف مضبوط ہوگا، اور اسے مقبوضہ جموں و کشمیر کو بھارت کا دستوری حصہ قرار دینے کے متنازعہ عمل میں ایک طرح سے جواز کی سند مل جائے گی۔

بعض واقفانِ حال کا کہنا ہے کہ گلگت بلتستان کے عوام کو مزید سیاسی حقوق دینے کے موجودہ اقدامات سے پہلے ان خدشات کے باعث اصل تجویز یہ تھی کہ گلگت بلتستان کو آزاد جموں وکشمیر کا انتظامی یونٹ قرار دے کر آزاد کشمیر سپریم کورٹ کا دائرہ وہاں تک وسیع کیا جائے اور ہائیکورٹ کا مستقل بینچ قائم کر دیا جائے، اسی کے مطابق سمری تیار ہوئی تھی مگر عین وقت پر کوئی خفیہ ہاتھ حرکت میں آیا اور اس تجویز کو ایک طرف رکھتے ہوئے گلگت بلتستان کو الگ صوبے کی حیثیت دینے کا اعلان کر دیا گیا۔

عدلیہ سے تعلق رکھنے والی ایک اعلیٰ شخصیت نے موجودہ پیکیج کے اس تضاد کی نشاندہی کی ہے۔ ایک طرف قانون ساز اسمبلی، گورنر، الیکشن کمشنر، پبلک سروس کمیشن اور دیگر صوبائی اداروں کے اعلان کے ساتھ گلگت بلتستان کو ایک مستقل صوبے کا عنوان دیا گیا ہے لیکن دوسری طرف ہائیکورٹ کو پاکستان کے سپریم کورٹ کے تحت کرنے کی بجائے اس کے لیے الگ چیف کورٹ قائم کیا جا رہا ہے۔ اس شخصیت کا کہنا ہے کہ اس خطہ کے لیے گورنر، وزیراعلیٰ اور قانون ساز اسمبلی کی اصلاحات کے استعمال کے لیے پاکستان کے دستور میں ترامیم کرنا ہوں گی کیونکہ موجودہ دستوری پوزیشن میں یہ عہدے ان ناموں کے ساتھ گلگت بلتستان میں قائم نہیں کیے جا سکتے۔

بہرحال گلگت بلتستان کے لیے داخلی خودمختاری کے اس پیکیج کے بارے میں اس حوالہ سے مثبت جذبات وتاثرات پائے جاتے ہیں کہ اس سے خطہ کے عوام کو مزید سیاسی حقوق حاصل ہوئے ہیں اور حکومت سازی میں ان کی شرکت کا تناسب بڑھا ہے جس سے ان کی سیاسی خوداعتمادی میں اضافہ ہوگا۔ وہاں واضح طور پر یہ خدشات بھی عام سطح پر لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں کہ اس سے عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو نقصان پہنچے گا، اقوام متحدہ میں پاکستان کا موقف کمزور ہوگا، ریاست جموں وکشمیر کی تقسیم کی راہ ہموار ہوگی اور ان قوتوں کو فائدہ ہوگا جو عالمی استعماری مفادات کے لیے اس علاقہ کو آزاد ریاست کے طور پر دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اور عوامی جمہوریہ چین کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی عالمی اسٹریٹیجی کے پس منظر میں اس امکان اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس لیے ہمارے خیال میں گلگت بلتستان کے عوام کو سیاسی حقوق دینے اور حکومت سازی میں

شریک کرنے کا عمل تو ضرور جاری رہنا چاہیے لیکن جیسا کہ سردار محمد عبدالقیوم خان نے محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ سے کہا تھا کہ وہ گلگت بلتستان کو جموں وکشمیر کا لاینفک حصہ قرار دینے اور موجودہ اقدامات کو عبوری حیثیت دینے کا اعلان کریں، موجودہ حکومت کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی اصلاحات استعمال کرنے سے قطعی طور پر گریز کرنا چاہیے جس سے گلگت بلتستان کو پاکستان کا حصہ قرار دینے کا تاثر ملتا ہو۔ اس لیے کہ یہ بہرحال مسئلہ کشمیر کے لیے خطرناک ہوگا۔

(روزنامہ پاکستان، اسلام آباد......۱۳۱ اکتوبر ۲۰۰۹ء)

گلگت بلتستان کی انتظامی حیثیت کا تنازع

محمد خان جونیجو مرحوم کی وزارت عظمٰی کا دور تھا، پرنس عبد الکریم آغا خان کی آمد و رفت گلگت بلتستان کے علاقے میں معمول سے بڑھ گئی تھی، اس کے ساتھ ہی گلگت بلتستان کو مستقل صوبہ بنانے کی باتیں اخبارات میں آنا شروع ہوئیں تو باخبر حلقوں میں تشویش پیدا ہونے لگی، اتنے میں یہ خبر شائع ہوئی کہ وزیراعظم جونیجو مرحوم گلگت کا دورہ کرنے والے ہیں اور اس موقع پر گلگت بلتستان اور سکردو پر مشتمل شمالی علاقہ جات کو پاکستان کا مستقل صوبہ بنانے کا اعلان متوقع ہے۔

حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ آف کلاچی، حضرت مولانا عبد الحکیمؒ آف راولپنڈی اور راقم الحروف اس دوران جامعہ فرقانیہ راولپنڈی میں اکٹھے ہوئے اور متوقع حالات کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورہ کیا، ہمیں اس سلسلہ میں چند حوالوں سے تشویش لاحق تھی:

☆ گلگت، بلتستان اور سکردو کا یہ علاقہ بین الاقوامی نقشہ کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کے اس خطہ میں شامل ہے جو پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ چلا آرہا ہے اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے طے کر رکھا ہے کہ جموں، کشمیر، گلگت بلتستان اور سکردو وغیرہ پر مشتمل ریاست جموں وکشمیر کے عوام کو آزادانہ استصواب رائے کے ذریعہ یہ حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرتے ہوئے پاکستان یا بھارت میں سے جس کے ساتھ چاہیں شامل ہو جائیں، اس وقت تک اس خطہ کی حیثیت متنازعہ رہے گی۔ اس لیے اگر اس متنازعہ خطہ کے کسی حصے کو پاکستان کا باقاعدہ صوبہ بنا دیا جائے تو بھارت کے اس عمل کو جواز فراہم ہو جائے گا جو اس نے مقبوضہ جموں وکشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ بنا کر ایک عرصہ سے جاری رکھا ہوا ہے اور جسے نہ صرف پاکستان تسلیم نہیں کر رہا بلکہ آزاد کشمیر کی

جدوجہد کرنے والی جماعتیں بھی اسے قبول نہیں کر رہیں۔ اس لیے شمالی علاقہ جات کو پاکستان کا صوبہ بنانے سے بین الاقوامی فورم پر کشمیر کے کیس کو نقصان پہنچے گا اور مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی من مانی کو سندِ جواز مل جائے گی۔

☆ شمالی علاقہ جات جغرافیائی لحاظ سے انتہائی حساس اور نازک محل وقوع رکھتے ہیں اور بھارت، چین، روس اور افغانستان کے بارڈروں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے بہت محتاط پالیسی کا تقاضہ کرتے ہیں۔

☆ دنیا کا بلند ترین میدان ''دیوسائی'' اس علاقے میں واقع ہے جو چین، روس، پاکستان، ایران، بھارت اور افغانستان کی صورت حال پر نظر اور کنٹرول رکھنے کے لیے انتہائی موزوں کمین گاہ ثابت ہوسکتا ہے اور اسی وجہ سے عالمی استعمار کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں۔

☆ آبادی کے تناسب کے حوالہ سے سنی، شیعہ، آغا خانی اور نور بخشی فرقوں کی جو صورت حال ہے وہ انتہائی غیر متوازن ہے اور انہیں ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے سے یہ علاقہ مستقل طور پر فرقہ وارانہ کشیدگی اور تصادم کی آماجگاہ بن سکتا ہے جس کا آغاز ہو چکا ہے۔

ہم تینوں نے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان (درخواستی گروپ) کے گروپ کی صورت میں ذمہ دار عہدہ داران کی حیثیت سے اس صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لیا، ان تمام خدشات کو سامنے رکھتے ہوئے آزاد جموں و کشمیر کی قیادت سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا اور مسئلہ کا حل یہ تجویز کیا کہ مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی پوزیشن اور نزاکتوں کے پیش نظر اس سوال کو اجاگر کیا جائے کہ ریاست جموں و کشمیر کے متنازعہ علاقہ کے ان دو خطوں کے لیے الگ الگ نظام اور حیثیتیں نہ تو اصولی طور پر درست ہیں اور نہ ہی پاکستان کے مفاد سے مطابقت رکھتی ہیں، اس لیے کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل ہونے تک آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو یکساں حیثیت میں رکھا جائے اور آزاد کشمیر کے حصہ کے طور پر اسی طرز کا نظام عارضی طور پر یہاں نافذ کر کے عوام کو شہری اور سیاسی حقوق سے بہرہ ور کر دیا جائے۔

اس وقت آزاد کشمیر میں آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے سربراہ سردار محمد عبد القیوم خان برسرِ اقتدار تھے، ہم نے یعنی مولانا قاضی عبد اللطیفؒ، مولانا عبد الحکیمؒ اور راقم الحروف نے سردار صاحب کے پاس حاضر ہوکر انہیں اپنے خدشات اور موقف سے آگاہ کیا جس سے انہوں نے اتفاق کیا اور ان کی مداخلت اور پیشرفت کی وجہ سے گلگت بلتستان کو صوبہ بنانے کی کاروائی وقتی طور پر رک گئی جس پر ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے چند سال بعد پھر یہ تحریک سامنے آئی اور کچھ عرصہ قبل کوئی آئینی صورت اختیار کیے بغیر محض انتظامی آرڈر سے گلگت بلتستان کو صوبائی حیثیت دے دی گئی جو ابھی تک چل رہی ہے۔ مگر وہ خدشات جن کا ہم نے ربع صدی قبل اظہار کیا تھا اب بھی موجود ہیں بلکہ ان کی سنگینی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی مذہبی قیادت نے اس نزاکت کا احساس کیا ہے اور گزشتہ ماہ ۷ جنوری کو اسلام آباد میں مل بیٹھ کر اپنے مشترکہ موقف کا تعین کیا ہے، اس مشاورت میں شریک ہونے والوں میں مولانا قاضی نثار احمد (تنظیم اہل سنت)، ملک مسکین (سابق سپیکر گلگت بلتستان اسمبلی)، شیر عالم (دیامر جرگہ) مولانا شکرت (دیامر جرگہ)، سردار عتیق احمد خان (مسلم کانفرنس)، عبد الرشید ترابی (جماعت اسلامی)، راجہ فاروق حیدر (پاکستان مسلم لیگ ن)، جسٹس عبد المجید ملک (لبریشن لیگ)، سردار انور خان (سابق صدر آزاد کشمیر)، مولانا نذیر فاروقی (جمعیۃ علماء اسلام)، چودھری منیر حسین (شہید بھٹو گروپ) اور گلگت بلتستان اسمبلی کے سابق ارکان قاری عبد الحکیم، حاجی شاہ بیگ، مولانا حق نواز، مولانا صادق، محمد کفیل، عطاء اللہ، مولانا عبد الغیاث، جناب نور الباری اور مشتاق احمد ایڈووکیٹ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان راہنماؤں نے باہمی مشاورت سے جو متفقہ موقف طے کیا ہے وہ درج ذیل ہے:

”آزاد کشمیر و گلگت بلتستان کو آرڈینیشن کمیٹی (اہم نکات)

۱۸۴۷ء میں جب معاہدہ امرتسر ہوا اور برطانوی ہند نے ریاست جموں و کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تو ریاست جموں وکشمیر میں گلگت بلتستان شامل تھا۔ استور اور بلتستان کو مہاراجہ کے کنٹرول میں رکھا گیا جب کہ گلگت اور ملحقہ ریاستوں کا دفاعی کنٹرول اپنے پاس رکھا اور انتظامی امور

مہاراجہ کے گورنر گھنسارا سنگھ کے حوالے کیا گیا۔

برصغیر کی تقسیم جس فارمولے کے تحت پایہ تکمیل تک پہنچنا تھی، اس کے تحت ریاست جموں و کشمیر جو مسلم اکثریتی ریاست تھی کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا، لیکن ہندو بنیے نے مختلف حیلوں بہانوں سے مہاراجہ سے ساز باز کر کے ریاست کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی جموں و کشمیر کے بیشتر علاقوں میں آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ مجاہدین آزادی نے گلگت بلتستان اور موجودہ آزاد کشمیر سے ڈوگرہ افواج کو مار بھگایا۔ مجاہدین ایک کے بعد دوسرے علاقے کو فتح کرتے ہوئے سری نگر کی دہلیز تک پہنچے۔ بھارت نے اس صورت حال سے گھبرا کر اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا جس کے نتیجے میں سیز فائر ہوا اور مجاہدین آزادی کو واپس بلا لیا گیا۔ یوں ریاست جموں و کشمیر ایک متنازعہ مسئلے کے طور پر اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر آ گئی۔

پاکستان نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں پوری ریاست جموں و کشمیر جس میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان شامل ہیں کو بھارت اور پاکستان کے مابین ایک متنازعہ علاقے کی حیثیت دے رکھی ہے۔ لیکن بھارت نے اقوام متحدہ کی قراردادوں سے انحراف کرتے ہوئے بعد میں مقبوضہ کشمیر کو اپنا حصہ بنا لیا اور کشمیریوں کو بین الاقوامی فورم پر تسلیم شدہ حق خود ارادیت دینے سے انکاری ہے۔ آزادی کے بعد آزاد کشمیر کی لیڈر شپ نے انتظامی دشواریوں کے باعث گلگت بلتستان کو عارضی طور پر معاہدہ کراچی کے ذریعے پاکستان کے سپرد کیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی حکومتیں گزشتہ پینسٹھ سالوں سے گلگت بلتستان میں کوئی قابل قبول آئینی جمہوری نظام تشکیل دینے میں ناکام ہو چکی ہیں اور بیورو کریسی کے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی نے وہاں مختلف طبقات اور گروہوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ سیاسی اور جمہوری روایات مفقود ہوئیں۔

پاکستان میں بعض سیاسی حکومتوں کے ادوار میں گلگت بلتستان میں اصلاحاتی پیکیجز دیے گئے لیکن ایک کے بعد دوسرے پیکج کی ناکامی نے گلگت بلتستان کو ایک جانب اہل کشمیر اور مسئلہ کشمیر سے دور رکھا، دوسری جانب انتظامی اور ترقیاتی منصوبے قلیل بجٹ کے باعث وسیع وعریض علاقے کو جدید ترقی سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ چنانچہ پاکستان کو اپنی منزل اور مقبوضہ کشمیر کی آزادی کو اپنا اولین فریضہ قرار دینے والے محبّ وطن گلگت بلتستان کے عوام کی عظیم اکثریت نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کی سالمیت اور مقبوضہ کشمیر کی آزادی کا یہ تقاضا ہے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان جو ریاست جموں وکشمیر کا حصہ ہیں، کو باہم مربوط ہو کر ایک پلیٹ فارم تشکیل دینا ہوگا۔ لہٰذا تنظیم اہل سنت گلگت بلتستان و کوہستان، دیامر قومی جرگہ جس میں تمام جماعتوں کی نمائندگی ہے اور گلگت بلتستان کے طول وعرض میں موجود پاکستان اور کشمیر سے محبت رکھنے والے عمائدین وعلمائے کرام نے ایک مشترکہ وفد کی صورت میں آزاد کشمیر کے تمام سیاسی قائدین سے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں کیں۔

دونوں طرف سے قائدین پر مشتمل ایک مشاورتی اجلاس ۷ جنوری ۲۰۱۳ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ جس میں درج ذیل نکات پر مکمل اتفاق کرتے ہوئے اعلامیہ جاری کیا گیا:

☆ آزاد کشمیر و گلگت بلتستان کی قیادت نے اپنے ایک مشاورتی اجلاس میں تحریک آزادیٔ کشمیر کی تقویت اور پاکستان کی سلامتی کے لیے ریاست کے دونوں آزاد حصوں کے ایک مشترکہ آئینی اور انتظامی ڈھانچے کی تشکیل پر اتفاق کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ ریاست کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی ہر سازش کا بھرپور مقابلہ کیا جائے گا۔

☆ اجلاس میں آزاد جموں وکشمیر کے عبوری آئین اور گلگت بلتستان کے موجودہ انتظامی بندوبست کو بھی کشمیریوں کی وحدت کے مغائر قرار دیا اور گلگت

بلتستان میں مسلسل بدامنی اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے وہاں موجودہ پیکج گورنس آرڈر ۲۰۰۹ء کے تحت قائم ہونے والے نظام کی ناکامی قرار دیا۔ مذہبی و سیاسی تنظیموں اور کشمیری قیادت کی تجاویز کو نظرانداز کرتے ہوئے وہاں مسلط کیا گیا۔

☆ گلگت بلتستان کی سٹریٹیجک اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہاں فی الفور ایک ایسا آئینی اور جمہوری انتظام کیا جائے جسے تمام سیاسی جماعتوں اور مکاتب فکر کا اعتماد حاصل ہو اور خطے کی تاریخی پس منظر کی روشنی میں آزاد جموں وکشمیر کے ساتھ آئینی اور انتظامی لحاظ سے مربوط ہو تا کہ ریاست کے دونوں حصے تحریک آزادی کشمیر کے لیے بیس کیمپ کا کردار ادا کر سکیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کے عزائم ناکام ہو سکیں۔

☆ اجلاس نے مندرجہ بالا نکات پر مشتمل امور کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک مشترکہ کوآرڈینیشن کمیٹی بنانے پر اتفاق کیا۔ جس میں آزاد کشمیر کے تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین اور گلگت بلتستان سے آئے ہوئے جرگہ کے ممبران اور علمائے کرام وزعماء شامل ہیں۔

☆ اجلاس نے متفقہ طور پر سردار محمد انور خان سابق صدر آزاد کشمیر کو کوآرڈی نیشن کمیٹی کا صدر اور مشتاق احمد ایڈووکیٹ نائب امیر جماعت اسلامی آزاد جموں وکشمیر کو سیکرٹری نامزد کیا۔‘‘

ہم آزاد جموں وکشمیر اور گلگت بلتستان کے مذہبی وسیاسی قائدین کو ایک متوازن اور مشترکہ موقف اختیار کرنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں، حکومت پاکستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کی تمام دینی و سیاسی جماعتوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ وطن عزیز کے وسیع تر مفاد اور مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس موقف کی بھرپور حمایت کریں اور اس کو عملی شکل میں لانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور...... ۱۳ فروری ۲۰۱۳ء)

مسئلہ کشمیر

﴿عالمی قوتوں کا کردار﴾

کشمیر کا مسئلہ اور بھارتی وزیرخارجہ اٹل بہاری واجپائی کی دھمکی

بھارتی وزیرخارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کو دھمکی دی ہے کہ وہ کشمیر کے بارے میں فضول باتیں کرنے سے باز رہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کشمیر کے حق خودارادیت کی بات کر کے آگ سے کھیل رہا ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اقوام متحدہ نوآبادیوں کی فہرست سے کشمیر کا نام خارج کر دے۔

ایک طویل عرصہ کے بعد کشمیر کے مسئلہ پر بھارتی وزیرخارجہ کا یہ بیان اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ بھارت نے کشمیر کی متنازعہ حیثیت کو ختم کرنے کی جو مہم مقبوضہ کشمیر کو بھارت کا حصہ بنا کر شروع کی تھی، اب وہ اس سلسلہ میں مزید پیشرفت کرنے والا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر تقسیم ہند کے بعد سے ہی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ایک متنازعہ خطہ چلا آ رہا ہے اور اس کی متنازعہ حیثیت بین الاقوامی طور پر مسلم ہے۔ اس مسئلہ پر دونوں ملکوں کے درمیان خونریز جنگیں ہو چکی ہیں اور اقوام متحدہ میں دونوں ملک اس بات کی پابندی قبول کر چکے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ آزادانہ و غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ خود کشمیری عوام کریں گے۔ لیکن بھارت نہ صرف غیر جانبدارانہ رائے شماری کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے گریز کر رہا ہے بلکہ اس نے کشمیر کو بھارت کا باقاعدہ حصہ بنانے کے لیے بھی اقدامات کیے ہیں اور اس سلسلہ میں عالمی رائے عامہ کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔

مسٹر باجپائی کی یہ دھمکی اور اس میں آگ سے کھیلنے کا ذکر عالمی رائے عامہ کے لیے لمحہ فکریہ ہے

اور یہ فیصلہ کرنا عالمی رائے عامہ، اقوام متحدہ اور بین الاقوامی طاقتوں کا کام ہے کہ وہ بھارت کو اقوام متحدہ کی قراردادوں اور بین الاقوامی اصولوں کا مذاق اڑانے اور کھلم کھلا ان کی خلاف ورزی کرنے سے کس طرح باز رکھتے ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں عالمی رائے عامہ اور اقوام متحدہ کو توجہ دلانے اور تحریک کرنے میں حکومت پاکستان پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ حکومت پاکستان اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور......۱۵ دسمبر ۱۹۷۸ء)

کشمیر کا جھگڑا اور عالمی رویہ

......ہماری ان گزارشات کا مقصد یہ تاثر دینا نہیں ہے کہ امریکہ کی بجائے دوسری عالمی طاقت روس کے ساتھ وابستگی کی صورت میں شاید صورتِ حال کچھ مختلف ہوتی کیونکہ مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان میں ہم روس کا کردار بخوبی دیکھ چکے ہیں کہ وابستہ ممالک کے ساتھ اس کی وفاداری بھی یک طرفہ مفادات تک محدود ہے۔ اور چونکہ امریکہ اور روس دونوں استعماری قوتیں ہیں اس لیے مفادات کے ٹکراؤ کے باوجود ان کے مزاج، ذہنیت اور طریقِ واردات میں کسی قسم کے فرق اور تفاوت کا تصور کرنا قطعی طور پر ایک غیر منطقی بات ہوگی۔

ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کا جھگڑا طے شدہ منصوبہ کے مطابق صرف اس لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ یہ دونوں ملک اپنے وسائل اور توانائیوں کو ترقی پر خرچ کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی اور نفرت انگیزی کے لیے وقف کیے رکھیں اور عالمی قوتوں کا دستِ نگر بننے پر مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کی واضح قراردادوں اور فیصلوں کے باوجود اس مسئلہ کے حل میں عالمی طاقتوں کی عدم دلچسپی ان کی اس خواہش کی آئینہ دار ہے کہ مسئلہ کشمیر کا وجود قائم رہے تاکہ ان دونوں ملکوں کی عالمی قوتوں کے ساتھ وابستگی میں کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔ سابق صدر ایوب خان کے دور میں پاکستان کی سرزمین سے امریکی اڈوں کے خاتمہ، پھر اس کے بعد سیٹو سے پاکستان کی علیحدگی اور اب غیر جانبدار تحریک کے ساتھ عملی وابستگی کے باعث بظاہر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ پاکستان شاید مکمل غیر جانبداری کی شاہراہ پر گامزن ہو رہا ہے مگر ایرانی انقلاب کے بعد جنوبی ایشیا میں امریکی مفادات کے مخدوش مستقبل اور افغانستان میں روس کی مسلح مداخلت سے پاکستان کی سالمیت کو درپیش خدشات نے

غیر جانبداری کی طرف پاکستان کی خارجہ پالیسی کی پیشرفت کو نہ صرف بریک لگا دی ہے بلکہ گاڑی ریورس گیئر میں آ چکی ہے اور ایکسیلیریٹر پر باہمی مفادات کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

اس وقت امریکہ پاکستان کی سیاسی، اقتصادی اور فوجی امداد میں بظاہر خاصی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور مبینہ طور پر بعض ناگزیر تحفظات اور مصلحتوں کو بھی نظرانداز کر رہا ہے جس کا مقصد شاید یہ ہے کہ پاکستانی عوام کو اس سلسلہ میں گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کا احساس دلایا جائے۔ پروپیگنڈا کے عالمی اور قومی محاذ پر اس تاثر کو اجاگر کرنے میں امریکہ اور اس کے حواریوں کو ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے لیکن صورتِ حال کا حقائق اور واقعات کی بنیاد پر تجزیہ کیا جائے تو امریکہ کی اس بظاہر فراخدلی اور پاکستان دوستی کے پسِ منظر میں باہمی مفادات کے مساویانہ اشتراک یا ایک آزاد اور خودمختار قوم کو اس کی آزادی اور خودمختاری کے تحفظ کے لیے باوقار طور پر مدد دینے کا جذبہ کارفرما دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس ظاہری فراخدلی کی بنیاد بھی اسی مخصوص استعماری ذہنیت اور سامراجی مزاج پر کھڑی نظر آتی ہے جس کا مقصد ضرورت مند ممالک کے گرد اپنے مخصوص استعماری مفادات کے شکنجے کو تنگ سے تنگ کرتے چلے جانا ہے......

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور......۲۶ جون ۱۹۸۷ء)

مسئلہ کشمیر:
سعودی فرمانروا کے حوالے سے ایک خبر

گزشتہ ہفتے سعودی مملکت کے فرمانروا شاہ فہد کے ساتھ حکومت پاکستان کے ایک وفد کی ملاقات کے حوالے سے یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے کہ شاہ فہد مسئلہ کشمیر پر اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے والے ہیں۔ معلوم نہیں اس خبر کی حقیقت کیا ہے لیکن جہاں تک اسلامی سربراہی کانفرنس کا اجلاس طلب کرنے کی ضرورت ہے اس سے انکار یا صرفِ نظر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

کشمیری حریت پسند جس جرأت و استقلال کے ساتھ حصولِ آزادی کے لیے اپنے خون کی قربانی دے رہے ہیں اور افغان مجاہدین کے گیارہ سالہ کامیاب جہادِ آزادی کو آخری مراحل میں جس طرح سازشوں کے ذریعے ناکامی میں بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مسلم سربراہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور افغانستان و کشمیر کے ساتھ ساتھ فلسطین، آذربائیجان، مورو، اریٹیریا، اراکان (برما) اور وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں میں ابھرنے والی آزادی کی تحریکات کے حوالہ سے اپنے اجتماعی کردار کا تعین کریں۔

یہ درست ہے کہ مسلم ممالک کے بیشتر موجودہ حکمرانوں کے شخصی اور گروہی مفادات استعماری قوتوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ اس وقت اس دوراہے پر کھڑے ہیں کہ عالم اسلام میں آزادی، غلبۂ اسلام اور دینی بیداری کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دیں یا مسلم ممالک کے موجودہ فرسودہ انتظامی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچوں کے تحفظ کی ناکام تگ و دو میں لگے رہیں۔ لیکن مسلم

حکمرانوں کو ایک بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ عالم اسلام اب خواب غفلت سے بیدار ہو رہا ہے اور اگر ان حکمرانوں نے بیداری اور آزادی کی ان لہروں کے مخالف سمت چلنے کی کوشش کی تو تاریخ میں ان کا یہ جرم کبھی معاف نہیں ہوگا۔

اس پس منظر میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلم حکمران اگر اپنے مثبت اور مؤثر کردار کا تعین کرتے ہیں تو نہ صرف افغانستان، کشمیر، فلسطین اور دیگر خطوں کے مظلوم مسلمان ان کے شکر گزار ہوں گے بلکہ انہیں اپنی گزشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کا راستہ بھی مل جائے گا۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... مئی ۱۹۹۰ء)

امریکہ اور خودمختار کشمیر

نوائے وقت لاہور ۲۲ جولائی ۱۹۹۶ء نے خبر رساں ایجنسی این این آئی کے حوالے سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے خودمختار کشمیر کا منصوبہ بنالیا ہے اور اس کے لیے اس کے سفارتکار متحرک ہوگئے ہیں۔

مسئلہ کشمیر کے ساتھ امریکہ اور دیگر مغربی قوتوں کی دلچسپی صرف اس قدر رہی ہے کہ وہ اسے جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کے درمیان حالتِ جنگ کو مسلسل برقرار رکھنے کے لیے ایک ضرورت سمجھتے رہے ہیں، اوران کی اب تک کی پالیسیاں اسی ضرورت کے گرد گھومتی رہی ہیں۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے امریکہ بہادر کی طرف سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی خواہش سامنے آرہی ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی امریکہ کی ایک ضرورت صاف جھلک رہی ہے کہ اسے چین سے نمٹنے کے لیے اس کے پڑوس میں ایک مضبوط فوجی بیس درکار ہے، جو ظاہر ہے کہ کشمیر سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اس قسم کی تجاویز سامنے آرہی ہیں کہ کشمیر کا جو علاقہ پاکستان کے پاس ہے وہ اس کے پاس رہنے دیا جائے، اور جموں کا علاقہ بھارت کو دے کر وادیٔ کشمیر کو خودمختار ریاست بنا دیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ نوزائیدہ خودمختار کشمیر کو اپنے تحفظ اور بقا کے لیے عالمی طاقتوں کی امداد اور سہارے کی ضرورت ہوگی، اور امریکہ بہادر اسے اپنی گود میں لے کر یہ تحفظ آسانی کے ساتھ فراہم کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین پاکستان کے ساتھ اپنے بہتر تعلقات کے باوجود عالمی فورم پر کچھ عرصہ سے کھچا کھچا سا نظر آرہا ہے۔

گزشتہ چند ہفتوں سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں امریکی سفارت کاروں کی سرگرمیوں میں

جس طرح اضافہ ہوا ہے اس کے پیش نظر آزاد کشمیر کے وزیر اعظم سردار محمد عبد القیوم خان بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ ''کشمیر میں ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے''۔ اور لگتا ہے کہ امریکہ بہادر اب اس مسئلہ کو آخری انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

ہمیں کشمیری عوام اور مجاہدین سے ہمدردی ہے جو نصف صدی سے اپنے دینی تشخص کے تحفظ اور خود ارادیت کے مسلّمہ حق کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، اور ہم نے ان کی جدوجہد کی ہمیشہ حمایت کی ہے، لیکن ان کی طویل جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے اس انجام سے بھی ڈر لگ رہا ہے۔ گزشتہ روز جہادِ کشمیر کے محاذ پر کام کرنے والے ایک راہنما سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے اس خدشہ کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اب چونکہ خود کشمیری عوام جہاد میں شریک ہیں اس لیے ان کی مرضی کے بغیر کوئی حل ان پر مسلط نہیں کیا جا سکے گا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کر دیں کہ ان کے ہاں کوئی بات مشکل نہیں ہے، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ......اگست ۱۹۹۶ء)

مسئلہ کشمیر:
عالمی سازشیں، متحرک گروہ اور قابلِ قبول حل

۱۸ جون ۲۰۰۰ء کو دھیرکوٹ آزاد کشمیر کے مقامی صحافیوں کی تنظیم ’’گروپ آف ایسوسی ایٹڈ جرنلسٹس‘‘ نے ایک ہوٹل میں ’’مسئلہ کشمیر اور عالمی سازشوں کا آغاز‘‘ کے عنوان پر سیمینار کا اہتمام کیا جس میں آزاد جموں و کشمیر کے سابق وزیراعظم سردار عبد القیوم خان اور راقم الحروف کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ جبکہ گروپ کے چیئرمین جناب عابد علی عابد اور سیکرٹری جناب محمد ندیم نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ گروپ کے منتظمین کی طرف سے شرکاء کو بتایا گیا کہ مسئلہ کشمیر نے مجاہدین کی قربانیوں کی وجہ سے کارگل کے معرکہ کے بعد پھر سے عالمی سطح پر ایک اہم ایشو کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس کے ساتھ ہی مسئلہ کشمیر کو نقصان پہنچانے کے لیے کشمیری عوام کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ اس لیے اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ اس قسم کی فکری نشستوں کا اہتمام کیا جائے تاکہ مسئلہ کشمیر کی تازہ ترین صورتحال اور کشمیری عوام کے خلاف سازشوں سے ارباب علم و دانش اور عوام کی آگاہی کا سامان ہوتا رہے اور اسی مقصد کے لیے یہ سیمینار منعقد کیا گیا ہے۔ سردار محمد عبد القیوم خان نے زیر بحث موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی اور بعد میں شرکاء کے سوالات کے جوابات دیے جن میں سے زیادہ تر سوالات ان کے بعض متنازعہ بیانات کے بارے میں تھے۔ جبکہ اگلے روز سردار صاحب سے ان کے گھر غازی آباد میں ناشتے کی میز پر بھی مختلف امور پر بات چیت ہوئی۔ سردار عبد القیوم خان موجودہ حالات کے تناظر میں مسئلہ کشمیر، عالمی سازشوں، جہاد اور بین الاقوامی سرگرمیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اس

کے بارے میں اگلے کالم میں کچھ گزارشات پیش کی جائیں گی، سردست ان معروضات کو قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے جو مذکورہ سیمینار میں راقم الحروف نے شرکاء کے گوش گزار کی ہیں۔

راقم الحروف نے اس سیمینار میں اظہار خیال کی دعوت دینے پر ''گروپ آف ایسوسی ایٹڈ جرنلسٹس دھیر کوٹ'' کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ کشمیری عوام اور خطہ کشمیر کے خلاف عالمی سازشوں کے آغاز والی بات مجھے عجیب سی لگی ہے اس لیے کہ ان سازشوں کا آغاز آج نہیں ہوا بلکہ ان کا سلسلہ ایک طویل عرصہ سے جاری ہے بلکہ انہی سازشوں کے نتیجہ میں مسئلہ کشمیر پیدا ہوا اور اس مقام تک پہنچا ہے:

☆ کشمیر میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے اور یہاں صدیوں تک مسلم اقتدار قائم رہا ہے لیکن کشمیر کے مسلم تشخص کو نظر انداز کرتے ہوئے اس خطہ جنت نظیر کو چند ٹکوں کے عوض ہندو ڈوگروں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا جو کشمیری عوام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی۔

☆ تقسیم ہند کے موقع پر نظریاتی، جغرافیائی، اور ثقافتی ہر لحاظ سے کشمیر کو پاکستان کا حصہ سمجھا جا رہا تھا لیکن تقسیم پنجاب کے فارمولا میں جان بوجھ کر گورداس پور کو بھارت کے حوالہ کرنے کا اہتمام کیا گیا جس کا مقصد انڈیا کو کشمیر تک زمینی راستہ فراہم کرنا اور اسے فوجی دخل اندازی کا موقع دینا تھا۔ اگر گورداس پور بھارت کے حصہ میں نہ جاتا تو کشمیر کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا لیکن انگریزوں نے سازش کر کے اس مسئلہ کو کھڑا کیا اور یہ سازش صرف کشمیری عوام کے خلاف نہیں تھی بلکہ پاکستان اور جنوبی ایشیا کے تمام لوگوں کے خلاف تھی جس کے ذریعہ اس خطہ کے ممالک کو آمنے سامنے کھڑا کر کے ان کے وسائل اور توانائیوں کو ترقی و خوشحالی میں صرف ہونے کی بجائے باہمی محاذ آرائی کی آگ میں نصف صدی سے جھونکا جا رہا ہے۔

☆ پھر یہ بھی کشمیری عوام کے خلاف سازش تھی جب ۱۹۴۸ء کی جنگ میں سیز فائر قبول کر کے مجاہدین کشمیر کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا اور عالمی قوتوں اور برادری نے اس مسئلہ کو کشمیری عوام کے ہاتھ سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اسے دھیرے دھیرے سرد خانے میں ڈال دیا۔ عالمی برادری نے اس مسئلہ کو ہاتھ میں لے کر کشمیری

عوام سے وعدہ کیا کہ یہ مسئلہ ان کی آزادانہ رائے کے ذریعہ حل کیا جائے گا مگر اس وعدہ کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر اقوام متحدہ یا عالمی برادری کشمیری عوام کو ان کا یہ مسلمہ حق دلوانے کے لیے ابھی تک سنجیدہ نہیں ہے۔

☆ آج اگر کشمیر کا مسئلہ ایک بار پھر عالمی سطح پر اہم حیثیت اختیار کر گیا ہے تو اس کے پیچھے مجاہدین کشمیر کی عظیم قربانیاں، کم وبیش ستر ہزار شہداء کی جانوں کا نذرانہ، اور جہاد کشمیر کی وہ صبر آزما جدوجہد ہے جس میں نہ صرف مجاہدین بلکہ مقبوضہ کشمیر کے عام کشمیری مسلمان بھی ایثار اور قربانی کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کر رہے ہیں۔ اس جہاد کا اصل سرچشمہ جہاد افغانستان ہے جس نے کشمیر، فلسطین، کسووو، بوسنیا، چیچنیا، صومالیہ، اری ٹیریا، مورو، اراکان اور دنیائے اسلام کے دیگر علاقوں کے حریت پسندوں کو ہتھیار پکڑنا اور ظالم و غاصب کفار کے مقابلہ میں صف آراء ہونا سکھایا ہے اور اسی کی کوکھ سے جہاد کشمیر نے بھی جنم لیا ہے جو آج پورے جنوبی ایشیا بلکہ دنیا بھر کی توجہات کو اپنی جانب مبذول کیے ہوئے ہے۔

☆ عالمی فورم پر مسئلہ کشمیر کی اہمیت میں اضافہ کے لیے کارگل کے معرکہ اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے مگر اس میں بنیادی کردار مجاہدین کشمیر کا ہے جو اپنی جانوں پر کھیل کر مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اس کی اہمیت میں مسلسل اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔

اس پس منظر میں بین الاقوامی سطح پر جو قوتیں اور ادارے مسئلہ کشمیر میں دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کے حل کیلئے کسی نہ کسی درجہ میں متحرک نظر آتے ہیں ان کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) وہ ممالک جن کے مفادات اس مسئلہ کے ساتھ وابستہ ہیں، مثلاً امریکہ، چین، وسطی و جنوبی ایشیا کے ممالک، اور دیگر علاقائی قوتیں جو ظاہر ہے کہ اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کریں گی۔ ان کے مفادات میں ٹکراؤ بھی ہوگا اور یہ مفادات اور ان کا ٹکراؤ مسئلہ کشمیر کے حل پر اثر انداز بھی ہوگا۔

(۲) وہ قوتیں جو جہاد افغانستان کے عالمی اثرات بالخصوص دنیائے اسلام میں جہادی تحریکات

کے آغاز اور اسلامی گروپوں کی بیداری سے پریشان ہیں اور اس میں اضافہ کو ہر قیمت پر روکنا چاہتی ہیں۔ ان قوتوں کی خواہش ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کو جہاد کے حوالہ سے الگ کر دیا جائے اور کشمیر کی اسلامی حیثیت اور مجاہدین کشمیر کی جدوجہد کے حوالے سے کاٹ کر مسئلہ کشمیر کو ایک علاقائی مسئلہ کے طور پر حل کیا جائے۔

(۳) کچھ ادارے اور گروپ مخلص بھی ہوں گے جو فی الواقع اس مسئلہ کو حل کر کے علاقائی کشیدگی کو کم کرنا چاہتے ہیں اور کشمیری عوام کے حقوق اور آزادی سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس لیے ہمیں مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلہ میں بین الاقوامی طور پر متحرک سب گروپوں کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے اور نہ ہی ہر ایک کی کوشش کو سازش تصور کر لینا چاہیے بلکہ ان کے پس منظر، دلچسپی کی وجوہ اور مقاصد و عزائم کا تجزیہ کر کے انہیں ڈیل کرنا چاہیے۔

البتہ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں سازش، مفادات اور خیر خواہی کے عوامل میں فرق معلوم کرنے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی حد فاصل اور اصول ضرور قائم کر لینا چاہیے اور میرے خیال میں اس سلسلہ میں دو نکتے کسوٹی کا کام دے سکتے ہیں اور انہیں بہر حال پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) جموں و کشمیر کی وحدت کا برقرار رہنا اس خطہ کے عوام کا تاریخی حق ہے، اس لیے جو فارمولا یا کوشش کشمیر کی وحدت کو ختم کرنے اور اس خطہ جنت نظیر کو تقسیم کرنے کے حوالہ سے ہو میرے نزدیک وہ کشمیری عوام کے خلاف سازش ہے اور ایسی ہر کوشش کو مسترد کرنا چاہیے۔

(۲) کشمیر کی اسلامی نظریاتی حیثیت ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے جہاد کشمیر کے دوران لاکھوں کشمیری عوام کی مختلف النوع اور بے پناہ قربانیوں بالخصوص کم و بیش ستر ہزار شہداء کے خون نے اور زیادہ مستحکم کر دیا ہے، اس لیے جو فارمولا یا کوشش کشمیر کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنے یا کمزور کرنے کی غرض سے سامنے آئے وہ بھی کشمیر اور کشمیری عوام کے خلاف سازش ہے اور اسے سازش کے طور پر ہی دیکھا جانا چاہیے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ...... ۲۸ جون ۲۰۰۰ء)

مسئلہ کشمیر اور اقوامِ متحدہ کا دوہرا کردار

حسبِ معمول اس سال بھی ۵ فروری کو کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کا دن منایا جا رہا ہے۔ اس روز پاکستان بھر میں عام تعطیل ہو گی، جلسے اور مظاہرے ہوں گے، سیاستدان اور سماجی راہنما خطابات کریں گے، اور اس طرح خطہ کشمیر کے ان مظلوم عوام کے ساتھ یکجہتی اور ہم آہنگی کا اظہار کیا جائے گا جو گزشتہ نصف صدی سے آزادی کے لیے برسرپیکار ہیں۔

برصغیر کی تقسیم کے وقت ایک سازش کے تحت کشمیر کا تنازعہ کھڑا کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں حصہ جموں و کشمیر کا یہ خطہ

(۱) آزاد کشمیر (۲) مقبوضہ کشمیر اور (۳) شمالی علاقہ جات

کے تین الگ الگ حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والی پہلی جنگ کے موقع پر اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کراتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اس خطہ کے عوام کو آزادانہ استصوابِ کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق دیا جائے گا، لیکن اقوامِ متحدہ آج تک اس سلسلہ میں اپنی قراردادوں پر عملدرآمد کا اہتمام نہیں کر سکی۔ کشمیری عوام اپنے اس مسلّمہ اور جائز حقوق کے حصول کے لیے نصف صدی سے مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں اور اب تک لاکھوں جانوں کا نذرانہ اس مقصد کے لیے پیش کیا جا چکا ہے۔

کشمیری عوام کی یہ جدوجہد اپنے اس جائز حق کے لیے، جسے عالمی رائے عامہ اور اقوامِ متحدہ واضح طور پر تسلیم کر چکی ہے، اور عالمی فورم پر کشمیری عوام کے ساتھ دوٹوک وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا، مگر نہ بھارت اس کے لیے اب تک تیار نظر آتا ہے، اور نہ ہی اقوامِ متحدہ کشمیری عوام کے ساتھ کیے گئے اس وعدہ کو پورا

کرنے میں سنجیدہ نظر آتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف عراق اوراس کے بعد افغانستان کے بارے میں اپنی قراردادوں پر عملدرآمد میں اقوامِ متحدہ اس قدر حساس اور سبک رو ہے کہ اسے لاکھوں نہتے عوام اور بچوں کی بھوک اور موت کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

ان حالات میں کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی اور ہم آہنگی کے اظہار کے علاوہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ

☆ افغانستان، فلسطین، عراق، لیبیا، سوڈان اور کشمیر کے حوالے سے اقوامِ متحدہ کے دوہرے کردار اور منافقانہ طرز عمل کو بھی بے نقاب کیا جائے،

☆ اور مسلم دنیا کی رائے عامہ کو منظّم و بیدار کر کے مسلم ممالک کے حکمرانوں کو غیرت دلائی جائے کیونکہ عالمِ اسلام کے مسائل کے حل کی اصل کنجی ان کے پاس ہے، اور جب تک وہ مغرب کی دریوزہ گری ختم کر کے باہمی اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرتے ہوئے دینی حمیت و غیرت کا پرچم بلند نہیں کرتے، عالمی استعمار کی ظالمانہ اور منافقانہ پالیسیوں کا تسلسل اسی طرح جاری رہے گا۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... فروری ۲۰۰۱ء)

امتِ مسلمہ پر مظالم اور ’’دہشت گردوں‘‘ کا ردِ عمل

مشہور برطانوی اخبار ’’سنڈے ٹائمز‘‘ نے ۲۳ ستمبر کی اشاعت میں عمر شیخ کے بارے میں ایک رپورٹ چھاپی ہے۔ عمر شیخ برطانوی شہری ہیں اور بھارت کی قید سے مولانا مسعود اظہر کے ساتھ رہا ہونے والے دو ساتھیوں میں سے ایک ہیں۔ سنڈے ٹائمز کے مطابق عمر شیخ برطانوی نژاد پاکستانی نوجوان ہے جس نے لندن کے اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی ہے اور اپنے ریکارڈ کے مطابق ایک ذہین، محنتی اور شریف طالب علم شمار ہوتا رہا ہے، اس نے ہمیشہ تعلیم پر توجہ دی ہے اور رپورٹ کے مطابق اس سے اس کے خاندان کی توقع بھی یہی تھی جسے اس نے پورا کیا ہے۔ لیکن یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران بوسنیا میں مسلمانوں کے قتل عام پر اسے بے چینی ہوئی اور وہ ایک امدادی قافلہ کے ساتھ بوسنیا گیا مگر وہاں کے مناظر دیکھ کر اس کا ذہن تبدیل ہو گیا اور اس نے مجاہدین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد رپورٹ کے مطابق وہ ’’حرکۃ الانصار‘‘ سے وابستہ ہوا اور کشمیر جا پہنچا جہاں سے وہ گرفتار ہوا اور ایئر انڈیا کے طیارے کے اغوا کے بعد ہائی جیکروں کے مطالبہ پر جن لوگوں کو بھارت کی قید سے رہا کیا گیا ان میں وہ بھی شامل تھا۔ سنڈے ٹائمز نے عمر شیخ کا تعلق ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگان کے دھماکوں سے بھی جوڑ دیا ہے اور رپورٹ لکھنے والے کے نزدیک ان دھماکوں میں اس کا بنیادی کردار بتایا جاتا ہے۔

ان دھماکوں میں عمر شیخ کا کوئی کردار ہے یا نہیں مگر سنڈے ٹائمز کی رپورٹ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ عمر شیخ نے سنڈے ٹائمز کے بقول دہشت گردی کی ٹریننگ نہ گھر سے حاصل کی ہے

اور نہ ہی اسکول اور کالج میں اسے یہ ذہن اور تربیت ملی ہے۔ بلکہ اسے اس طرف لانے والا بنیادی کردار بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کا قتل عام ہے جن کی مدد کے لیے وہ وہاں گیا اور وہاں کے دل خراش مناظر نے اسے لندن کے اسکول میں پڑھنے والے ذہین اور شریف طالب علم سے کشمیر میں جہاد کرنے والا اور بھارت کی قید میں کئی سال کاٹنے والا مجاہد یا سنڈے ٹائمز کی زبان میں دہشت گرد بنا دیا۔ اس لیے اس حوالہ سے میں عالمی دانشوروں اور ورلڈ میڈیا کے ذمہ داروں سے پوچھنا چاہوں گا کہ اگر بوسنیا، مقدونیہ، کسووو، کشمیر، فلسطین اور دیگر مقامات پر مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے میں وہ سنجیدہ نہیں ہیں تو عمر شیخ جیسے مجاہدوں یا ان کے بقول دہشت گردوں کو پیدا ہونے سے وہ آخر کس طرح روک سکتے ہیں؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۴ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

کشمیر اور فلسطین: عالمی طاقتوں کی ترجیحات

تمام تر بین الاقوامی کوششوں کے باوجود پاک بھارت سرحد پر کشیدگی میں کمی نہیں آ رہی اور بین الاقوامی سرحد کے دونوں طرف فوجوں کے اجتماع اور جنگی تیاریوں کے ساتھ ساتھ کشمیر میں کنٹرول لائن پر جھڑپوں کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان اور بھارت کے حکمرانوں کے لہجے میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ کہیں کسی بھی طرف سے تھوڑی سی بے احتیاطی کسی بڑی جنگ کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ افغانستان کی عبوری حکومت کے سربراہ حامد کرزئی نے گزشتہ روز اسلام آباد کے دورہ کے موقع پر صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم بھارت واجپائی سے کہا ہے کہ وہ دونوں افغانستان آئیں اور جنگ میں افغانستان کی تباہی کا منظر دیکھ کر پھر فیصلہ کریں کہ انہوں نے جنگ کرنی ہے یا مذاکرات کے ذریعے اپنے تنازعات کا حل تلاش کرنا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی سرحد پر بھارتی افواج کا اجتماع اور اس اجتماع کو برقرار رکھنے پر بھارتی حکمرانوں کے اصرار کے ساتھ ساتھ جناب واجپائی اور ان کے رفقاء کا تلخ اور جارحانہ لہجہ پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے لیے ہے جس میں امریکہ اور دیگر مغربی قوتیں بھی بھارت کی ہمنوا ہیں۔ یہ دباؤ اس مقصد کے لیے ہے کہ حکومت پاکستان کو مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کے خلاف کشمیری حریت پسندوں کی عسکری کارروائیوں کو مکمل طور پر بند کرانے کے لیے مجبور کیا جائے جبکہ حکومت پاکستان نے اس کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ مگر اس وعدہ کو کافی نہیں سمجھا جا رہا اور حکومت پاکستان پر زور دیا جا رہا ہے کہ وہ کشمیری حریت پسندوں کی جہادی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے بھارتی

ایجنڈے کے مطابق کام کرے اور کشمیری مجاہدین کی امداد کے لیے جانے والے پاکستانی مجاہدین کا راستہ روکنے کے علاوہ خود کشمیری حریت پسندوں کو عسکری کارروائیوں سے روکنے اور ان کی عسکری صلاحیت کو ختم کرنے میں بھی بھارت کا ساتھ دے۔

یہ وہی صورتحال ہے جو فلسطین میں اس سے قبل ہم دیکھ چکے ہیں کہ جناب یاسر عرفات کو عسکری زندگی سے نکال کر مذاکرات کی میز پر لانے کے بعد اس بات پر مسلسل مجبور کیا جا رہا ہے کہ جو فلسطینی لوگ مذاکرات کے عمل کو قبول نہ کرتے ہوئے عسکری کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہیں انہیں عسکری کارروائیوں سے باز رکھنے یا ان کے باز نہ آنے کی صورت میں انہیں کچلنے اور ان کی عسکری صلاحیت کو مفلوج کرنے کے لیے بھی یاسر عرفات کردار ادا کریں۔ بلکہ اس مقصد کے لیے اسرائیل کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں اور فلسطینی حریت پسندوں کو غیر مؤثر بنانے کے لیے اسرائیل کی طرف سے جو تجاویز دی جائیں یاسر عرفات ان پر کسی حیل وحجت کے بغیر عملدرآمد کا اہتمام کریں۔

دباؤ ڈالنے والوں کو اس سے غرض نہیں کہ مذاکرات کے عمل کو مسترد کر کے عسکری کارروائیاں جاری رکھنے والے فلسطینی مجاہدین جناب یاسر عرفات کے زیر اثر بھی ہیں یا نہیں اور یاسر عرفات ان مجاہدین کو عسکری کارروائیوں سے روکنے پر اختیار بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ انہیں صرف اس بات سے دلچسپی ہیکہ یہ عسکری کارروائیاں بہرحال رکنی چاہئیں تا کہ یاسر عرفات کو فلسطین کی تقسیم کے اس فارمولے پر دستخط کے لیے مجبور کیا جا سکے جو مغربی قوتوں نے اسرائیل کے مفادات کے تحفظ کے لیے از خود طے کر رکھا ہے۔ اور ان مغربی قوتوں کا اصرار ہے کہ اگر یاسر عرفات فلسطینی مجاہدین کی عسکری کارروائیوں کو روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو وہ ان مجاہدین کو کچلنے میں اسرائیل کے ساتھی بنیں۔

کم وبیش اسی طرح کی صورتحال کا اہتمام کشمیر کے حوالہ سے بھی کر لیا گیا ہے کہ بین الاقوامی فورم پر کشمیر کی بات کرنے والی پاکستانی حکومت کو مذاکرات کی راہ پر لا کر عسکری کارروائیاں بند کرنے کے لیے ریڈ سگنل دیے جا رہے ہیں اور حکومت پاکستان سے توقع کی جا رہی ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی آرمی سے نبرد آزما کشمیری مجاہدین اور ان کے معاونین کی عسکری کارروائیوں کو بند کرانے کی ذمہ داری قبول کرے۔

عام تاثر یہی ہے کہ بھارتی فوجوں کا اجتماع اور بھارتی حکمرانوں کے لہجے کی تلخی حکومت پاکستان کواسی ایجنڈے پرلانے کی غرض سے دباؤ ڈالنے کے لیے ہے۔لیکن زمینی حقائق کا منظریہ ہے کہ حکومت پاکستان ان پاکستانیوں کوتو کشمیری مجاہدین کی مدد کے لیے جانے سے روک سکتی ہے جو کشمیری حریت پسندوں کی جدوجہد کو جہاد سمجھتے ہوئے دینی جذبہ کے تحت ان کی مدد کے لیے جاتے ہیں، کیونکہ شرعی مسئلہ یہی ہے کہ اگر کسی مسلم خطہ پر غیر مسلموں کا تسلط ہو جائے اوراس خطہ کے مسلمان اپنی آزادی اور دینی تشخص کے تحفظ کے لیے اکیلے جنگ لڑنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو پڑوس کے علاقوں کے مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہےکہ وہ ان کی مدد کو پہنچیں اوران کے شانہ بشانہ ظالم و غاصب قوت کے خلاف جنگ لڑ کر ان کے معاون بنیں۔حتیٰ کہ فقہاء اسلام کی تصریحات کے مطابق یہ فریضہ درجہ بدرجہ پھیلتے ہوئے پورے عالم اسلام تک وسعت اختیار کر جاتا ہے۔اس لیے یہ تو ہوسکتا ہے کہ حکومت پاکستان پر پوراد باؤ ڈال کراور ہرقسم کی سختی روا رکھتے ہوئے پاکستانی نوجوانوں کوکشمیری مجاہدین کی مدد کے لیے جانے سے روک دے لیکن ان ہزاروں کشمیری نوجوانوں کوحکومت پاکستان کیسے روک سکتی ہے جواپنے وطن کی آزادی اوراپنے دینی تشخص کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار ہوکر گزشتہ نصف صدی سے جانوں کی قربانیاں پیش کررہے ہیں۔

اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کنٹرول لائن بین الاقوامی سرحدنہیں بلکہ ایک متنازع ریاست کی اندرونی کنٹرول لائن ہے جسے تنازعہ کے تصفیہ سے قبل عملی طور پر بین الاقوامی سرحد کا درجہ دینا اوراس کے حوالہ سے بین الاقوامی قوانین اور تقاضوں کی پابندی پر اصرار ناقابل عمل ہونے کے علاوہ سراسر ناجائز اور ناروا بھی ہے۔مگر امریکہ اور دیگر بین الاقوامی قوتیں جس سنجیدگی کے ساتھ اس سلسلہ میں سرگرم عمل ہیں اس سے لگتا یہی ہے کہ قانون، اصول، اخلاق، اور انصاف کے تقاضوں کوایک طرف رکھتے ہوئے افغانستان کی طرح کشمیر کے بارے میں بھی پاکستان کودوراہے پرلا کر ''گن پوائنٹ'' پراس سے حتمی فیصلہ لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔اورڈر لگ رہا ہے کہ کہیں ایک بار پھر ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر لاکھوں کشمیریوں کے خون کو بین الاقوامی خواہشات کی بھینٹ نہ چڑھا دیا جائے۔

ایک دور میں جب یاسر عرفات فلسطین کی مکمل آزادی کی جدوجہد کی قیادت کررہے تھے اور

فلسطین کی تقسیم کے فارمولے کو قبول نہ کرتے ہوئے فلسطینی قوم اور فلسطین کی وحدت کی جنگ لڑ رہے تھے، میں اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ کشمیر کو بھی ایک عدد یاسرعرفات کی ضرورت ہے جو اقتدار کی سیاست سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف کشمیر کی آزادی کے لیے یاسرعرفات کی طرح بین الاقوامی سطح پر متحرک ہو جائے۔ اگر باغ آزاد کشمیر کے شہریوں کو یاد ہو تو دارالعلوم تعلیم القرآن باغ کے ایک سالانہ جلسہ میں اس پر میں نے مفصل تقریر کی تھی کہ کشمیر کو ایک عدد یاسرعرفات کی ضرورت ہے اور میرے نزدیک اس کے لیے سردار عبدالقیوم خان سب سے موزوں شخصیت ہیں بشرطیکہ وہ خود کو آزاد کشمیر کے اقتدار کی سیاست بالاتر کر لیں۔ اس وقت میرے جذبات یہی تھے لیکن نیرنگئ زمانہ یا نیرنگئ سیاست کا کرشمہ دیکھئے کہ آج جب سردار عبدالقیوم پورے شعور اور ہوش حواس کے ساتھ یاسرعرفات بنتے جارہے ہیں تو مجھے ان پر ترس آرہا ہے اور دل کی گہرائیوں سے دعا کر رہا ہوں کہ ''یا اللہ اس مردِ دانا کو یاسرعرفات بننے سے بچالے، آمین یارب العالمین''۔

بہرحال بین الاقوامی سرحد پر بھارتی افواج کے اجتماع، کنٹرول لائن پر جھڑپوں میں اضافہ، اور پاکستان سے ''دہشت گردی'' کو کنٹرول کرنے کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرنے کا اصرار اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ عالمی قوتیں اس خطہ میں بھی حالات کو کسی نہ کسی حتمی نتیجے تک جلد از جلد پہنچانے کے لیے سرگرم عمل ہو چکی ہیں۔ ان حالات میں عالمی قوتوں کے مفادات تو واضح ہیں اور ان کی ترجیحات بھی مبہم نہیں ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا ہم نے اپنے مفادات، تاریخ، ترجیحات، اور ملی تقاضوں کو ایک بار پھر بین الاقوامی خواہشات اور عالمی قوتوں کے مفادات کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۴ جون ۲۰۰۲ء)

مسئلہ کشمیر
اور برطانوی وزیر خارجہ کا عذرِ لنگ

’’آن لائن‘‘ کی رپورٹ کے مطابق برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا نے گزشتہ دنوں انٹرنیٹ پر مختلف لوگوں کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا کہ

> ’’وہ جنوبی ایشیا میں پاکستان قیام کے وقت مسئلہ کشمیر کا تنازعہ کھڑا کرنے میں برطانوی کردار پر معذرت نہیں کریں گے جس کی ایک وجہ انہوں نے یہ بیان کی کہ وہ اس وقت بہت چھوٹے تھے اور دوسری وجہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ کشمیر کا تنازعہ پیدا کرنے میں برطانیہ نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔‘‘

جہاں تک برصغیر کی آزادی کے وقت جیک اسٹرا کے چھوٹا بچہ ہونے کا تعلق ہے تو ان کی یہ بات قابل توجہ ہے لیکن ان کا یہ خیال کہ کشمیر کا جھگڑا کھڑا کرنے میں برطانیہ کا کوئی کردار نہیں ہے، تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ برطانوی استعمار اور ان کے گماشتوں نے برصغیر میں حکومت کا کاروبار سنبھالنے کے بعد کشمیر کے معاملات میں ہر دور میں مداخلت کی جو کہ ہر بار کشمیر میں صدیوں سے آباد مسلم اکثریت کی بجائے ان پر غاصبانہ تسلط جمانے والے غیر مسلم حکمرانوں کے مفاد میں رہی۔ راجہ گلاب سنگھ جموں میں پنجاب کے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کا گورنر تھا۔ مگر پنجاب میں سکھوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزی عملداری قائم ہونے کے مرحلے میں فرنگی حکمرانوں نے گلاب سنگھ سے ساز باز کر کے اسے وادیٔ کشمیر پر حکمرانی کا حق پچھتر لاکھ روپے کے عوض بیچ دیا۔ اور جب وادیٔ کشمیر کے مسلم حکمران شیخ امام دین نے کشمیر پر گلاب سنگھ کے

قبضے میں مزاحمت کر کے اس کی فوجوں کو شکست دی تو وادیٔ کشمیر پر مسلم حکمران کا اقتدار ختم کرنے اور متعصب ہندو ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کا اقتدار قائم کرنے کیلئے برطانوی سامراج کی فوجیں آگے بڑھیں اور انہوں نے امام دین کو شکست دے کر وادیٔ کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ کو دلایا۔

یہ گلاب سنگھ وہی ہے جو راجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے جموں کا حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی فوجوں کا کمانڈر بھی تھا۔ اس نے شہدائے بالاکوٹ کے خلاف پشاور اور اس کے گردونواح میں لڑنے والی رنجیت سنگھ کی فوجوں کی کمان کی تھی اور نہ صرف امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور امام المجاہدین شاہ اسماعیل شہیدؒ کے خلاف جنگ لڑی بلکہ بالاکوٹ میں امام المجاہدین کی شہادت کے بعد جموں کے ساتھ ملحقہ علاقہ پونچھ میں ان مسلمانوں کے خلاف شرمناک انتقامی کارروائیوں کا بازار گرم کر دیا، سینکڑوں مسلمان شہید کر دیے، ہزاروں کو بے گھر کر دیا تھا، اور دو مجاہدوں سردار ملی اور سبز علی خان کو منگ کے قریب درخت سے لٹکا کر زندہ حالت میں ان کی کھالیں اس جرم میں کھنچوا دی تھیں کہ انہوں نے ہزارہ کی شورش میں حصہ لیا تھا۔

گلاب سنگھ کے اقتدار کا دائرہ جموں سے وادیٔ کشمیر تک وسیع کرنے کا کردار برطانوی حکمرانوں نے ادا کیا تھا جس کے بعد سے اس مظلوم وادی کے مسلمان اب تک یعنی کم وبیش پونے دوصدیوں سے ہندو استعمار کے مظالم کا شکار چلے آرہے ہیں۔ اس پر ہوسکتا ہے جیک اسٹرا یہ کہہ دیں کہ یہ جس دور کی بات کی جارہی ہے اس وقت میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا لیکن بات ان کی ذات یا خاندان کی نہیں ہو رہی بلکہ ان کے ملک اور قوم کے کردار کا حوالہ دیا جا رہا ہے جس کے وہ وزیر خارجہ ہیں۔ اس لیے وہ اس ذمہ داری سے خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے اور نہ ہی ان کے اس عذر کو دنیا کا کوئی معقول شخص سننے کیلئے تیار ہوگا۔

اس کے بعد کے بہت سے مراحل سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس مرحلے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جب برصغیر تقسیم ہو رہا تھا اور پاکستان کا قیام عمل میں لایا جا رہا تھا، اس وقت اگر برطانیہ کو کشمیر کے مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی ہوتی تو وہ ان کے ڈیڑھ سوسالہ زخموں پر مرہم رکھتا اور انہیں ڈوگرہ شاہی اقلیت کے تسلط سے نجات دلانے کیلئے کردار ادا کرتا۔ لیکن برطانیہ نے صرف اپنے مفادات کی خاطر آزاد ہونے والے دو ملکوں پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعے اور کشیدگی کی فضا کو

مستقل طور پر قائم رکھنے کیلئے جھگڑا قائم کرنا ضروری سمجھا اور اس کے لیے کشمیر کی مظلوم وادی کو سب سے بہتر پوائنٹ قرار دیتے ہوئے اسے پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ خطہ بنا دینے کیلئے سازشوں کا جال بچھا دیا۔

ریاست جموں وکشمیر کی فطری کیفیت یہ تھی کہ اس کا الحاق پاکستان ہی کے ساتھ ممکن تھا۔ غالب مسلم اکثریت کی آبادی کے ساتھ ساتھ ریاست میں داخل ہونے کے تمام مصروف راستے پاکستان سے ملحق تھے اور صرف ایک راستہ گورداس پور بھارت کے ساتھ تھا۔ برطانوی حکمرانوں نے پنجاب کی تقسیم میں پہلی ڈنڈی یہ ماری کہ مسلم اکثریت کے اضلاع پاکستان میں شامل کرنے کی بجائے ان اضلاع کی اندرونی کانٹ چھانٹ بھی ضروری قرار دی جس کے نتیجے میں تقسیم در تقسیم کے عمل نے نہ صرف پنجاب کا حلیہ بگاڑ دیا بلکہ شرمناک خونریزی اور مسلم کش فسادات کے ساتھ ساتھ لاکھوں خاندان کے بے گھر ہونے کے اسباب بھی فراہم کیے۔

پنجاب کی تقسیم اور بین الاقوامی سرحد کے تعین کیلئے برطانوی لارڈ ریڈ کلف کی سربراہی میں جو سرحدی کمیشن قائم ہوا اس کی کارستانیوں کی ایک پوری داستان ہے جن کے تذکرہ کا یہاں موقع نہیں۔ البتہ گورداس پور کو پاکستان کی بجائے انڈیا کے حوالے کرنے کیلئے جو ڈرامہ کھیلا گیا وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ گورداس پور کی تحصیل کی صورتحال یہ تھی کہ اس میں مسلمان، سکھ اور ہندوؤں کے علاوہ قادیانی بھی آباد تھے اور ان کا مرکز ''قادیان'' اسی میں تھا۔ قادیانی گروہ برطانوی حکمرانوں کا پیدا کردہ ہے جس نے ہمیشہ برطانوی مفادات کیلئے کام کیا اور اس کا اعتراف خود مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی تحریروں میں کسی حجاب کے بغیر کھلے لفظوں میں کیا ہے۔ گورداس پور کی صورتحال یہ تھی کہ اگر قادیانی گروہ خود کو مسلمانوں میں شمار کرتا تو یہ علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ قرار پا کر پاکستان کا حصہ بنتا۔ اور اگر گورداس پور پاکستان میں شامل ہو جاتا تو ہندوستان کے پاس کشمیر میں داخل ہونے کا اس وقت اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور کشمیر کی حیثیت اس طرح ہو جاتی جیسے حیدر آباد دکن کی تھی کہ وہاں ہندو اکثریت پر حکمرانی کرنے والے مسلم نواب کیلئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ ریاست کے چاروں طرف ہندوستان کا گھیرا ہونے کی وجہ سے بھارت کے ساتھ حیدر آباد دکن کے الحاق کو روک سکے۔ اسی طرح جموں وکشمیر کے ڈوگرہ راجہ کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ مسلم اکثریت کی اس ریاست

کے پاکستان کے ساتھ الحاق میں رکاوٹ ڈال سکے۔

لیکن ہوا یوں کہ انگریزوں کے ایمان پر قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے ریڈ کلف کمیشن کے سامنے اپنا کیس مسلمانوں سے الگ جداگانہ حیثیت سے پیش کیا جس کی وجہ سے گورداس پور کو غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار دے کر بھارت میں شامل کرنے کی راہ ہموار ہوئی اور اسی سے بھارت کو کشمیر میں داخل ہونے کا راستہ ملا جس کے نتیجے میں کشمیر کا تنازعہ پیدا ہوا۔ یوں پاکستان اور بھارت گزشتہ نصف صدی سے مسلسل حالت جنگ میں ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ قادیانی گروہ جو خود کو مسلمانوں سے الگ قرار دینے والے کسی بھی فیصلے کو قبول کرنے سے انکاری ہے، حتیٰ کہ پاکستان کی پارلیمنٹ کے اس جمہوری فیصلے کو بھی تسلیم نہیں کر رہا جس میں قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک نئی امت قرار دیا گیا ہے، لیکن جب تقسیم پنجاب کے وقت برطانوی حکمرانوں کا مفاد اس میں تھا تو قادیانیوں نے ریڈ کلف کمیشن کے سامنے اپنا کیس مسلمانوں سے الگ پیش کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی تھی اور اسی کے نتیجے میں کشمیر کے خوفناک تنازع نے جنم لیا تھا جو آج نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔

اس لیے برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا کشمیر کا تنازع کھڑا کرنے میں برطانوی کردار کو تسلیم کریں یا نہ کریں اور اس پر معذرت کی ضرورت محسوس کریں یا نہ کریں، لیکن جیک اسٹرا خود کو بچہ قرار دے کر تاریخی حقائق کو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں کر سکتے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۱۶ جولائی ۲۰۰۲ء)

اراکان اور کشمیر: برطانوی استعمار کے شاہکار

میانمار (برما) کی سرحدوں کے اندر اراکان نام کا خطہ جو ایک دور میں مسلمانوں کی خودمختار ریاست ہوا کرتا تھا ان دنوں بدھ دہشت گردوں کی وحشت و بربریت کا شکار ہے اور مسلم اکثریت کا یہ صوبہ اس ظلم و جبر اور وحشیانہ تشدد کے باعث مسلمانوں کے وجود سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اس خطہ کے مسلمانوں کا جرم یہ بتایا جاتا ہے کہ:

☆ برصغیر کی تقسیم کے وقت روہنگیا مسلمانوں نے، جو اس خطہ میں اکثریت میں ہیں، بنگلہ دیش کے پڑوس میں ہونے کی وجہ سے یہ مطالبہ کر دیا تھا کہ انہیں برما میں شامل رکھنے کی بجائے اسلام کے نام پر قائم ہونے والے نئے ملک پاکستان میں شامل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ وہ مسلمان اکثریت رکھتے ہیں اور پاکستان کے اس وقت کے مشرقی حصہ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے ساتھ متصل سرحد رکھتے ہیں۔

☆ جبکہ بنگلہ دیش کا ایک بڑا شہر چٹاگانگ آزاد مسلم ریاست کے دور میں اراکان کا ہی حصہ ہوا کرتا تھا۔ جسے متحدہ ہندوستان سے برما کو الگ کرتے وقت اراکان کی تقسیم کر کے چٹاگانگ کو بنگال کا، اور باقی اراکان کو برما کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔

انگریز حکمرانوں نے اپنے مفادات کی خاطر برما کو خودمختاری دیتے وقت اراکان کو بندر بانٹ کے اصول کے مطابق بنگال اور برما کے درمیان تقسیم تو کر دیا تھا لیکن جب پورے ہندوستان کو آزادی دینے کی باری آئی تو برطانوی استعمار نے کشمیر کی طرح اراکان کو بھی ایک مستقل تنازعہ کی صورت میں باقی رہنے دیا۔

ہماری رائے میں کشمیر کی طرح اراکان کا مسئلہ بھی برطانوی استعمار کا پیدا کردہ ہے، صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ کشمیر کے ساتھ متصل پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو اپنا مسئلہ سمجھا، مہاجرین کو پناہ دی اور ہر فورم پر کشمیر کا مسئلہ اٹھایا، جبکہ اراکان کے ساتھ متصل بنگلہ دیش نے اراکان کے مظلوم مسلمانوں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ قرار دینے سے مسلسل گریز کیا حتیٰ کہ وہ بدھ دہشت گردی کا شکار ہونے والے (مزید) مظلوم مہاجرین کو پناہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہے اور سمندر کے ساحل سے ان کی کشتیوں کو واپس دھکیلا جا رہا ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ اراکان میں روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے، روزنامہ ایکسپریس گوجرانوالہ ۱۹ نومبر ۲۰۱۲ء کی خبر کے مطابق انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ہیومن رائٹس واچ کا کہنا ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کے قتل عام میں خود میانمار (برما) کی سرکاری فوجیں ملوث ہیں اور وہ بھی دہشت گردوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو نشانہ بنا رہی ہیں۔ میانمار کی حکومت روہنگیا مسلمانوں کو ملک کا شہری تسلیم کرنے سے انکاری ہے اور بنگلہ دیش ان کو مہاجر کے طور پر قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی ہائی کمشنر ناوی پیلے کو انڈونیشیا میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے میانمار کی حکومت سے باقاعدہ طور پر یہ مطالبہ کرنا پڑا ہے کہ وہ روہنگیا مسلمانوں کو شہریت دے۔

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ میانمار (برما) کی سرحدات کے اندر پیدا ہونے والے اور کئی نسلوں سے آباد مسلمانوں کو وہاں کا شہری تک تسلیم نہیں کیا جا رہا اور سرکاری فورسز دہشت گردوں کے ساتھ مل کر ان کا قتل عام کر رہی ہیں۔ امریکہ کے صدر باراک اوبامہ نے دوسری دفعہ منتخب ہونے کے بعد میانمار کا دورہ کیا ہے اور وہاں کی حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے کے لیے سنجیدگی اختیار کرے، لیکن ہمارے نزدیک یہ مسئلہ اصل میں مسلم حکمرانوں کا ہے، بنگلہ دیش اور پاکستان کا ہے کہ وہ روہنگیا مسلمانوں کے مسئلہ پر سنجیدگی کا مظاہرہ کریں اور مشترکہ طور پر کوئی ٹھوس حکمت عملی اختیار کر کے ان مظلوم مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور تشخص و آزادی کے تحفظ کو یقینی بنانے کے عملی اقدامات کریں۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ...... دسمبر ۲۰۱۲ء)

میانمار (برما) کی حکمران پارٹی کی سربراہ آنگ سان سوچی نے بھارتی خبر رساں ایجنسی اے این آئی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت اور میانمار کو ایک جیسے مسائل کا سامنا ہے کہ روہنگیا (اراکان) اور کشمیر کے تنازعات ملتے جلتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح بھارت کو کشمیر میں دہشت گردی کا سامنا ہے اسی طرح ہمیں بھی روہنگیا میں مسلمانوں کی طرف سے دہشت گردی کا معاملہ درپیش ہے۔

آنگ سان سوچی نے تو یہ بات بھارتی حکمرانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے کی ہے جو ایک مفروضہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی لیکن کشمیری اور روہنگیا مسلمانوں کا مسئلہ ایک جیسا ہونے کی بات ایک اور حوالہ سے ہم بھی اس کالم میں متعدد بار کر چکے ہیں۔ وہ اس طور پر کہ اراکان کم و بیش ساڑھے تین سو سال ایک آزاد مسلم ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر موجود رہا ہے۔ برطانوی استعمار نے برصغیر پر تسلط کے دوران برما کے ساتھ روہنگیا مسلمانوں کی اس ریاست پر بھی قبضہ کر لیا تھا لیکن جب اس نے برما کو آزادی دی تو اس سے قبل اراکان کو تقسیم کر دیا اور اس کے بڑے شہر چٹاگانگ کو بنگال میں شامل کر کے باقی ماندہ ریاست کو برما کے بدھ حکمرانوں کے حوالہ کر دیا۔ اس باقی ماندہ علاقے کے شہری اس وقت سے بدھ دہشت گردی کے ساتھ ساتھ ریاستی جبر و تشدد کا بھی مسلسل نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ اسی پس منظر میں قیامِ پاکستان کے وقت اراکان کے بعض مسلمان راہ نماؤں نے مطالبہ کیا تھا کہ چٹاگانگ کی طرح باقی ماندہ اراکان ریاست کو بھی پاکستان میں شامل کیا جائے۔ ان کی اس معصوم خواہش نے بدھ حکومت اور دہشت گردوں کے غیظ وغضب کو تب سے دوچند کر رکھا ہے اور یہ غریب عوام پون صدی سے اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔

اس بنیاد پر ہم نے ایک موقع پر عرض کیا تھا کہ متحدہ پاکستان کے دور میں اراکان مشرقی پاکستان کے کشمیر کی حیثیت رکھتا تھا لیکن کشمیر کی طرح کی توجہ اراکان کو حاصل نہیں ہوسکی۔ آنگ سان سوچی اگر اراکان اور کشمیر کے مسائل کو ایک جیسا کہہ رہی ہیں تو اس کا اصل پہلو یہ ہے جو سب کے سامنے رہنا چاہیے تاکہ اس مسئلہ کو اس کے صحیح تناظر میں حل کرنے کی کوشش منظّم کی جا سکے......

(روزنامہ اسلام، لاہور......۱۲ ستمبر ۲۰۱۷ء)

اقوامِ متحدہ کا یومِ تاسیس اور سعودی عرب کے احساسات

۲۴ اکتوبر کو دنیا بھر میں اقوامِ متحدہ کا یوم تاسیس منایا گیا اور مختلف ممالک میں اس موقع پر تقاریب کا اہتمام ہوا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اور اس کے بعد سے یہ مسلسل سرگرم عمل ہے۔ اس سے قبل پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ''انجمن اقوام'' کے نام سے ایک عالمی فورم قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد ممالک و اقوام کے درمیان تصادم کو روکنا اور ملکوں اور قوموں کے تنازعات کو بات چیت کے ذریعہ حل کرانے کے لیے عالمی سطح پر پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے ''انجمن اقوام'' کی ناکامی پر مہر تصدیق ثبت کر دی تو ''اقوام متحدہ'' کے عنوان سے ایک نیا بین الاقوامی ادارہ وجود میں آیا، اور اس کا بنیادی مقصد بھی یہی قرار دیا گیا کہ ممالک و اقوام کے درمیان جھگڑوں اور تنازعات کو جنگوں کی بجائے مصالحت کی میز پر حل کرانے کا راستہ ہموار کیا جائے۔ اقوام متحدہ نے اس کے لیے ثالث کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور بین الاقوامی امن کے لیے معاہدات اور مذاکرات کا نظام طے کر لیا، مگر رفتہ رفتہ اس نے اقوام و ممالک کے باہمی تنازعات میں ثالث اور مذاکرات کار کے کردار پر قناعت نہ کرتے ہوئے انسانی حقوق اور سولائزیشن کے نام پر قوموں کے مذہبی، تہذیبی، تعلیمی اور ثقافتی معاملات کو بھی اپنے دائرہ کار میں لانے کے لیے پیشرفت شروع کر دی۔ اور مختلف شعبوں میں ایسے بین الاقوامی معاہدات کا اہتمام کیا جو آج دنیا بھر کے لیے عملاً ''بین الاقوامی دستور و قانون'' کا درجہ اختیار کر چکے ہیں اور ان کے ذریعہ بین الاقوامی ان دیکھی اسٹیبلیشمنٹ دنیا بھر پر حکومت کر رہی ہے۔

آج کے عالمی منظر کو اس حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس

وقت دنیا پر صرف معاہدات کی حکومت ہے، کیونکہ کم وبیش سبھی حکومتیں ان معاہدات کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے اپنے ملکوں میں حکومت کا نظام چلانے کی پابند ہیں۔ ان بین الاقوامی معاہدات کی خلاف ورزی پر حکومتوں کو چارج شیٹ کیا جاتا ہے، ملکوں کی اقتصادی ناکہ بندی ہوتی ہے، ان کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے، ان کے خلاف سلامتی کونسل کے فورم پر فیصلے کیے جاتے ہیں اور کوئی ملک ان معاہدات میں سے کسی بات کی خلاف ورزی پر اصرار کرتا دکھائی دے تو اس کے خلاف مختلف ممالک کی فوجوں کو ایک کمان کے تحت متحد کر کے متعلقہ ملک پر عسکری یلغار بھی کر دی جاتی ہے۔ اس طرح دنیا کی کوئی بھی حکومت اپنے ملک میں ان معاہدات کے دائرے سے ہٹ کر کسی بھی معاملہ میں ازخود کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے اور نہ ہی کسی ملک میں عوام کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہونے والی پارلیمنٹ کوئی آزادانہ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔

بین الاقوامی معاہدات کی پابند حکومتیں اور منتخب اسمبلیاں کہنے کو خودمختار سمجھی جاتی ہیں اور ہر ملک میں ان کی خودمختاری اور بالادستی کا ڈھنڈورا بھی پیٹا جاتا ہے لیکن کوئی حکومت یا پارلیمنٹ بین الاقوامی معاہدات کی جکڑ بندی سے آزاد نہیں ہے اور عملاً دنیا کے کم وبیش تمام ممالک میں بین الاقوامی معاہدات کی حکومت ہے اور ان کی عملداری کی ذمہ داری اقوام متحدہ نے اٹھا رکھی ہے۔

اقوام متحدہ اگر خود کو ملکوں اور قوموں کے درمیان تنازعات کے حل کے لیے ثالثی کے کردار تک محدود رکھتی تو بات کسی حد تک سمجھ میں آنے والی تھی لیکن آج ہماری یعنی مسلمانوں کی صورت حال یہ ہے کہ نکاح وطلاق، وراثت، دینی تعلیم، مذہبی اقدار، توہین رسالتؐ، ختم نبوت جیسے بنیادی عقیدہ کی تعبیر وتشریح اور میاں بیوی کے باہمی تعلق جیسے معاملات میں بھی ہم اقوام متحدہ کی ہدایات کے پابند ہیں۔ حتیٰ کہ کسی بھی اسلامی ملک میں قرآن وسنت کے کسی قانون کے نفاذ یا کسی مسلم معاشرہ میں اسلامی تعلیمات کی عملداری کی بات کی جاتی ہے تو یہ بین الاقوامی معاہدات مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور اقوام متحدہ سمیت بہت سے عالمی ادارے بین الاقوامی معاہدات کا ڈنڈا اٹھائے اسلامی تعلیمات پر عمل کے خواہش مند مسلمانوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں مسلمان اپنے اکثریتی علاقہ اور خودمختار ملک میں بھی قرآن وسنت کے احکامات پر عمل کرنے میں آزاد نہیں ہیں۔

دوسری طرف ملکوں اور قوموں کے درمیان تنازعات کو حل کرانے میں اقوام متحدہ کی دوغلی پالیسی اور منافقانہ طرز عمل بھی ایک زندہ حقیقت ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ حل کرانے میں اقوام متحدہ ابھی تک ناکام ہے جبکہ سوڈان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک نئی مسیحی ریاست کا راستہ ہموار کرنے میں اقوام متحدہ کو زیادہ وقت نہیں لگا۔ اسی طرح انڈونیشیا میں ایسٹ تیمور کے نام سے ایک مسیحی ریاست کی تشکیل کو اقوام متحدہ اپنے قابل فخر کارناموں میں شمار کرتی ہے، مگر جموں و کشمیر کے عوام کو آزادانہ رائے شماری کا تسلیم شدہ حق دلوانے میں اقوام متحدہ مسلسل بے بسی کا روپ دھارے ہوئے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی اور ثقافتی معاملات میں مسلسل مداخلت اور فلسطین و کشمیر جیسے سنگین مسائل کو حل کرنے میں اس کی ناکامی نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں اقوام متحدہ کے خلاف شکوک و شبہات کا ایک جنگل آباد کر رکھا ہے اور یہ جذبات نفرت اور غیظ و غضب کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

عالم اسلام کی طرف سے ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم مہاتیر محمد نے اپنے دور میں اقوام عالم کو اس دھاندلی کی طرف توجہ دلائی تھی اور یہ مطالبہ کر کے پوری دنیائے اسلام کے جذبات کی ترجمانی کی تھی کہ بین الاقوامی معاہدات پر نظر ثانی کی جائے اور سلامتی کونسل میں ویٹو پاور رکھنے والے ممالک کی فہرست میں مسلمانوں کی باضابطہ شمولیت کی کوئی عملی صورت نکالی جائے، مگر مہاتیر محمد کے اس جائز اور منصفانہ مطالبے کی طرف بین الاقوامی اسٹیبلیشمنٹ تو کجا خود مسلم حکمرانوں نے بھی توجہ نہیں دی تھی۔

آج اقوام متحدہ کے قیام کو سات عشرے مکمل ہونے کو ہیں مگر اس کے عملی کردار کا جائزہ لیا جائے تو ایک مسلمان کو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ اس عالمی فورم نے عالم اسلام میں بین الاقوامی معاہدات کے ذریعہ نفاذِ اسلام کا راستہ روک رکھا ہے، فلسطین و کشمیر کے سنگین مسائل کو حل کرانے میں ناکامی بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں انہیں ''حل نہ کرانے میں کامیابی'' کا تمغہ اپنے سینے پر سجایا ہوا ہے۔ اور یہ بین الاقوامی پلیٹ فارم دنیا میں مغربی فکر و فلسفہ کی یلغار اور ویٹو پاور رکھنے والے ملکوں کی سیاسی بالادستی کے لیے سب سے بڑا ہتھیار بن کر رہ گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس پس

منظر میں سعودی عرب کا سلامتی کونسل میں نشست قبول کرنے سے انکار زمینی حقائق کے صحیح ادراک کے ساتھ ساتھ اسلامیان عالم کے جذبات کی ترجمانی بھی ہے اور ہم سعودی عرب کے اس موقف کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ:

> ''گزشتہ ۶۵ برس سے مسئلہ فلسطین کا کوئی مستقل حل دریافت نہیں کیا جا سکا، اس مسئلہ نے مشرق وسطیٰ میں کئی جنگوں کو جنم دیا اور دنیا بھر کے امن اور سلامتی کے لیے یہ مسئلہ ایک خطرہ بنا رہا۔ سلامتی کونسل اب تک اس کا کوئی ایسا حل نہیں نکال سکی جو عدل وانصاف پر مبنی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل اپنے اصل فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہی ہے۔ سلامتی کونسل میں جس طرح کام ہوتا ہے، اس کے دوہرے معیار جس طرح کے ہیں وہ اس ادارے کو اپنے فرائض ادا کرنے سے روکتے ہیں اور دنیا میں امن قائم رکھنے کی ذمہ داریاں نباہنے نہیں دیتے۔ اس بنا پر ہمارے پاس اور کوئی آپشن نہیں کہ ہم سلامتی کونسل کی اس نشست کو قبول کرنے سے انکار کر دیں اور اس وقت تک اس نشست کو قبول نہ کریں جب تک اس روش کو بدلا نہیں جاتا اور جب تک سلامتی کونسل عالمی امن کے قیام کے لیے اپنی ذمہ داریاں نباہنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔''

ہمیں خوشی ہے کہ سعودی عرب کے اس فیصلے پر فرانس نے ہمدردانہ ردعمل کا اظہار کر کے اسے صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہنے دیا۔ روزنامہ دنیا لاہور میں ۲۰ اکتوبر کو شائع ہونے والی خبر کے مطابق فرانس کے دفتر خارجہ کے ترجمان رومین ندال نے کہا ہے کہ وہ سلامتی کونسل سے متعلق سعودی احساسات کو درست اور جائز سمجھتے ہوئے ان کی تائید کرتے ہیں کیونکہ سلامتی کونسل کے عملاً مفلوج ہو کر رہ جانے کے بعد ان احساسات کا پیدا ہو جانا بلا جواز نہیں ہے۔

فرانس کے دفتر خارجہ کے یہ ریمارکس سلامتی کونسل کے حقیقی کردار کی نشاندہی کر رہے ہیں جس پر ہمارے ذہن میں اردو شعر کا یہ مصرعہ گونجنے لگا ہے کہ

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے

(روزنامہ اسلام، لاہور ...... ۲۶ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

کشمیر، افغانستان اور صدر ٹرمپ

امریکہ کے صدر جناب ڈونلڈ ٹرمپ کے دو بیانات اس وقت ہمارے ہاں زیادہ تر زیر بحث ہیں، ایک کشمیر کے بارے میں ہے اور دوسرا افغانستان کے حوالہ سے، ان دونوں خطوں کے ساتھ ہماری ثقافتی، دینی اور جذباتی وابستگی ہے اس لیے فطری طور پر بحث ومباحثہ میں تنوع اور جذباتیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ صدر ٹرمپ نے وزیراعظم عمران خان کے دورۂ امریکہ کے موقع پر کشمیر کے مسئلہ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ثالثی کی پیشکش کی تھی جسے پاکستان نے تو قبول کرلیا مگر بھارت کی طرف سے مثبت جواب نہیں آیا بلکہ اس کی طرف سے عملی جواب یہ ہے کہ بھارتی دستور میں مقبوضہ کشمیر کی امتیازی حیثیت ختم کرنے کی طرف پیشرفت ہو رہی ہے جس سے بھارتی دستور کی رو سے کشمیر متنازعہ خطہ نہیں رہے گا۔ جبکہ کشمیری عوام پر گزشتہ ستر سال سے بھارتی فوج کے مسلسل بڑھتے ہوئے مظالم پر عالم اسلام خصوصاً پاکستانی قوم مضطرب اور بے چین ہے، مختلف ادوار میں اس سلسلہ میں پیشرفت ہوئی مگر بھارتی ہٹ دھرمی اور اقوام عالم میں اس کے اثر ورسوخ کے باعث معاملہ ہر بار کھٹائی میں پڑتا رہا۔ اب ایک بار پھر اقوام متحدہ اور او آئی سی کو اس سلسلہ میں توجہ دلانے اور کشمیری عوام کے ساتھ ہم آہنگی اور یکجہتی کے بھرپور اظہار کے لیے پاکستانی پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ہونے والا ہے جو اس سلسلہ میں قومی طرز عمل اور عزم کا اعادہ کرے گا۔

کشمیری عوام ایک جائز مطالبہ پر گزشتہ ستر سال سے جدوجہد میں مصروف ہیں اور مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں کہ اقوام متحدہ کے واضح فیصلوں اور عالمی برادری کے وعدہ کے مطابق آزادانہ استصواب رائے کے ذریعے انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق دیا جائے، مگر یہ وعدہ پورا ہونے کی بجائے کشمیری عوام کے خلاف عسکری جارحیت کا تسلسل قائم ہے جو بہرحال عالمی

برادری کی انصاف پسندی پر ایک سوالیہ نشان ہے اور اس کا جس قدر جلد نوٹس لیا جائے بہتر ہوگا کہ بھارت نے بالآخر کشمیری عوام کا یہ مسلمہ اور جائز حق دینا ہی ہے۔

دوسری طرف افغانستان کے بارے میں صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان کو دو تین روز میں فتح کر سکتے ہیں مگر اس کے لیے دس ملین لوگوں کا قتل عام ہوسکتا ہے جو وہ نہیں چاہتے، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ یہ مسئلہ مذاکرات کے ذریعے ہی حل کیا جائے جس پر امریکی حکومت کی گفتگو امارت اسلامیہ افغانستان کے ساتھ جاری ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صدر ٹرمپ نے اس بیان میں دونوں طرف پیغام دیتے ہوئے جہاں افغانستان سے یہ کہا ہے کہ وہ اگر امریکی حکومت کی شرائط کے مطابق معاہدے کے لیے تیار نہیں ہوں گے تو کم از کم دس ملین افغان مارے جا سکتے ہیں، وہاں دوسری طرف وہ امریکی قوم کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک کروڑ کے لگ بھگ افغانیوں کو تہہ تیغ کیے بغیر افغانستان کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ہم صدر ٹرمپ کے اس بیان کو اس مفہوم میں لیتے ہیں کہ افغانستان کی سرزمین تو فتح کی جا سکتی ہے لیکن افغان قوم کو فتح کرنا امریکہ کے بس میں نہیں ہے۔

اس پس منظر میں ان مذاکرات پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان جاری ہیں اور جس کے بارے میں امارت اسلامی افغانستان کے نمائندوں کا یہ عندیہ بھی سامنے آچکا ہے کہ کم و بیش ۸۰ فیصد معاملات پر اتفاق ہو چکا ہے اور باقی ۲۰ فیصد امور پر بھی جلد سمجھوتہ ہو جانے کی توقع ہے۔ جبکہ غالباً وہی بیس فیصد امور سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن ہیں۔ ہمارے خیال میں امریکہ اس بات پر بضد ہے کہ افغان طالبان کابل کی موجودہ حکومت سے فوری بات چیت کریں جس کے لیے وہ تیار نظر نہیں آتے، جبکہ طالبان کی یہ شرط ہے کہ امریکی فوجوں کے انخلا کا شیڈول دیا جائے اس کے بعد باقی امور پر گفتگو نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اصل بات وہی ہے کہ امریکہ اپنی فوجوں کے انخلا کا شیڈول دینے سے قبل افغان طالبان سے کابل حکومت کا وجود تسلیم کرانا چاہتا ہے جو اس ''امریکی اسٹائل'' کا حصہ ہے کہ دشمن کے ساتھ مذاکرات میں دشمن کی نمائندگی کے لیے بھی امریکہ کی مرضی کے لوگ بیٹھے ہوں اور اقتدار منتقل کرنے کی صورت میں اقتدار وصول کرنے والوں میں بھی امریکہ کی مؤثر نمائندگی موجود

ہو۔اس کی جو تاویل بھی کر لی جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ امریکی اسٹائل ہی نوآبادیاتی نظام کی جدید ترین شکل ہے جسے وہ افغانستان میں بہرصورت قائم رکھنا چاہتا ہے۔

جہاں تک دس ملین افراد قتل کر کے فتح حاصل کرنے کی دھمکی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں، امریکہ بہادر اس سے قبل دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی کی شکست کے بعد اس کا حلیف جاپان ہتھیار نہیں ڈال رہا تھا تو اسے اس پر مجبور کرنے کے لیے امریکہ نے جاپان کے دوشہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر کم وبیش دولاکھ افراد کو آناً فاناً موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔لگتا ہے امریکہ کی حالیہ قیادت پر وہی نشہ طاری ہونے لگا ہے، اللہ تعالیٰ اس دنیا کی حفاظت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۱۶ اگست ۲۰۱۹ء)

نیتن یاہو، نریندرا مودی کے نقش قدم پر

اسرائیلی وزیراعظم نتن یاہو کے حوالہ سے ایک خبر سوشل میڈیا میں مسلسل گردش کر رہی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ اگر وہ آئندہ الیکشن میں کامیاب ہوئے تو غرب اردن کے بعض علاقوں کو وہ باقاعدہ اسرائیل میں شامل کرلیں گے۔

اسرائیل کی جو سرحدیں اقوام متحدہ نے فلسطین کی تقسیم کے موقع پر طے کی تھیں، ان کے علاوہ اسرائیل نے جن علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے وہ بین الاقوامی دستاویزات میں متنازعہ سمجھے جاتے ہیں، اور غرب اردن کا وہ علاقہ بھی ان میں شامل ہے۔ چنانچہ بھارتی وزیراعظم نریندرا مودی کی طرف سے مقبوضہ کشمیر کے متنازعہ خطہ کو بھارت میں شامل کیے جانے کے اعلان پر عالمی قوتوں، بین الاقوامی اداروں اور حلقوں کے ڈھیلے ڈھالے ردعمل کو دیکھ کر اسرائیلی وزیراعظم کو بھی حوصلہ ہوا ہے اور انہوں نے یہ مبینہ اعلان کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں بحث کو بھی ہمارے ہاں وقفہ وقفہ سے زندہ رکھنے کی کوشش سوشل میڈیا پر دکھائی دے رہی ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاید کسی وقت ''داؤ لگ جائے''۔

اس ضمن میں اب سے سولہ سال قبل ایک محترم دانشور کی طرف سے یہ سوال سامنے آیا تھا کہ اگر مسیحی ریاستوں کے ساتھ تعلقات درست ہیں تو یہودی بھی تو اہل کتاب ہیں، ان کی ریاست کو تسلیم نہ کرنے اور اس کے ساتھ سفارتی تعلقات کی مخالفت کیوں کی جا رہی ہے؟ راقم الحروف نے اس پر چند گزارشات پیش کی تھیں جو ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کی ستمبر ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھیں، ان کا ایک حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مسیحی اور دیگر غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ خلافت اسلامیہ اور مسلم حکومتوں کے سفارتی تعلقات ابتدائے اسلام سے چلے آ رہے ہیں اور ان سے کبھی اختلاف نہیں کیا گیا۔ البتہ دو ہزار

سال بعد از سرنو قائم ہونے والی یہودی ریاست ''اسرائیل'' کے ساتھ سفارتی تعلقات اور اسے تسلیم کرنے کا معاملہ اس سے مختلف ہے اور اس کی الگ وجوہ واسباب ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

(۱) مثلاً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری وہاں کی صدیوں سے چلی آنے والی آبادی یعنی فلسطینیوں کی رضامندی کے ساتھ نہیں ہوئی، بلکہ پہلے برطانیہ نے اس خطہ پر ۱۹۱۷ء میں باقاعدہ قبضہ کر کے فوجی طاقت کے بل پر یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا، اور اب امریکہ اور اس کے اتحادی پوری فوجی قوت استعمال کر کے فلسطینیوں کو یہودیوں کی اس جبری آبادکاری کو تسلیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جس پر فلسطینی راضی نہیں ہیں کیونکہ یہ دھونس اور جبر کا راستہ ہے جسے دنیا کی کوئی مہذب اور متمدن قوم قبول نہیں کر سکتی۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح ہم کشمیر کے بارے میں اصولی موقف رکھتے ہیں کہ بھارتی فوج وہاں سے چلی جائے اور کشمیریوں کو کسی دباؤ کے بغیر اقوام متحدہ کے نظم کے تحت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے، اسی طرح فلسطین بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کے بارے میں ہمارا اصولی موقف یہ ہونا چاہیے کہ امریکہ اپنی فوجیں اس خطہ سے نکالے اور نہ صرف فلسطین بلکہ خلیج کے دیگر ممالک کو بھی فوجی دباؤ سے آزاد کر کے وہاں کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا آزادانہ موقع فراہم کرے۔ انصاف اور مسلمہ اصولوں کا تقاضا تو بہرحال یہی ہے اور اگر بالادست قوتیں طاقت کے نشے میں اس اصول پر نہیں آتیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں اور بے اصولی اور دھونس کو اصول وقانون کے طور پر تسلیم کر لیں۔

(۲) پھر اسرائیل کو تسلیم کرنے میں ایک عملی رکاوٹ یہ بھی ہے جسے دور کیے بغیر اسے تسلیم کرنا قطعی طور پر ناانصافی کی بات ہوگی۔ وہ یہ کہ اسرائیل کی سرحدی حدود اربعہ کیا ہیں؟ یہ بات ابھی تک طے نہیں ہو سکی۔ بہت سے عرب ممالک اور فلسطینی عوام کی اکثریت سرے سے فلسطین کی تقسیم کو قبول نہیں کر رہی۔ جبکہ اقوام متحدہ نے اسرائیل اور فلسطین کے

درمیان جو سرحدات اپنی قراردادوں میں طے کر رکھی ہیں، انہیں اسرائیل تسلیم نہیں کر رہا۔

☆ اسرائیل کی اقوام متحدہ کی طرف سے طے کردہ سرحدات اور ہیں،

☆ اس وقت اس کے زیر قبضہ علاقے کی حدود اربعہ اور ہیں،

☆ کسی اصول اور قانون کی پروا کیے بغیر پورے فلسطین میں دندناتے پھرنے سے اس کی سرحدوں کا نقشہ بالکل دوسرا دکھائی دیتا ہے،

☆ اور اسرائیلی حکمرانوں کے عزائم پر مشتمل ''عظیم تر اسرائیل'' کا جو نقشہ ریکارڈ پر موجود ہے، وہ ان سب سے مختلف ہے۔

☆ اس کے ساتھ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کا یہ اعلان کئی بار سامنے آچکا ہے کہ وہ فلسطین کی مجوزہ ریاست کو صرف اس شرط پر تسلیم کریں گے کہ اس کی سرحدات کا تعین نہیں ہوگا اور اس کی الگ فوج نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسرائیل پورے فلسطین پر حکمرانی کے حق کا اعلان کر رہا ہے اور فلسطینیوں کو سرحدات کے تعین کے ساتھ کوئی چھوٹی سی برائے نام ریاست دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

(۳) اس کے علاوہ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے قبل آپ کو بیت المقدس کے بارے میں بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو اسرائیل کو بیت المقدس سے دستبرداری پر آمادہ کر لیں اور یا خود ''یوٹرن'' لے کر بیت المقدس سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیں۔

یہ تینوں رکاوٹیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، عملی اور معروضی ہیں، ان کا کوئی باوقار اور قابل عمل حل نکال لیں اور بے شک اسرائیل کو ایک یہودی ریاست کے طور پر اسی طرح تسلیم کر لیں جس طرح ہم بہت سے مسیحی ممالک کو تسلیم کرتے آرہے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس حوالے سے بات عملی مسائل اور معروضی حقائق پر ہونی چاہیے، نظری اور فکری مباحث میں الجھا کر اس مسئلہ کو مزید پیچیدہ نہیں بنانا چاہیے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۱۴ ستمبر ۲۰۱۹ء)

امت مسلمہ کے مسائل اور عالمی قوتوں کی ’’اصول پرستی‘‘

ایک قومی اخبار کی آج کی ایک خبر کے مطابق امریکی کانگریس کے ایک سو پینتیس ۱۳۵ ارکان نے ایک پٹیشن پر دستخط کیے ہیں جس میں امریکی وزیر خارجہ مائیک پومیو کے فلسطین میں یہودی بستیوں کی حمایت پر مبنی بیان کی شدید مذمت کی گئی ہے، اور کہا گیا ہے کہ امریکی حکومت کا موقف فلسطینیوں اور اسرائیل کے درمیان امن مساعی کو مزید پیچیدہ بنا دے گا۔ مرکز اطلاعات فلسطین کے مطابق امریکی ارکان کانگریس کی طرف سے تیار کردہ پٹیشن میں وزیر خارجہ مائیک پومیو سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ غرب اردن میں یہودی آبادکاری کی حمایت سے متعلق اپنا بیان واپس لیں۔ یاد رہے کہ یہ پٹیشن ایک ایسے وقت میں تیار کی گئی ہے جب چار روز قبل پومیو نے سال ہا سال سے چلی آنے والی امریکی پالیسی کے برعکس بیان میں کہا تھا کہ ان کا ملک اب فلسطین میں یہودی بستیوں کی تعمیر کو خلاف قانون نہیں سمجھتا۔ اس بیان پر عرب ممالک، عالم اسلام اور عالمی برادری کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آیا تھا۔ امریکی کانگریس کے ارکان کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۸ء میں امریکہ نے فلسطین میں یہودی بستیوں کی تعمیر کے خلاف اصولی موقف اختیار کیا تھا جس میں ان بستیوں کو بین الاقوامی قوانین کے منافی قرار دیا گیا تھا۔

فلسطین میں یہودی بستیوں کی تعمیر کے بارے میں امریکی موقف میں یہ یوٹرن ہمارے لیے غیر متوقع نہیں ہے اس لیے کہ فلسطین میں برطانوی نوآبادیاتی دور سے اب تک اسرائیل کے قیام، یہودی آبادکاری میں مسلسل توسیع، فلسطینیوں کو ان کے وطن اور شہری و انسانی حقوق سے بتدریج

محروم کرتے چلے جانے، اور عالم اسلام بالخصوص عرب ممالک کو مختلف قسم کے تزویری حربوں کے ذریعے فلسطینیوں کی حمایت سے دست کش یا کم از کم خاموش کر دینے کا جو عمل گزشتہ ایک سو سال کی تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، وہ اسی قسم کی پالیسیوں سے عبارت ہے، اور کوئی ایک مرحلہ بھی اس دوران ایسا دکھائی نہیں دیتا جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہو کہ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ نے خود اپنے طے کردہ اصولوں کا کوئی دائرہ بھی قائم رہنے دیا ہو۔

اصول اور اصولی موقف کی گزشتہ تاریخ سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ دنیا کے کسی خطہ میں اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے مرحلہ وار پالیسیوں کو ’’اصول‘‘ کا نام دے دیا جاتا ہے، ایک مرحلہ مکمل ہونے پر وہ اصول تکمیل تک پہنچ جاتا ہے، اور دوسرا مرحلہ شروع ہونے کے بعد اس کے اختتام پذیر ہونے تک نئی پالیسی اور حکمت عملی کو ’’اصول‘‘ کا عنوان دے دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کھیل کا دائرہ صرف مشرق وسطیٰ تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا کے دیگر علاقوں میں بھی اصولوں کے نام سے یہی ’’ناٹک‘‘ جاری ہے۔ مثال کے طور پر مسئلہ کشمیر کا حال بھی اس سے مختلف نہیں:

- ☆ اس کا آغاز امریکہ کی سرپرستی میں اقوام متحدہ کی اس مبینہ اصول پرستی سے ہوا تھا کہ کشمیری عوام سری نگر کی کٹھ پتلی حکومت کے خلاف جہاد روک دیں، ان کا مسئلہ کشمیری عوام کی آزادانہ مرضی کے ساتھ استصواب رائے کے ذریعے حل کیا جائے گا، اور اس کا اہتمام اقوام متحدہ کے ذمہ ہوگا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ تک یہ راگ مسلسل الاپا جاتا رہا۔
- ☆ پھر اصول بدل گیا جس نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دو حصوں میں بٹ جانے کے بعد مستقل شکل اختیار کر لی کہ یہ مسئلہ کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کا نہیں بلکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان یہ ایک باہمی تنازعہ ہے جسے باہمی مذاکرات کے ذریعے حل کیا جانا چاہیے۔ اس راگ کی بھی مدت طے کر لی گئی تھی جو شاید پوری ہو گئی ہے۔
- ☆ اور اب نئے اصول کے تحت یہ مسئلہ بھارت کا داخلی مسئلہ ہو گیا ہے جس میں صرف اس کی یہ ذمہ داری رہ گئی ہے کہ وہ کشمیریوں کو کسی طرح مطمئن کر لے اور ان کے شہری حقوق کے بارے میں دنیا کو اعتماد میں رکھے، باقی اللہ اللہ خیر صلاّ۔

عالم اسلام کے یہ دونوں مسئلے یعنی فلسطین اور کشمیر مغربی ممالک کی اس مرحلہ وار ’’اصول پرستی‘‘

کا شاہکار ہیں، اور نہ صرف امریکہ اور دیگر مغربی ممالک اس میں پیش پیش ہیں بلکہ عالم اسلام میں ان کے حواری بھی اسی نام نہاد اصول پرستی کے پیچھے تالیاں پیٹتے نظر آ رہے ہیں۔ چنانچہ امریکی کانگریس کے ۱۳۵ ارکان نے اس پر جو احتجاج ریکارڈ کروایا ہے اس کی حیثیت اور افادیت اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ان قراردادوں سے زیادہ دکھائی نہیں دیتی جو گزشتہ پون صدی سے امت مسلمہ کے مسائل پر منظور کی جا رہی ہیں۔ جبکہ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ان کا نہیں ہے بلکہ مسلم حکمرانوں اور حکومتوں کا ہے کہ جب تک ان کی غیرت نہیں جاگتی، یہ ڈرامے اسی طرح جاری رہیں گے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور...... ۲۷ نومبر ۲۰۱۹ء)

پاکستان کی قومی سلامتی

﴿پاک بھارت تعلقات کے تناظر میں﴾

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو آپس میں لڑانے کی سازش

مرزا غلام احمد قادیانی کے پوتے ایم ایم احمد کے بارے میں عوامی حلقہ میں کبھی اس بات میں شک نہیں رہا کہ وہ انہی خطوط پر کام کررہے ہیں جو مرزائی گروہ کے لیے برطانوی سامراج نے وضع کیے تھے۔ نہ صرف ایم ایم احمد بلکہ اس ٹولہ سے متعلق دوسرے افسران بھی انہی کے نقش قدم پر چل کر برطانوی سامراج کے خودکاشتہ پودے قادیانیت کے بانی مرزا غلام احمد کے مشن کی تکمیل میں سرگرم ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں عوامی تحریک کا مقصد یہی تھا کہ کسی طرح قوم ان ''پیران تسمہ پا'' سے نجات حاصل کرلے۔ مگر افسوس کہ ایوان اقتدار نے آنکھیں بند کرلیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کی گردن پر ان کے تسموں کی گرفت اور زیادہ سخت ہوگئی۔ اس وقت کسی نے دھیان نہ دیا اور آج جب اس غفلت کے ثمرات اپنی تمام تر ہولناکیوں کے جلو میں نمودار ہورہے ہیں تو ہر ایک انگشت بدنداں ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ حالیہ انتخابات سے قبل مشرقی پاکستان کے متعدد سیاسی راہنماؤں نے ایک مشترکہ بیان میں مسٹر ایم ایم احمد کو اقتصادی منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کے عہدہ سے برطرف کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ماضی میں اقتصادی طور پر مشرقی پاکستان کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں ان کے ذمہ دار مسٹر ایم ایم احمد ہیں کہ انہوں نے اقتصادی منصوبہ بندی میں مشرقی پاکستان کو ثانوی حیثیت دی۔ اور شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات جو آج سیاسی بحران کا

باعث بنے ہیں اسی ناانصافی اور ترجیحی سلوک کی صدائے بازگشت ہیں۔

صدر مملکت نے مسٹر ایم ایم احمد کو ڈپٹی چیئرمین کے عہدہ سے تو ہٹا دیا مگر اس سے زیادہ اہم پوسٹ ان کو دے کر اپنا اقتصادی مشیر مقرر کر لیا۔ اور صدر کے مشیر کی حیثیت سے ان صاحب نے جو ''خدمات'' سرانجام دیں وہ پاک فضائیہ کے سابق سربراہ، پی آئی اے کے سابق سربراہ، سابق ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سابق گورنر مغربی پاکستان جناب نور خان سے دریافت کیجئے۔ انہوں نے ۲ مارچ کو اپنی ہنگامی پریس کانفرنس میں قومی اسمبلی کے اجلاس کے التواء پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرف اشارات کیے ہیں۔ روزنامہ آزاد لاہور ۳ مارچ کے مطابق جناب نور خان نے مشرقی پاکستان کے ساتھ ناانصافیوں کا ذمہ دار نوکر شاہی خصوصاً ایم ایم احمد کو قرار دیا اور الزام لگایا کہ موصوف صدر مملکت کو غلط مشورے دے کر ملک کے دونوں حصوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع کر رہے ہیں۔ جناب نور خان نے یہ بھی بتایا کہ موجودہ سیاسی بحران بپا کرنے کے لیے مسٹر احمد اور ان کے ساتھی افسروں نے اور بھی خفیہ سازشیں کی ہیں۔

گویا اقتصادی اور سیاسی دونوں میدانوں میں ایم ایم احمد اور ان کا ٹولہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو آپس میں لڑانے کے لیے پوری منصوبہ بندی سے کام کر رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ منصوبہ بندی کسی منطقی نتیجے تک پہنچے، اگر خدانخواستہ خدانخواستہ خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری نہ صرف نوکر شاہی ایم ایم احمد اور ان کے رفقاء پر ہوگی بلکہ وہ افراد بھی اس قومی جرم میں برابر کے شریک سمجھے جائیں گے جنہوں نے ۱۹۵۳ء میں عوامی مطالبہ پر قوم کو ان ''پیرانِ تسمہ پا'' سے نجات دلانے کی بجائے قوم کے ہزاروں نونہالوں کے خون سے پاک سرزمین کو رنگ دیا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس روز بد سے قوم کو بچائیں، آمین یا الٰہ العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء)

سقوطِ ڈھاکہ ۱۹۷۱ء کے ہنگامی حالات

پارلیمنٹ نے گزشتہ روز مشترکہ اجلاس میں حزب اختلاف کے واک آؤٹ کے بعد ہنگامی حالات میں مزید چھ ماہ کی توسیع کی قرارداد منظور کر لی۔ اس سے قبل قائد حزب اختلاف خان عبد الولی خان نے قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہنگامی حالات کو باقی رکھنے کا اقدام عوام کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ خان صاحب نے کہا کہ ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کی بناء پر ملک میں ہنگامی صورتحال کا اعلان ہوا تھا اور یہ صورتحال اب تک برقرار رکھی جا رہی ہے۔ حالانکہ حکومت نے بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کے تحت حالات کو معمول پر لانے کی راہ اختیار کر لی ہے اور اب ۱۲ دسمبر سے بھارت کے ساتھ بات چیت کا آغاز کر رہی ہے۔ خان عبدالولی خان نے کہا کہ بھارت کے ساتھ تعلقات کی استواری کا آغاز کرنے کے بعد ہنگامی حالات کو برقرار رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ قائد حزب اختلاف نے حکومت کی غیر جمہوری پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کے بعد اعلان کیا کہ حزب اختلاف ہنگامی حالات میں مزید توسیع میں حصہ دار بننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے بعد خان عبدالولی خان کے ساتھ حزب اختلاف کے تمام ارکان ایوان سے واک آؤٹ کر گئے۔

ہنگامی حالات دراصل ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے سلسلہ میں نافذ کیے گئے تھے اور اس وقت سے اب تک بدستور چلے آ رہے ہیں۔ حالانکہ اب وہ صورتحال باقی نہیں رہی جس کے تحت ہنگامی حالات کا نفاذ ضروری سمجھا گیا تھا۔ بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کے بعد حالات کافی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں اور تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے بھٹو حکومت ۱۲ ستمبر سے انڈیا گورنمنٹ کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر رہی ہے۔ اس لیے ہنگامی حالات کو مزید جاری رکھنے کی غرض سے سابقہ وجوہات کو بنیاد بنانے کا کوئی جواز نہیں۔ سالِ رواں کے آغاز پر جب ہنگامی حالات کی

مدت میں چھ ماہ کی توسیع کی گئی تھی، وزیراعظم ذوالفقارعلی بھٹو نے وعدہ کیا تھا کہ اس توسیع کے بعد ہنگامی حالت کی مدت میں مزید اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اب چھ ماہ کے لیے ہنگامی حالات کی مدت اور بڑھا دی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں حزب اختلاف کے اس الزام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بھٹو حکومت نے ہنگامی حالات کے تحت حاصل شدہ اختیارات کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور انہی مقاصد کے لیے ایمر جنسی کی عمر میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ عملاً جو کچھ ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اکا دکا واقعات کو چھوڑ کر اب تک ہنگامی قوانین مثلاً ڈیفنس آف پاکستان رولز وغیرہ کا بیشتر استعمال اپوزیشن کے راہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف ہوا ہے۔ اور اب بھی یہ قوانین تحریک ختم نبوت اور متحدہ جمہوری محاذ کے کارکنوں کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت متعدد سیاسی و دینی کارکن ڈی پی او کے تحت جیلوں میں بند ہیں اور ہنگامی قوانین کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا رجحان بدستور اضافہ پذیر ہے۔

اس لیے ہم حزب اختلاف کے اس موقف پر صاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہنگامی حالات کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور بھٹو حکومت اپنے اقتدار کو تحفظ دینے اور اپوزیشن کو کچلنے کے لیے ہنگامی حالات کا سلسلہ دراز کر رہی ہے۔

آخر میں ہم ارباب اقتدار سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ آخر کب تک ڈی پی او دفعہ ۱۴۴ اور امتناعی قوانین کی بیساکھیوں کے سہارے چلتے رہیں گے؟ آپ عوام کے منتخب نمائندے ہیں اور جمہوری عمل کے راستے سے آئے ہیں، اس لیے جمہوری عمل بحال کر کے جمہوری طریقوں سے اپوزیشن کا سامنا کیجئے۔ جمہوری عمل کے تعطل نے ہی تیرہ کروڑ مسلمانوں کے پاکستان کو دولخت کر دیا تھا اور اب پھر یہ تعطل دھیرے دھیرے منطقی نتائج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لیے اگر آپ حضرات نے جمہوری ذرائع سے عوام کو اعتماد میں لینے کا راستہ اختیار نہ کیا تو حالات جو رخ بھی اختیار کریں گے آپ حضرات اس کی ذمہ داری سے دامن نہیں چھڑا سکیں گے۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور...... ۳۰ اگست ۱۹۷۴ء)

بھارت کا ایٹمی دھماکہ!

انڈیا نے گزشتہ روز راجستھان کے صحراؤں میں پہلا ایٹمی دھماکہ کیا اور اس طرح امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کے بعد ایٹمی طاقتوں کی فہرست میں چھٹے ملک کا اضافہ ہوگیا۔ بھارت کے اس ایٹمی دھماکے پر عالمی رائے عامہ کی طرف سے ملے جلے ردعمل کے اظہار کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان اور دوسرے بہت سے ممالک نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس دھماکے سے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کو نقصان پہنچے گا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے یہ بھی کہا ہے کہ پاکستان بھارت کے اس اقدام سے مرعوب نہیں ہوگا۔

ایٹم اس دور میں قوت وتوانائی کا محور شمار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس قوت سے بہرہ ور ممالک ہی آج دنیا کے بڑے ممالک سمجھے جاتے ہیں اور عملاً دنیا کی قیادت انہی ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ حتیٰ کہ اقوام عالم کے مابین عدل وانصاف کے سب سے بڑے علمبردار ادارہ اقوام متحدہ میں بھی ایٹمی قوتوں کو خصوصی اور امتیازی مراعات واختیارات حاصل ہیں۔ ایٹم جہاں قوت وتوانائی کا نشان ہے وہاں تباہی و بربادی کا بھی ایک خوفناک ذریعہ ہے۔ اور انتہائی افسوس کی بات ہے کہ تہذیب وامن کی نام نہاد پرچارک بڑی طاقتوں نے اس عظیم قوت کو انسانیت کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنے کی بجائے تباہی اور بربادی کا ذریعہ بنانے کو ترجیح دی ہے۔ نتیجتاً ایٹمی ہتھیاروں کی آج اس قدر بہتات ہو چکی ہے کہ خود ایٹمی طاقتیں دوسری اقوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بسا اوقات ایٹمی اسلحہ میں تخفیف کی بات کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

بڑی طاقتوں کے اسی دوہرے کردار کے باعث وہ ایٹم جو انسانی ترقی وفلاح میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے آج اس کا نام زبان پر آتے ہی تباہی و بربادی کے ہولناک تصورات ذہنوں میں

لرزنے لگتے ہیں گویا ’’ایٹم‘‘ اور ’’تباہی‘‘ مترادف لفظ ہیں۔ اسی بنا پر بھارت کے اس دعوے کو عالمی رائے عامہ نے کوئی وقعت نہیں دی کہ وہ ایٹمی قوت کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کرے گا کیونکہ اس کی پیشرو ایٹمی قوتوں نے ’’پرامن مقاصد‘‘ کے حسین خول اور ’’تخفیفِ اسلحہ‘‘ کی خوبصورت اوٹ میں ہی انسان کی ہلاکت وخانماں بربادی کے سامان تیار کیے ہیں بلکہ دن رات ان ہتھیاروں کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے۔

ایٹمی طاقتوں میں ایک اور کے اضافے سے عالمی سطح پر کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی اور برصغیر میں کونسی اور حقیقتیں تسلیم کی میز پر رونمائی کے لیے تشریف فرما ہوں گے، اس کے بارے میں صورتحال جلد واضح ہو جائے گی۔ سردست ہم عالم اسلام کے قائدین کو اس طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالیں اور بڑی طاقتوں کے مفادات سے الگ ہو کر کچھ دیر کے لیے اپنے سود وزیاں کی بابت سوچیں۔ آخر عالم اسلام کب تک بے یقینی کی اس دلدل میں پھنسا رہے گا؟ جہاں تک وسائل کا تعلق ہے عالم اسلام کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن ان وسائل پر اغیار کا تسلط ہے اور مسلم ممالک اپنے وجود کی حفاظت تک کے لیے ’’دشمن‘‘ سے تحفظ کے حصول پر مجبور ہیں۔ عالم اسلام کے قائدین کو یہ باور کر لینا چاہیے کہ مسلم ممالک کا روشن مستقبل بڑی طاقتوں کے دامن سے وابستہ ہو کر سیاسی و دفاعی تحفظ کے حصول میں نہیں بلکہ اپنے تمام تر وسائل کو مجتمع کر کے صنعتی و دفاعی سائنس میں بڑی طاقتوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھنے میں مضمر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اپنی استطاعت اور وسائل کی حد تک قوت فراہم کرو۔ اور آج کے دور میں قوت وطاقت کے بغیر کسی قوم کا باوقار طور پر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اس لیے ہم جس قدر جلد یہ راستہ اختیار کر لیں گے عالم اسلام کے لیے مفید اور یقین واعتماد کا باعث ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے قائدین کو صحیح سمت چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الٰہ العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور...... ۲۴ مئی ۱۹۷۴ء)

ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ اور امریکہ

امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے کے سلسلہ میں پاکستان کے اقدامات کی ایک بار پھر مخالفت کی ہے جبکہ دوسری طرف موصوف نے دہلی کے دورہ کے موقع پر پر بھارت کی طرف سے ایٹمی تحفظات فراہم کرنے سے انکار کے باوجود بھارت کو امریکہ کی طرف سے ایٹمی ایندھن کی فراہمی جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے۔ (ملخص از جنگ کراچی ۸ جنوری ۱۹۷۸ء)

پاکستان کے بارے میں امریکہ کا رویہ باہمی دفاعی معاہدوں کے باوجود ہمیشہ محل نظر رہا ہے اور مذکورہ بالا خبر غماز ہے کہ ابھی تک امریکہ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر لیا اور وہ اسلحہ کے معاملہ میں کافی حد تک خود کفالت کی راہ پر گامزن ہے لیکن پاکستان کا فرانس سے ایٹمی پراسیسنگ پلانٹ خریدنے کا معاملہ ابھی تک امریکہ کی نظر میں کھٹک رہا ہے۔ حالانکہ پاکستان بار بار یہ اعلان کر چکا ہے کہ وہ ایٹمی پلانٹ کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کرے گا۔

ہماری رائے میں پاکستان کو بڑی طاقتوں پر سہارا کرنے کی بجائے خود اپنے وسائل کو زیادہ سے زیادہ کام میں لانے اور اسلامی ممالک کے تعاون سے اسلحہ کی بھاری صنعت کو فروغ دینے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہی راستہ پاکستان اور عالم اسلام دونوں کے لیے عزت و وقار اور سلامتی کا واحد راستہ ہے۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ...... ۱۴ جنوری ۱۹۷۸ء)

روسی وزیر دفاع کا دورۂ بھارت

روسی وزیر دفاع مارشل استینوف تیس رکنی وفد کے ہمراہ ان دنوں بھارت کے دورہ پر ہیں اور انہوں نے بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ ایک گھنٹہ کی علیحدہ ملاقات کے علاوہ بھارتی رہنماؤں سے باقاعدہ مذاکرات کیے اور بھارت کی دفاعی ضروریات کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا کہ بھارت کو دفاعی طور پر خودکفیل بنانے کے لیے روس اس کی امداد جاری رکھے گا اور بھارت کو اکیلا نہیں چھوڑا جائے گا۔

روس اور بھارت کے درمیان دوستی کا معاہدہ اور دفاع میں تعاون کے عنوان سے بھارت کو بھاری اسلحہ کی فراہمی کا یہ سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔ جہاں تک دو قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلقات کے خوشگوار اور دوستانہ ہونے کا تعلق ہے یہ ایک اچھی بات ہے اور اصولی طور پر اس پر کسی حوالہ سے اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جنوبی ایشیا کی مخصوص علاقائی صورتحال کے پس منظر میں روس بھارت تعلقات میں یہ تیز رفتار پیشرفت پاکستان سمیت ان تمام ممالک کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو اس خطہ میں امن کی صورتحال کو مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں۔ بھارت ایک عرصہ سے پاکستان سے مفروضہ خطرہ کی دہائی دے کر نہ صرف اسلحہ کے انبار لگا رہا ہے بلکہ خود بھی اسلحہ کی تیاری میں خودکفالت کی حد چھونے کو ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اسلحہ کس کے خلاف جمع کیا جا رہا ہے؟ بھلا پاکستان سے بھارت کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اسلحہ کی تیاری اور ذخیرہ کے لحاظ سے بھارت اور پاکستان کا موازنہ کیا جائے تو کوئی ذی شعور بھارت کے اس واویلا کو قبول نہیں کر سکتا جو وہ پاکستان سے خطرہ کے نام سے مسلسل مچا رہا ہے۔

دوسری طرف پاکستان اپنی بنیادی دفاعی ضروریات کے لیے امریکہ پر انحصار کرنے پر مجبور ہے

اوراس نے امریکہ سے نقد ادائیگی کی بنیاد پر اسلحہ کی خریداری کا جو سودا کیا ہے اس کے حصول کے پیچیدہ مراحل تو نہ جانے کب مکمل ہوں گے لیکن بھارت نے اس کے خلاف آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ کچھ عرصہ سے بھارتی رہنماؤں کی طرف سے آزاد کشمیر کو بھارت میں شامل کرنے، پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو ہدف بنانے اور دیگر معاملات پر جذبات کا اظہار جس تند و تلخ لہجہ میں ہوا ہے اس کے پیش نظر روسی وزیر دفاع کے دورۂ بھارت اور بھارت کو جدید اسلحہ کی سپلائی کے وعدوں پر ہم تشویش کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اوراس اظہارِ تشویش کا مقصد قومی رہنماؤں کو اس صورتحال کی نزاکت کا احساس دلانا ہے کہ وہ اپنی شب وروز کی دیگر قومی مصروفیات اور گفت وشنید میں ملکی سالمیت تعلق رکھنے والے اس اہم مسئلہ کو بھی توجہ اور غور وفکر کے دائرہ میں لائیں۔

ملکی سالمیت کا تحفظ ہمارا سب سے پہلا مسئلہ ہے کیونکہ ملک رہے گا تو سب کچھ باقی رہے گا اور سارے جھگڑے طے ہو سکیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ملک کی سالمیت کے تقاضے ادھورے رہ گئے تو پھر کچھ بھی نہیں رہے گا، اس لیے ہمیں حقیقی طور پر درپیش خطرات کا احساس کرتے ہوئے قومی وحدت کے فروغ کے لیے ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے۔

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ...... ۲۶ مارچ ۱۹۸۲)

دفاعی بجٹ میں کمی، قومی خودکشی کے مترادف

ان دنوں عالمی طاقتوں اور اداروں کی طرف سے پاکستان کو مسلسل یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کرے اور جدید ہتھیاروں کی تیاری سے گریز کرنے کے علاوہ فوج کی تعداد بھی گھٹائے۔ خود ہمارے بعض دانشور بھی اسی خیال کا اظہار کر رہے ہیں اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی اور خوشحالی کے لیے دفاعی اخراجات کو کم سے کم کرنا ضروری ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے حضرات دو باتوں کو بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اور اس ناتے سے اسے دنیا بھر کی اسلام دشمن قوتوں سے خطرہ ہے،

(۲) دوسری یہ کہ پاکستان کا سابقہ بھارت سے ہے جس کی تنگ نظر ہندو اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کی گزشتہ ایک ہزار برس سے مسلسل محاذ آرائی ہے۔ اور کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے تب بھی اس تاریخی پس منظر کے ہوتے ہوئے اس کشیدگی اور محاذ آرائی کا ختم ہونا ممکن نہیں ہے۔

ان تاریخی حقائق کے ہوتے ہوئے پاکستان کو دفاعی اخراجات میں کمی اور فوج کو گھٹانے کا مشورہ یقیناً پاکستان کی خیر خواہی نہیں ہے۔ پھر اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ مشورہ اسلامی تعلیمات کے بھی یکسر منافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

''دشمن کے مقابلہ میں جتنی قوت تمہارے بس میں ہو مہیا کرو تا کہ دشمن پر تمہارا رعب قائم رہے۔'' (الانفال)

گویا حکمِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کی دفاعی قوت اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ دشمن کے مقابلہ میں طاقت کا توازن ان کے حق میں ہو کیونکہ اس کے بغیر دشمن پر رعب قائم ہونا اور دشمن کا مسلمانوں کی قوت سے مرعوب ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت اس امر پر متفق ہیں کہ جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری اور مکمل دفاعی ٹیکنالوجی کا حصول مسلمانوں کے دینی فرائض میں سے ہے اور اس معاملہ میں کوتاہی کر کے مسلمان حکومتیں اپنی شرعی ذمہ داری سے کوتاہی کی مرتکب ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر بھی اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو اس معاملہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔'' (البقرہ)

اس آیت کریمہ کی تشریح میں امام ترمذیؒ نے صحیح سند کے ساتھ ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ملک کی عمومی اقتصادی صورتحال اور دفاعی اخراجات کے درمیان توازن و تناسب کے سلسلہ میں اسلام کے مزاج اور ہدایات کا پتہ چلتا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ معروف صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے موقع پر مسجد نبویؐ اور اس کے ملحقہ حجروں کی تعمیر تک رسول اکرمؐ کے میزبان رہے، اور حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں اس وقت کی ایک بڑی قوت سلطنت روما کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے شوق میں بڑھاپے اور ضعف کے باوجود اصرار کر کے لشکر میں شامل ہوئے، ان کی قبر رومی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ (استنبول) میں ہے۔ وہ رومیوں کے خلاف جنگ کے دوران ایک محاذ پر تھے جہاں مسلمانوں اور رومیوں کا آمنا سامنا ہوا اور ایک پرجوش مسلمان مجاہد مسلمانوں کی صف سے نکل کر اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس گیا جس پر کسی صاحب نے قرآن کریم کی یہ آیت بلند آواز سے پڑھی ''**ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ**'' کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس نوجوان

نے اکیلے دشمن کی صفوں میں گھس کر غلطی کی ہے جو اس آیت کریمہ کی منشا کے خلاف ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے لوگوں کی زبان سے اس آیت کریمہ کا حوالہ سن کران کوٹوکا اور فرمایا کہ تم نے آیت کا مطلب صحیح نہیں سمجھا کیونکہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیت ہم انصار مدینہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس میں ہمیں ایک غلط سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابوایوب انصاریؓ نے اس کا پس منظر یوں بیان فرمایا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہم انصار مدینہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ ؐ کی نصرت و رفاقت میں مصروف ہوگئے۔ ہجرت کے دوسرے سال ہی غزوات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور مسلسل چند برس ایسے گزرے کہ ہم اپنے کاروبار، کھیتی باڑی اور معاشی حالات کی طرف توجہ نہ دے سکے جس سے ہماری معاشی صورتحال ناگفتہ بہ ہوگئی۔لیکن چند برسوں کے بعد جب مسلمان مضبوط ہوگئے اور کفار کی پے در پے شکستوں کے باعث کچھ استحکام کی صورتحال نظر آنے لگی تو بعض انصارؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب حالات خاصے بدل گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری اس طرح کی مدد کی ضرورت نہیں رہی اس لیے ہمیں جہاد کے معاملات سے تھوڑا سا صرف نظر کر کے اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور کھیتی باڑی اور کاروبار کے معاملات کی طرف دوبارہ متوجہ ہونا چاہیے۔اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی کہ

"اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔" (البقرہ)

اس لیے اس آیت میں ہم انصار مدینہ کو اس سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے اور اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔آیت کریمہ کے مطابق ہلاکت کا راستہ یہ ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیا جائے جس کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہوگی اور طاقت کا توازن دشمن کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اس وضاحت کے ساتھ یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں معاشی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ فوجی اور دفاعی قوت کا توازن و

تناسب اس طور پر قائم رکھنا ضروری ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں فوجی قوت کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی فوجی قوت میں کمی کرنا قرآن کریم کی زبان میں ''قومی خودکشی'' کہلائے گا۔

اس پس منظر میں جب ہم آج پاکستان کو درپیش صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف عالمی سازشوں اور بھارت کی فوجی طاقت میں مسلسل اضافہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یقیناً پاکستان کی فوجی قوت میں کمی کے مشورے وطن عزیز کے مفاد کے منافی دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے مذکورہ بالا دونوں احکام یعنی وقت کی جدید ترین فوجی قوت کے حصول کا حکم اور فوجی اخراجات میں کمی کو ہلاکت کا راستہ قرار دینا ہماری فوجی اور دفاعی پالیسی کو واضح طور پر یہ رخ دیتے ہیں کہ ہم دفاع کے لیے ایٹمی قوت کے حصول کی کوشش کریں اور انصار مدینہؓ کی طرح ہر قسم کی تنگی ترشی اور معاشی نقصانات برداشت کرتے ہوئے پاکستان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک مستحکم اور ناقابل شکست فوجی قوت بنانے کی طرف توجہ دیں۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... مئی ۱۹۹۵ء)

دفاعی پالیسی، قرآنی احکام کی روشنی میں

قومی حلقوں میں ان دنوں ایٹمی پروگرام کے حوالہ سے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے لیے حکومت پاکستان کی آمادگی زیر بحث ہے اور اسے امریکی دباؤ کا نتیجہ قرار دے کر اس پر سخت تنقید کی جا رہی ہے۔ یہ مجوزہ معاہدہ جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۵۱ ویں اجلاس میں زیر بحث آنے والا ہے اس کے تحت ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے کو کسی بھی ملک کی ایٹمی تنصیبات کو چیک کرنے کا اختیار مل جائے گا۔ اس سمجھوتے کے ضمن میں یہ تجویز بھی زیر غور ہے کہ ایٹمی توانائی کے حوالہ سے بین الاقوامی طاقتوں کی قائم کردہ حدود کی خلاف ورزی کرنے والے ملک کی اقتصادی ناکہ بندی کے ساتھ ساتھ اس کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر کے انہیں تباہ کرنے کا اختیار بھی عالمی ادارے کو مل جائے۔

اس وقت دنیا میں امریکہ، روس، چین، فرانس، اور برطانیہ باضابطہ طور پر ایٹمی قوت شمار ہوتے ہیں جبکہ اسرائیل، بھارت، اور پاکستان کو ایٹمی صلاحیت کا حامل سمجھا جا رہا ہے۔ اسرائیل اور بھارت اپنی ایٹمی صلاحیت کا اعلان کر چکے ہیں جبکہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت غیر اعلان شدہ ہے بلکہ ہمارے حکمرانوں کے بقول عالمی دباؤ کی وجہ سے پاکستان کے ایٹمی توانائی کے حصول کا پروگرام منجمد کیا جا چکا ہے اور اسے رول بیک کرنے کے لیے دباؤ جاری ہے۔

سی ٹی بی ٹی پر پاکستان اور بھارت دونوں اب تک دستخط کرنے سے انکار کرتے چلے آ رہے ہیں اور پاکستان کا موقف یہ رہا ہے کہ جب تک بھارت اس پر دستخط نہ کر دے پاکستان دستخط نہیں کرے گا کیونکہ یہ علاقہ میں فوجی قوت کے توازن کا مسئلہ ہے جس سے صرف نظر کرنا پاکستان کی سالمیت کے منافی ہوگا۔ مگر اب جبکہ بھارت دستخط سے انکار پر بدستور ڈٹا ہوا ہے، حکومت پاکستان

نے اس سمجھوتے پر یکطرفہ طور پر دستخط کرنے کا عندیہ دے دیا ہے جس پر قومی حلقوں میں بجا طور پر تشویش واضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کی فوجی قوت کے بارے میں بھی امریکہ اور دیگر عالمی قوتوں کے اس دباؤ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ پاکستان اپنی قوت کو کم کر دے اور دفاعی اخراجات کو عالمی قوتوں کی مقرر کردہ حدود میں لے آئے، اس صورت میں پاکستان کے دفاع کی ضمانت دینے کی بات بھی کی جا رہی ہے۔

ہم اس موقع پر اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کیونکہ ایک مسلمان ملک ہونے کے علاوہ اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے نافذ العمل دستور کی رو سے بھی ہم ہر معاملہ میں شرعی حدود کے دائرہ میں رہنے کے پابند ہیں۔ فوجی قوت کے بارے میں قرآن کریم نے ایک ہی جملہ میں مسلمانوں کو واضح ہدایت دے دی ہے کہ

واعدّوا لهم ما استطعتم من قوة. (الانفال ۶۰)

''اور ان کے مقابلہ میں جتنی قوت تمہارے بس میں ہو فراہم کرو''۔

اس کے ساتھ ہی اس کی حد بھی بیان فرمائی کہ

ترهبون به عدو اللّٰه وعدوكم. (الانفال ۶۰)

''تاکہ اس قوت کے ساتھ تم اللہ کے اور اپنے دشمن کو خوفزدہ کر سکو''۔

آج کی اصطلاح میں اس کا معنی یہ ہوں گے کہ دشمن کے مقابلہ میں طاقت کا توازن تمہارے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی ترمذی شریف کی ایک روایت بھی ملاحظہ فرمالیں جس میں حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ انصار مدینہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد اپنے باغات اور کاروبار وغیرہ سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن حضور علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے تھے اور مسلسل جنگوں کی وجہ سے ان کی معاشی حالت خاصی متاثر ہو گئی تھی، غالباً غزوۂ خیبر کے بعد انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اب اسلام کو پہلے کی طرح کا خطرہ نہیں رہا اور صورتحال خاصی بہتر ہو گئی ہے اس لیے ہمیں جہاد پر زیادہ خرچ کرنے کی بجائے اب اپنے باغات اور کاروبار سدھارنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ

وانفقوا في سبيل اللّٰه ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة. (البقره

۱۹۶)

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو''۔

گویا اللہ رب العزت نے انصار مدینہ کو تنبیہ فرمائی اور دفاعی اخراجات کی کمی کو ''قومی خودکشی'' قرار دیا۔ ان احکام الٰہی کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایٹمی توانائی کے حصول کے سلسلہ میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا اور دفاعی اخراجات میں کمی کی تجاویز قومی خودکشی کے مترادف ہیں۔ چنانچہ ہر باغیرت اور محبّ وطن پاکستانی کی ذمہ داری ہے کہ اس پر جتنا احتجاج اس کے بس میں ہو وہ اس سے گریز نہ کرے۔

(روزنامہ وفاق، لاہور ...... ۱۲ اگست ۱۹۹۶ء)

بھارت کے ایٹمی دھماکے اور پاکستان

بھارت نے پے در پے پانچ ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان کے لیے اپنے خیال میں جو مشکل صورتحال پیدا کر دی ہے اس پر قومی حلقوں میں مسلسل بحث جاری ہے۔ حالات کا رخ بتا رہا ہے کہ پاکستان کو بھی اپنی ایٹمی پوزیشن اب عملاً واضح کرنا ہی پڑے گی۔ باخبر حلقوں کے مطابق پاکستان اس کی تیاری کر رہا ہے اور ان سطور کی اشاعت تک یقیناً اس کی کوئی عملی شکل سامنے آ چکی ہو گی۔ ادھر امریکہ نے پاکستان پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا ہے کہ وہ ایٹمی دھماکہ نہ کرے اور اس کے بدلے کچھ مراعات حاصل کر لے جن میں قرضوں میں چھوٹ کے علاوہ ایف سولہ طیاروں کی فراہمی بھی شامل ہے۔

ہمارے خیال میں اصل قصہ یہ ہے کہ امریکہ بہادر ایک عرصہ سے اس کوشش میں ہے کہ جنوبی ایشیا کے ممالک کو چین کے خلاف ایک بلاک کی شکل دی جائے جس کی قیادت بھارت کے ہاتھ میں ہو، اور پاکستان بھارت کی قیادت اور بالادستی کو قبول کرتے ہوئے اس بلاک میں ایک فعال ممبر کی حیثیت سے شریک ہو۔ امریکی صدر بل کلنٹن کے نومبر ۱۹۹۸ء کے دوران جنوبی ایشیا کے مجوزہ دورے سے پہلے امریکی حکام چاہتے ہیں کہ صورتحال واضح ہو جائے تاکہ صدر امریکہ کو اس موقع پر معاملات اور ترجیحات طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری تھا کہ بھارت ایٹمی دھماکے کر کے اپنے بالاتری کا عملی اظہار کرے جو اُس نے کر دیا ہے۔ اور یہ بھی اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے کہ پاکستان ایٹمی دھماکے سے گریز کرے تاکہ وہ بھارت کے برابر کی پوزیشن حاصل نہ کر سکے۔ اور اس طرح جنوبی ایشیا کو بھارت کی قیادت میں چین کے خلاف متحد کرنے کا پروگرام مکمل کرایا جائے۔

پاکستان کو ایٹمی دھماکے سے روکنے اور اس کی مسلح افواج کی ڈاؤن سائزنگ کی تجویزوں کے پیچھے یہی خواہش کارفرما ہے، اور اس کے لیے مسئلہ کشمیر کے کسی نہ کسی حل سمیت پاکستان کو بہت سے مفادات کا لالچ دیا جا رہا ہے۔ لیکن بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان کی رائے عامہ نے جس پرجوش ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ ہر لحاظ سے حوصلہ افزا ہے، اور کسی بھی حکومت کے لیے قوم کے اس جوش و جذبہ کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ہمارا موقف شروع سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایسی عسکری قوت کے حصول کا حکم دیا ہے جو دشمن پر مسلمانوں کا رعب قائم رکھنے کا باعث ہو۔ لیکن بدقسمتی سے دنیا بھر کی مسلم حکومتیں اس قرآنی حکم پر عمل کے سلسلہ میں کوتاہی سے کام لے رہی ہیں جس کی وجہ سے عالمِ اسلام جدید دفاعی ٹیکنالوجی اور ایٹمی قوت سے مسلسل محروم چلا آ رہا ہے۔ اب اگر پاکستان اس طرف عملی پیش قدمی کرتا ہے اور استعماری قوتوں کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے ایٹمی قوت ہونے کا اعلان کرتا ہے تو یہ نہ صرف قومی حمیت کا اظہار اور غیور مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہوگی بلکہ قرآن کریم کے ایک واضح حکم کی تعمیل بھی ہوگی جو یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد اور فضل و رحمت کا باعث بنے گی۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ...... جون ۱۹۹۸ء)

پاکستان کا ایٹمی دھماکہ اور مستقبل کی پیش بندی

بالآخر تاریخ کا وہ فیصلہ کن مرحلہ آ پہنچا جس کا پوری ملت اسلامیہ کو ایک مدت سے انتظار تھا اور جس کے لیے لاکھوں پیشانیاں بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوتی رہی ہیں اور جسے دیکھنے کی حسرت دل میں لیے کروڑوں مسلمان قبروں میں جا بسے۔ جب مجھے مقامی صحافی دوست جناب محمد شفیق نے فون کر کے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی خبر دی تو دل اور آنکھوں پر قابو نہ رہا۔ انہوں نے اس پر تبصرہ کرنے کو کہا تو زبان کو الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ انہیں چند منٹ انتظار کا کہہ کر حواس کو مجتمع کیا اور دل و دماغ اور زبان کا رشتہ پھر سے جوڑ کر بمشکل چند جملے ترتیب دے سکا۔

شام چھ بجے ٹی وی پر وزیراعظم کا خطاب سنا اور رات نو بجے خبرنامہ دیکھا تو خوشی کی انتہا نہ رہی کہ یہ کیفیت صرف میری نہیں بلکہ ہر اس پاکستانی کی ہے جو پاکستان کے لفظ کا معنٰی سمجھتا ہے، پاکستان کے قیام کے مقصد سے آگاہ ہے اور مسلم ممالک کی برادری میں پاکستان کے مقام و مرتبہ سے باخبر ہے۔ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف نے اپنے خطاب میں حالات کا جو تناظر پیش کیا ہے اور ایٹمی دھماکوں کے ناگزیر ہونے کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ بلاشبہ حقیقت پسندانہ ہیں اور ان پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے والا کوئی بھی شخص ان کی واقعیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کے خطاب سے پہلے تلاوت کرنے والے قاری صاحب نے قرآن حکیم کی جن آیات کا انتخاب کیا وہ عالم اسلام کے موجودہ حالات اور ملت اسلامیہ کی دینی ذمہ داریوں کی بہت صاف اور واضح عکاسی کر رہی تھیں۔ انہوں نے سورۃ الاحزاب کی چند آیات پڑھیں جن میں غزوۂ خندق کا ذکر

ہے۔

غزوۂ خندق میں عرب کے کم وبیش سب قبائل نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا تھا اور چاروں طرف سے مدینہ منورہ کی طرف یلغار کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی ان آیات میں مسلمانوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ اس وقت کو یاد کرو جب عرب قبائل ہر طرف سے تم پر چڑھ دوڑے تھے اور تمہارے خوف کا عالم یہ تھا کہ آنکھیں خوف کے مارے ٹیڑھی ہوگئی تھیں اور دل حلق میں جا اٹکے تھے، جب مومنوں کو آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا اور انہیں ہلا کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہوا کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی کہ مدینہ منورہ کا محاصرہ کرنے والا ہزاروں کا لشکر آندھی کا شکار ہوگیا۔ تیز ہوا نے خیمے اکھاڑ دیے، چولہے الٹ گئے، خیموں کو آگ لگ گئی اور محاصرہ کرنے والوں کے لیے فرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ یہ واقعہ بھی اسی جنگ کا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں محصور ہو کر دفاع کا فیصلہ کیا اور حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز پر مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنے کی تدبیر اختیار کی جو کہ عربوں کے لیے ایک نئی جنگی تکنیک تھی۔ اور یہ واقعہ بھی اسی جنگ میں رونما ہوا کہ خندق کھودتے ہوئے ایک صحابیؓ نے جناب نبی اکرمؐ سے بھوک کی شکایت کی اور پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ بھوک کو دبانے کے لیے اس نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے اسے صبر کی تلقین کرتے ہوئے اپنے پیٹ مبارک سے کپڑا اٹھا دیا اور اس صحابیؓ کو یہ دیکھ کر حوصلہ ہوا کہ اسے صبر کی تلقین کرنے والے راہنما کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ وزیراعظم کے اس خطاب سے پہلے تلاوت کے لیے ان آیات کریمہ کا انتخاب جس نے بھی کیا ہے اس نے ہمارے سامنے موجودہ اور آنے والے حالات کا پورا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ اور قرآن کریم کی زبان میں یہ بتا دیا ہے کہ ایٹمی دھماکے کا تاریخی فیصلہ کرنے کے بعد تمہارے خلاف دنیا کی بڑی اقوام کا متحدہ محاذ بنے گا، ہر طرف سے تم پر یلغار ہوگی، تمہاری معاشی حالت پیٹ پر پتھر باندھنے جیسی ہوسکتی ہے اور تمہیں ہراساں اور خوف زدہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔ لیکن اگر تم ثابت قدم رہے، ایمان کا دامن تھامے رکھا اور آزمائش پر پورا اترے تو خدا کی غیبی قوتیں تمہارے حق میں حرکت میں آئیں گی اور تمہارے مخالفین کے لیے شکست

مقدر ہو کر رہے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ خندق کے موقع پر مدینہ منورہ کا محاصرہ کرنے والے عرب قبائل کی شکست وفرار کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے کہ:

''اور اللہ تعالیٰ نے کفار کو ان کے غصے سمیت واپس پلٹا دیا اور وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکے اور اللہ مومنوں کو لڑائی میں کافی ہو گیا۔''

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ حالات کی نامساعدت اور اسباب کی ناموافقت جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور اہل ایمان کا اس حالت میں بھی خدا کی مدد پر ایمان قائم رہتا ہے تو پھر امید کی کرن پھوٹتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے حالات پلٹا کھا جاتے ہیں۔ اس پر بطور مثال دو واقعے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک واقعہ ہجرت کا ہے کہ آنحضرتؐ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے، ظاہری کیفیت یہ تھی کہ ننگی تلواروں کے گھیرے کو توڑ کر گھر سے نکلے تھے اور عام راستے کی بجائے اجنبی راستے سے مدینہ کی طرف چھپتے چھپاتے سفر کر رہے تھے۔ لیکن راستے میں جب سراقہ بن مالکؓ نے ایک ٹولی کے ساتھ آپؐ کو گرفتار کرنے میں ناکام ہو کر واپس جانے کی بات کی تو آپ نے سراقہ سے فرمایا کہ

''میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔''

یہ پیش گوئی رسول اللہؐ کا معجزہ تھا جو حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں پوری ہوئی۔ لیکن یہ محض پیش گوئی نہ تھی بلکہ اس میں ایک واضح سبق بھی ہے کہ مسلمان کو ظاہری حالات کے وقتی ماحول کا اسیر نہیں رہنا چاہیے۔ اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے اعلیٰ ترین مقصد اور نصرت خداوندی کی طرف نظر رکھنی چاہیے کہ اس کا اصل سرمایہ یہی ہے۔

دوسرا واقعہ غزوۂ احزاب کا ہے جس کا ظاہری منظر سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے کہ انتہائی خوف کی کیفیت تھی، مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے خندق کی کھدائی کا کام دن رات جاری تھا اور اس ظاہری منظر کو دیکھنے والے یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ اب مسلمانوں کو کہیں جائے پناہ میسر نہیں آئے گی۔ لیکن اسی حالت میں رسول اللہؐ ایک چٹان کو توڑنے کے لیے کدال کی ضرب لگاتے ہیں تو اس میں سے چمک اٹھتی ہے جس پر حضورؐ اپنے ساتھیوں کو خوشخبری دیتے ہیں کہ مجھے اس چمک میں اللہ تعالیٰ نے روم کے بادشاہ قیصر اور فارس کے بادشاہ کسریٰ کے محلات دکھائے ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھوں فتح

ہوں گے۔اس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں، پریشانیوں اور مشکلات کی ایک لہر ضرور آئے گی جو شدید سے شدید تر بھی ہوسکتی ہے، لیکن اگر ایمان اور اس کے تقاضوں پر ثابت قدم رہے تو انہی پریشانیوں اور مشکلات کی کوکھ سے عظیم تر کامیابیاں جنم لیں گی۔اور حالات کا رخ بتاتا ہے کہ آنے والی صدی مسلمانوں کے لیے انہی کامیابیوں کو اپنے دامن میں سنبھالے غزوۂ احزاب جیسے ایمان والے مسلمانوں کی راہ تک رہی ہے۔

میاں محمد نواز شریف اور ان کی حکومت کو اس عظیم کارنامے پر قوم کے ہر طبقے اور ہر محبّ وطن شہری نے مبارک باد دی ہے۔اس مبارک باد میں ہمارے قابل فخر سائنس دان ڈاکٹر عبد القدیر، جنرل ضیاء الحق مرحوم اور جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم بھی شریک ہیں۔اور اپنے جوش و جذبہ کے ساتھ ان کی پشت پر کھڑی رہنے والی پاکستانی قوم اور پاکستان سے اپنی امیدیں اور آرزوئیں وابستہ کرنے والی پوری ملت اسلامیہ ان سب سے زیادہ مبارک باد کی مستحق ہے۔

لیکن میں ایٹمی دھماکے کے ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ ایک اور دھماکے پر میاں نواز شریف کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ وہ وزیراعظم سیکرٹریٹ کی عالی شان عمارت چھوڑ دینے اور تعیش اور آسائش کا راستہ ترک کر دینے کا دھماکہ ہے جو میرے جیسے نظریاتی کارکن کے لیے ایٹمی دھماکے سے بھی بڑا ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس تجربہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو نہ صرف عسکری میدان میں بلکہ اقتصادی اور معاشی میدان میں بھی آج کی قوتوں کے سامنے کھڑے ہو سکتے ہیں۔اور عالمی بینک، آئی ایم ایف اور ان جیسے دیگر عالمی اداروں کے ظالمانہ چنگل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیم بھی یہی ہے کہ یہ دنیا خواہشات کی نہیں بلکہ ضروریات کی دنیا ہے۔اس دنیا میں خواہشات کسی بھی شخص کی پوری نہیں ہوسکتیں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے آخرت کی وسیع اور لامتناعی دنیا سجا رکھی ہے۔اس لیے اس دنیا میں ہم سب اگر اپنے آپ کو ضروریات تک محدود رکھیں تو سوسائٹی کے ہر شخص کی ضروریات با آسانی پوری ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ خرابی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں کچھ لوگ ضروریات کا دائرہ پھلانگ کر دنیا کے محدود وسائل سے لامحدود خواہشات پوری کرنے کے لیے لگژری اور تعیش کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔اس سے وسائل اور ضروریات کا توازن بگڑ جاتا ہے اور چند لوگوں کی خواہشات پر بے شمار لوگوں کی

ضروریات قربان ہو جاتی ہیں۔ اسلام کے معاشی فلسفے کی بنیاد اسی پر ہے اور یہی خلافت راشدہ کا طرۂ امتیاز تھا۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ پورے معاشی نظام پر از سرِ نو نظر ڈالی جائے اور وزیراعظم جس انقلاب کی بات کر رہے ہیں اس کی ابتدا اسی شعبہ سے کی جائے۔ مگر اس کے لیے عمر بن عبدالعزیزؒ بننا پڑے گا۔ اور میں وزیراعظم محترم کو مشورہ دوں گا کہ اگر وہ فی الواقع ملک میں کوئی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو عمر ثانی یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سوانح حیات اپنے ہاتھ میں رکھیں اور اس سے راہنمائی حاصل کریں۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ ایسا کر گزرے تو اکیسویں صدی میں ملت اسلامیہ کا داخلہ ایسا شاندار ہوگا کہ پچھلی دس صدیاں تو کم از کم اس پر ضرور رشک کریں گی اور میاں نواز شریف تاریخ اسلام میں ہمیشہ کے لیے زندہ باد ہو جائیں گے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۱۰ جون ۱۹۹۸ء)

بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی لاہور آمد

گزشتہ دنوں بھارت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی بس کے ذریعے لاہور آئے اور وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کے ساتھ ان کے مذاکرات کے بعد دونوں لیڈروں کی طرف سے ''اعلانِ لاہور'' جاری کیا گیا ہے، جس میں باہمی تنازعات کو شملہ معاہدے کی بنیاد پر آپس کی گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے تجارت اور دیگر شعبوں میں تعلقات کو بڑھانے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ میاں محمد نواز شریف نے ''اعلانِ لاہور'' کے بارے میں ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ بھی اس ''قراردادِ لاہور'' کی طرح مؤثر ہوگا جس میں پاکستان بنانے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا اور متحدہ ہندوستان کی تقسیم اور مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

بین الاقوامی پریس کے مطابق بھارتی وزیر اعظم کا یہ دورہ اور لاہور میں ان کی پذیرائی دونوں امریکی دباؤ کا نتیجہ ہیں، جو جنوبی ایشیا میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان اور بھارت کو متحد دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی خاطر دونوں ملکوں پر دباؤ بڑھا رہا ہے۔ جبکہ ملک کے مختلف حلقے اور ان کے ساتھ کشمیری جماعتوں نے اس سلسلہ میں خدشات کا اظہار کیا ہے کہ اس سارے کھیل میں کشمیر کے مسئلہ کو گول کیا جا رہا ہے، یا زیادہ سے زیادہ امریکی فارمولے کے مطابق کشمیر کے حصے بخرے کر کے اس قضیے کو مستقل طور پر ختم کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ اور بعض راہنما یہ خدشہ بھی پیش کر رہے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کو ایک بار پھر متحد کر کے اس خطہ پر بھارت کی بالادستی

قائم کی جا رہی ہے۔

یہ خدشات کہاں تک درست ثابت ہوتے ہیں ان کے بارے میں آنے والا وقت ہی بتائے گا، البتہ اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ان ریمارکس کا حوالہ دینا شاید نامناسب نہ ہو جو انہوں نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن مرحوم سے مذاکرات کے دوران دیے تھے کہ

> ''شیخ صاحب! آپ مسلم لیگی ہیں اور ہم کانگریسی۔ کل آپ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان بنا رہے تھے تو ہم نے منع کیا تھا کہ ایسا نہ کرو، اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ اور آج آپ پاکستان کو توڑ رہے ہیں تو ہم اس کی بھی مخالفت کر رہے ہیں کہ پاکستان کو تقسیم نہ کرو، اس سے مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔''

میاں محمد نواز شریف مسلم لیگ کے سربراہ ہیں، ان کے جذباتی حواری انہیں بانیء پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کا جانشین کہتے ہیں، اور مسلم لیگ کا دعوٰی ہے کہ پاکستان اس نے بنایا تھا، اس لیے ہم میاں صاحب محترم سے قرآن کریم کی زبان میں یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ

> ''اور اس عورت کی طرح مت ہو جاؤ جس نے اپنے ہی کاتتے ہوئے دھاگے کو مضبوطی کے بعد پھر سے تار تار کر دیا۔'' (النمل ۹۲)

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ...... اپریل ۱۹۹۹ء)

بھارت کی عظمت اور نجم سیٹھی کا خطاب

نجم سیٹھی سے میرا براہ راست تعارف نہیں ہے، اخبارات ہی کے ذریعہ کبھی کبھار ان کے خیالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں تفصیل کے ساتھ پڑھنے کا کبھی موقع نہیں ملا اور نہ کبھی اس کی ضرورت پیش آئی ہے۔ البتہ ان کی گرفتاری کے بعد جو صورتحال پیدا ہوئی ہے اور جس طرح ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی گرفتاری پر ردعمل کا اظہار ہوا ہے، حتیٰ کہ امریکی سفیر کو بھی لب کشائی کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، اس کے پیش نظر یہ خیال ہوا کہ انہیں پڑھنا چاہیے۔ یا کم از کم ان کے اس خطاب سے آگاہی کی کوئی صورت ضرور نکالنی چاہیے جو بھارت کی سرزمین پر ہوا اور جسے ان کی گرفتاری کے پس منظر میں خاصی اہمیت دی جا رہی ہے۔

خدا بھلا کرے ان کی اہلیہ محترمہ کا کہ انہوں نے اس خطاب کا متن اخبارات کو جاری کر دیا اور میرے جیسے لوگوں کی بھی اس خطاب تک رسائی ہوگئی۔ میں نے نجم سیٹھی کے خطاب کا مطالعہ کیا ہے اور اس لحاظ سے انہیں داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ انہوں نے جو محسوس کیا، یا جو کچھ ان کے دل میں تھا انہوں نے اس کا اظہار کر دیا۔ اور اس بات کا بھی لحاظ نہیں کیا کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور کن لوگوں کے سامنے گفتگو کر رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ جب دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے بھارت گئے تو اس وقت صورتحال یہ تھی کہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ ان کی اچھی خاصی ٹھن چکی تھی۔ اور وہ قومی سیاست میں جنرل ضیاء الحق کے خلاف ایک طاقت ور اور وسیع تر سیاسی اتحاد قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ دوسری طرف ان سے منسوب یہ جملہ بھی خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا کہ ’’ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں

تھے۔‘‘ یہ جملہ دراصل کیا تھا اور اس کی پوری کہانی کیا ہے، اس پر پھر کسی موقع پر عرض کروں گا کیونکہ میں اس کا عینی گواہ ہوں۔ سردست دہلی میں مولانا مفتی محمودؒ کی بھارت کے اخبار نویسوں کے ساتھ گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت کے مجموعی تناظر کو سامنے لانا چاہتا ہوں کہ اس پس منظر میں بھارت کے اخبار نویسوں نے مفتی صاحب مرحوم سے پاکستان کی داخلی صورتحال کے بارے میں کچھ سوالات کرنا چاہے تو مفتی صاحبؒ نے انہیں بلا تکلف ٹوک دیا کہ میں دہلی میں بیٹھ کر ان سوالات کا جواب نہیں دوں گا۔ کیونکہ یہ معاملات ہمارے گھر کے اندر کے ہیں اور یہاں میں صرف پاکستان کا نمائندہ ہوں۔

مگر نجم سیٹھی صاحب نے جس انداز میں پاکستان کی داخلی صورتحال پر بھارت میں بیٹھ کر بات کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں سرحدات اور دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کے وہ دائرے قائم نہیں رہے جو گزشتہ نصف صدی کی تاریخ کا حصہ چلے آرہے ہیں۔

جہاں تک پاکستان کی نظریاتی شناخت کا تعلق ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ ابھی تک قائم نہیں ہوئی۔ مگر ان کی یہ بات غلط ہے کیونکہ پاکستان کی قومی شناخت ۱۹۶۵ء میں دنیا بھر نے اس وقت دیکھ لی تھی جب بھارت نے لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے شب خون مارا تھا اور پوری قوم اس جارحیت کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی جس کی بنیاد لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر تھی۔ اور پھر اسی شناخت کو سبوتاژ کرنے کے لیے دنیا بھر کی قوتیں اور لابیاں متحرک ہو گئی تھیں۔ ہماری بدقسمتی یہ نہیں کہ ہم قومی شناخت نہیں رکھتے، بلکہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری شناخت کے ساتھ ہمارے حکمران طبقات کی کمٹمنٹ نہیں ہے۔ اور نجم سیٹھی جیسے دانشوروں کا ذہن جو کسی نہ کسی اوٹ میں حکمرانی کی کمین گاہوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اس قومی شناخت کو قبول نہیں کر رہا۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہمیں آج تک قومی شناخت کے ساتھ نظریاتی اور شعوری وابستگی رکھنے والی لیڈر شپ نہیں ملی اور اسی کے نتیجے میں وطن عزیز پہلے بھی دولخت ہوا ہے اور اب پھر قومی عصبیتوں کے نام سے اس کے خلاف سازشوں کا نیا تانا بانا بنا جا رہا ہے۔

نجم سیٹھی نے اس خطاب میں مسلم ریاستوں کو روایتی اور لبرل ریاستوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ جن ریاستوں کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ اپنی

پالیسیوں کے حوالہ سے کم وبیش سب کی سب لبرل ہیں اور مغربی استعمار کی طے شدہ پالیسیوں کے دائرہ میں چل رہی ہیں۔صرف ہماری شمالی مغربی سرحد پر ایک روایتی نظریاتی ریاست کے ابھرنے کے امکانات پیدا ہوئے ہیں تو پوری دنیا خوف کا شکار ہوگئی ہے کہ اگر یہ ریاست کامیاب ہوگئی تو مروجہ مصنوعی نظاموں کا کیا بنے گا؟

نجم سیٹھی کو یہ بھی پریشانی ہے کہ اسلام کی تعبیر میں جماعت اسلامی، جمعیۃ علماء اسلام اور سپاہ صحابہ میں کس کی اجارہ داری ہوگی؟ مگر وہ اس حقیقت سے جان بوجھ کر لوگوں کی توجہ ہٹانے کی کوشش کررہے ہیں کہ اسلام کی دستوری تعبیر اور قانون سازی کے حوالہ سے نہ صرف ان مذکورہ جماعتوں میں بلکہ پاکستان کے کم وبیش سبھی دینی حلقوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔اور وہ اپنے اتفاق رائے کا اظہار علماء کے ۲۲ دستوری نکات، ۱۹۷۳ء کے دستور، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات، اور وفاقی شرعی عدالتوں کے فیصلوں کی صورت میں کئی بار کر چکے ہیں۔

یہاں نجم سیٹھی کے خطاب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ مقصود نہیں بلکہ صرف اس انداز کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے جو انہوں نے بھارت کی سرزمین پر کھڑے ہو کر پاکستان کے داخلی حالات پر گفتگو کرتے ہوئے اختیار کیا ہے اور اس کا مقصد واضح کرنے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔چنانچہ ان کا ارشاد ہے کہ:

> ’’اگر بھارت کے عقبی صحن میں غیر مستحکم اور ناراض ہمسایہ موجود ہوگا تو وہ کبھی اپنا عظیم طاقت بننے کا خواب پورا نہیں کر سکے گا۔حقیقت یہ ہے کہ اگر بھارت کا عظمت کا خواب فوجی وسعت کی حکمت عملی پر قائم ہے تو پاکستان کی جوابی اسلحہ سازی یہ خواب کبھی پورا نہیں ہونے دے گی۔ لہٰذا آنے والے سالوں میں بھارت اگر اپنی شناخت ایک عظیم طاقت کے طور پر کرانا چاہتا ہے تو اس کی بنیاد بھارت کی فوجی طاقت نہیں ہوگی بلکہ یہ حقیقت ہوگی کہ پاکستان سمیت جنوبی ایشیا کے ممالک معاشی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ کس قدر پیوست ہیں۔‘‘

ہمارے خیال میں اس کے بعد نجم سیٹھی صاحب کے خطاب کے کسی اور حصے پر گفتگو کی

ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ جب گفتگو کا ایجنڈا ہی بھارت کی عظمت کا اعتراف اور اسے ایک عظیم طاقت کے روپ میں پیش کرنا ہے تو پھر اس مقصد کے لیے وہی باتیں کہی جا سکتی ہیں جو نجم سیٹھی نے کہی ہیں۔ اس کے سوا وہ اور کہہ بھی کیا سکتے تھے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۲۰ مئی ۱۹۹۹ء)

بھارتی طیارے کا اغوا اور طالبان

بھارتی طیارے کے اغوا کے باقی پہلوؤں سے قطع نظر اب تک کے حالات میں جو دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہوئی ہیں ان میں ایک مسئلہ کشمیر کی نزاکت اور سنگینی کا پہلو ہے جس نے دنیا بھر کو ایک بار پھر اس بات کا احساس دلا دیا ہے کہ اس مسئلہ کو اس خطہ کے عوام کی خواہش کے مطابق حل نہ کیا گیا تو جنوبی ایشیا میں امن کا قیام کبھی نہیں ہو سکے گا اور آزادیٔ کشمیر کی تحریک بھی آگے بڑھنے کے معروف راستوں کو مقید پا کر دیگر تحریکات آزادی کی طرح کوئی نیا رخ اختیار کر سکتی ہے۔

دوسرا پہلو امارت اسلامی افغانستان کی حکمران جماعت ''طالبان'' کی معاملہ فہمی اور تدبر و حوصلہ کا ہے جس نے دنیا کو پہلی بار اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور طالبان کو محض ایک خونریز اور جنگجو قوت کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنے والوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے ان نوجوانوں نے صرف ہاتھوں میں کلاشنکوف ہی نہیں اٹھا رکھی بلکہ ان کے سینوں میں انسانیت کے لیے دھڑکنے والے دل اور کھوپڑیوں میں انسانیت کے مفاد میں سوچنے والے دماغ بھی موجود ہیں۔ اور وہ جہاں میدان جنگ میں دشمن کو ناکوں چنے چبوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہاں مشکل سے مشکل حالات میں انسانی جانوں کے تحفظ اور امن کو یقینی بنانے کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہیں۔ چنانچہ برطانوی اخبار ''گارجین'' کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

> ''بھارتی طیارے کی ہائی جیکنگ کے معاملہ سے نبرد آزما ہونے کے طریق کار اور طرز عمل سے طالبان عالمی ہیرو بن گئے ہیں اور محض چھ ہفتے قبل اسامہ کی حوالگی سے انکار، منشیات کی سمگلنگ اور دہشت گردی کے حوالہ سے پوری دنیا

کے لعن طعن کا نشانہ بننے والے طالبان اب بہت بہتر حالات میں ہیں او
رطالبان حکومت تسلیم نہ کرنے والا بھارت بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ طالبان
انتہائی تعمیری کردارادا کرر ہے ہیں۔‘‘

بھارت نے جب اپنے اغوا شدہ طیارے کواپنے ہی شہرامرتسر کے ایئرپورٹ سے دوبارہ پرواز کا موقع دیاتو بھارتی حکمرانوں کا خیال تھا کہ یہ طیارہ لازماً پاکستان ہی کے کسی ایئرپورٹ پراترے گالیکن طیارہ جب قندھارایئرپورٹ پراترا تو بھارت کے ساتھ اور بھی بہت سی قوتوں اور لابیوں کے منہ میں پانی بھرآیا کہ اب توایک تیر سے دوشکار ہوں گے، طالبان ان معاملات میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہائی جیکنگ کے جال میں پھنس جائیں گےاورانہیں پاکستان کے ساتھ نتھی کر کے پاکستان اورطالبان کودنیا بھرمیں ’’میڈیاوار‘‘ کا نشانہ بنایا جاسکے گا۔مگر طالبان کی اسلامی حکومت نے جس ہوش مندی اور تدبر کا مظاہرہ کیااس نے پوری دنیاکوحیران وششدرکردیاہے۔

گزشتہ شب برطانیہ کے شہرنوٹنگھم کے پاکستان سنٹرمیں تراویح میں قران کریم مکمل ہونے پر ایک تقریب تھی جس میں راقم الحروف کوبھی اظہارخیال کی دعوت دی گئی۔مجھ سے پہلے اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے عالمی جماعت اہل سنت کے سربراہ مولانا ضیاء الحق سیاکھوی نے اس صورتحال پردلچسپ تبصرہ کیا جواس حوالہ سے مسلمانوں کےایک بڑے حلقے کے جذبات کی ترجمانی کرتاہے۔انہوں نے کہا کہ مجھے اس بات کا بار بارخیال آتا تھا کہ طالبان کے خلاف دنیا بھر کے جدید ذرائع ابلاغ جس طرح مسلسل پراپیگنڈا کرر ہے ہیں اس کا توڑ کرنے کے لیے طالبان کوبھی ابلاغ کے ان جدید ذرائع کواستعمال میں لانا چاہیے، اور طالبان کے ایسا نہ کرنے پر بہت سے دوسرے دوستوں کی طرح انہیں بھی غصہ آتا تھا،مگر طالبان کی اسلامی حکومت ان ذرائع کواختیار کرنے سے مسلسل گریزاں رہی جس پراللہ تعالیٰ نےغیب سے یہ انتظام کردیا کہ بھارتی طیارے کے اس اغوا کے باعث دنیا بھر کے میڈیا کی توجہ قندھار پررہی اورایک ہفتہ تک مسلسل دنیا کے لوگ طالبان کواپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے کہ وہ کس سادگی اورحوصلہ کے ساتھ حالات کو برداشت کر رہے ہیں اورکس تدبراورسنجیدگی کے ساتھ ہائی جیکنگ جیسے سنگین معاملہ سے نمٹ رہے ہیں اوراس طرح وہی ذرائع ابلاغ جواس سے قبل طالبان کوصرف ایک جنگجواورلڑاکا گروپ کے طور پرپیش

کرتے رہے ہیں انہی ذرائع ابلاغ نے دنیا کو طالبان کی امن پسندی، انسان دوستی اور مہمان نوازی کا یہ روپ بھی دکھا دیا ہے جس سے ان کے خلاف شکوک وشبہات کم ہوں گے۔

ہائی جیکنگ اپنی تمام تر سنگینی اور قابل نفرت ہونے کے باوجود ایٹم بم سے زیادہ خطرناک نہیں ہے اور نہ ہی اس کے نقصانات اور تباہ کاری کا دائرہ ایٹم بم سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ لیکن ایٹم بم کو ایک جدید ترین ہتھیار کے طور پر ''امن کا ضامن'' سمجھا جاتا ہے اور امن کی گارنٹی کے لیے بہت سے ممالک نے اس کی تیاری اور تنصیب کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اس لیے اگر حریت پسندوں نے ریاست میں بھارتی افواج کے وحشیانہ جبر وتشدد اور اس پر عالمی قوتوں کی مسلسل بے حسی اور بے توجہی کے خلاف احتجاج کے طور پر ہائی جیکنگ جیسے سنگین جرم کا راستہ اختیار کیا ہے تو اسے ان کی مجبوری، بے بسی اور لاچاری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اور قوموں کی آزادی کی تحریکات میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے جس کا اظہار ایک اخباری رپورٹ کے مطابق بھارتی طیارہ اغوا کرنے والے ہائی جیکروں نے کیا ہے اور جہاز سے نیچے اترنے سے قبل تمام یرغمالی مسافروں سے اس عرصہ کے دوران ہونے والی زحمت پر معذرت طلب کی اور کہا کہ

''ہم مجبور تھے کیونکہ یہ ہماری جدوجہد آزادی کا مسئلہ تھا۔''

بہر حال بھارتی طیارے کے اغوا سے یرغمالی مسافروں کی رہائی تک اس ساری صورتحال کے چند پہلو ہمارے لیے اطمینان کا باعث بنے ہیں، وہ یہ ہیں کہ طیارے کے سینکڑوں مسافر جان کی سلامتی اور امن کے ساتھ گھروں میں پہنچ گئے ہیں اور مولانا مسعود اظہر، عمر سعید شیخ اور مشتاق احمد زرگر کو سالہا سال کی بھارتی قید سے رہائی مل گئی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۹ جنوری ۲۰۰۰ء)

جنرل پرویز مشرف کا امتحان

سپریم کورٹ آف پاکستان کے بارہ جج صاحبان نے متفقہ طور پر جنرل پرویز مشرف کے بارہ اکتوبر کے اقدام کو نظریۂ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا ہے اور انہیں تین سال تک عام انتخابات کرانے کی ہدایت کرتے ہوئے آئین میں ترمیم کا اختیار بھی سونپ دیا ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کو بھی سپریم کورٹ نے اسی نوعیت کا اختیار دیا تھا مگر اس میں تین سال کے عرصہ کی قید نہیں تھی۔ چنانچہ جنرل مرحوم نے اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے مختلف اقدامات کے ذریعے گیارہ سال تک اقتدار کو اپنے پاس رکھا تھا اور اگر بہاولپور کا سانحہ پیش نہ آتا تو بظاہر ابھی اقتدار سے ان کا الگ ہونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

جنرل پرویز مشرف نے بارہ اکتوبر کو میاں محمد نواز شریف کی حکومت برطرف کرتے ہوئے آرمی چیف کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو ان کا یہ اقدام آئین سے ماورا ہونے کے باوجود نہ صرف پاکستانی عوام نے اسے قبول کرتے ہوئے اس میں خیر مقدم اور خوش آمدید کا رنگ بھر دیا تھا بلکہ بین الاقوامی اداروں اور امریکہ سمیت مغربی حکومتوں نے بھی اس کے بارے میں ''گوارا ہے'' کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے کہ میاں محمد نواز شریف کی حکومت عالمی قوتوں اور پاکستانی عوام دونوں کی توقعات پر پوری نہیں اتری تھی اور بیک وقت دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں وہ دونوں کے اعتماد سے محروم ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے بارہ اکتوبر کے اقدام کو دونوں حلقوں میں اپنے اپنے انداز سے قبول کر لیا گیا اور اب سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے سندِ جواز بھی فراہم کر دی ہے۔

اس ''عدالتی مینڈیٹ'' کے بعد جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا رخ کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ چند روز تک ہو جائے گا بلکہ کچھ کچھ ہو بھی رہا ہے۔ مگر ہماری فقیرانہ رائے ہے کہ جنرل پرویز مشرف

بھی میاں محمد نواز شریف کی طرح اسی مخمصے کا شکار ہو چکے ہیں کہ عالمی اداروں اور پاکستانی عوام میں سے کس کو خوش رکھنا ہے اور ان میں سے کس کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی خواہشات، توقعات اور ترجیحات مختلف بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور دونوں کو بیک وقت خوش رکھنے کی کوئی کوشش اب میاں نواز شریف کے حشر سے سبق حاصل نہ کرنے کی کوشش ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

مغربی ممالک اور عالمی اداروں کی توقعات اور ایجنڈا کچھ اس طرح ہے کہ:

☆ پاکستان جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی قبول کرتے ہوئے کشمیر سے دستبردار ہو جائے، چین کے خلاف امریکہ کے قائم کردہ متحدہ محاذ میں شریک ہو، اور نیپال، سکم اور بھوٹان کی طرح ایک طفیلی ریاست کی حیثیت اختیار کرے۔

☆ پاکستان صنعتی ترقی کا خواب دیکھنا چھوڑ دے، وسطی ایشیا کی منڈی کی طرف للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کی بجائے ایک زرعی ملک کی حیثیت پر اکتفا کرے اور صنعتی ممالک کے لیے وسطی ایشیا تک محض ایک گزرگاہ بن جانے کے ساتھ ساتھ خود بھی منڈی بننا قبول کرے۔

☆ مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کے لیے خطرات کا باعث بننے کی بجائے ان کے استحکام اور ترقی کے لیے کردار ادا کرے۔

☆ حکومت پاکستان بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور بڑی حکومتوں کے قرضے اور سود کی قسطیں بہرصورت ادا کرنے کے لیے اپنے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھاتی چلی جائے اور مالیاتی اداروں کو یہ مواقع فراہم کرتی رہے کہ وہ پاکستانی عوام کو کوئی ریلیف فراہم کرنے کی بجائے ان کے گرد معاشی پابندیوں اور ٹیکسوں کے حصار تنگ سے تنگ تر کرتے چلے جائیں۔

☆ پاکستان اپنی شمال مغربی سرحد پر افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کی تقویت اور استحکام کا باعث نہ بنے بلکہ طالبان کو کسی طرح گھیر گھار کر شمالی اتحاد کے ساتھ مخلوط حکومت کے لیے آمادہ کرے تاکہ افغانستان کی حکومت میں اسلامیت کے عنصر کو جس حد تک ممکن

ہوکم کیا جا سکے۔

☆ پاکستان کے اندر دینی مدارس جہادی تحریکات اور مذہبی اقدار کی حوصلہ شکنی کی جائے اور ثقافت وکلچر کی آڑ میں حلال وحرام کے تصور سے نا آشنا معاشرت کے فروغ کی مہم کو ہر سطح پر عام کیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ یہ ایجنڈا یا اس کی کوئی ایک شق بھی پاکستانی عوام کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ بلکہ اپنے پڑوس میں طالبان حکومت کی سادگی، قناعت پسندی، دینی حمیت، قومی غیرت اور قرضوں کے لیے عالمی طاقتوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے کی روش کو دیکھ کر پاکستانی عوام کا بھی جی چاہتا ہے کہ:

☆ ان کے ملک کا نظام تبدیل ہو، پروٹوکول اور پرسٹیج کے تکلفات سے انہیں نجات ملے اورانہیں قناعت پسند اور کفایت شعار حکمران اور افسران میسر ہوں۔

☆ انہیں طبقاتی امتیاز سے چھٹکارا حاصل ہو، وسائل اور دولت کی غلط تقسیم اور ہوشربا معاشی تفاوت کی لعنت سے جان چھوٹے۔

☆ قرضوں کا شکنجہ ٹوٹے، قومی دولت لوٹنے والوں کا حقیقی احتساب ہو اور ان سے قومی دولت اور اثاثے واپس لیے جائیں۔

☆ وہ مذہبی عدم رواداری اور فرقہ وارانہ تشدد کی دلدل سے نکلیں اور ایک پرامن اور خوشحال قوم کی حیثیت سے انہیں اقوامِ عالم کی برادری میں جائز اور باوقار مقام حاصل ہو۔

☆ پاکستان کی شہ رگ کشمیر سے بھارت کا آہنی پنجہ ہٹے اور کشمیری عوام آزادی حاصل کریں۔

☆ اسلامی ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہوں اور ایک مضبوط اسلامی بلاک تشکیل پائے۔

☆ بیت المقدس آزاد ہو اور فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق ملیں۔

☆ جنوبی ایشیا میں بھارت کے ساتھ برابری کی بنیاد پر باوقار تعلقات قائم ہوں، طاقت کا کوئی بھی عدم توازن اس خطہ میں بھارت کی بالادستی کا ذریعہ نہ بنے۔ اور افغانستان اور وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات اسلامی اخوت کی بنیاد پر

مستحکم سے مستحکم تر ہوتے چلے جائیں۔

یہ دو ایجنڈوں کا ٹکراؤ ہے اور دو پروگراموں کا تصادم ہے۔ اس لیے جنرل پرویز مشرف کا اصل امتحان اب شروع ہوا ہے کہ وہ ان میں سے کس کا ساتھ دیتے ہیں اور کس پروگرام کو قبول کرتے ہیں۔ جنرل صاحب برسر اقتدار آئے تو بہت سے دوست پوچھتے تھے اور اب بھی مختلف حضرات دریافت کرتے رہتے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کس کے نمائندے ہیں اور کس لابی سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں ان سے عرض کرتا تھا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دو دھاری تلوار کس طرف چلے گی۔ یہ آنے والا وقت بتائے گا اور جنرل پرویز مشرف کا ایجنڈا اور ترجیحات نشاندہی کریں گے کہ وہ اصل میں کس کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

میرے خیال میں وہ وقت آ گیا ہے اور سپریم کورٹ کے فیصلے نے جنرل پرویز مشرف کو اس فیصلہ کن دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے انہوں نے بہرحال کسی ایک طرف ٹرن لینا ہے۔ میں اس نازک مرحلہ پر جنرل پرویز مشرف سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صرف اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ صرف ایک شخص کا ٹرن نہیں بلکہ جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام کے مجموعی تناظر میں پوری امت مسلمہ کا ٹرن بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وائٹ ہاؤس اور کعبۃ اللہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہوئے اچھی طرح سوچ سمجھ لیں اور پوری طرح جائزہ لے لیں کہ وہ تاریخ کے صفحات میں اپنی تصویر صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری یا پھر میر جعفر، میر صادق اور شریف مکہ حسین میں سے کس کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد...... ۱۹ مئی ۲۰۰۰ء)

جنرل پرویز مشرف کا دورۂ بھارت

صدر جنرل پرویز مشرف بھارت کے کامیاب دورے سے واپس آگئے ہیں اور ان کے دورے کے مختلف پہلوؤں پر قومی اور بین الاقوامی پریس میں گفت وشنید کا سلسلہ جاری ہے۔ جس رات جنرل پرویز مشرف آگرہ سے واپس اسلام آباد آئے صبح کے اخبارات کی جلی سرخیوں میں دورے کو ناکام قرار دے کر بھارت کے رویے پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا جبکہ ایک دوروز کے بعد دورے کو ناکام کی بجائے نامکمل کہنا شروع کر دیا گیا۔ مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دورہ نامکمل تھا نہ ناکام، بلکہ صدر مشرف نے وہ مقاصد حاصل کر لیے جو وہ اس دورے سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ آگرہ سے اپنے مشن میں کامیاب ہو کر واپس لوٹے ہیں۔

گوادر ڈپلومیسی

صدر پرویز مشرف نے پہلے ایسے حالات پیدا کیے کہ بھارت خود انہیں دہلی آنے کی دعوت دے اور اس کے لیے ان کی ''گوادر ڈپلومیسی'' کامیاب رہی۔ کیونکہ گوادر اور عوامی جمہوریہ چین کا تعلق ظاہر کر کے انہوں نے امریکہ بہادر کے سر پر خطرے کی گھنٹی بجا دی جس سے بھارت پر دباؤ میں اضافہ ہوا اور یوں جنرل پرویز مشرف کو مذاکرات کی دعوت دینے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ بہت سے دوستوں کو یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ بیٹھے بٹھائے بھارت کو کیا ہوا کہ اس نے پاکستان میں فوجی حکومت کے حوالے سے اپنے روایتی طرز عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف کو نہ صرف مذاکرات کے لیے دہلی بلا لیا بلکہ ان کے استقبال اور آؤ بھگت میں بھی پورے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ مگر جب ان سے عرض کیا گیا کہ وہ اسے جنرل پرویز مشرف کی گوادر ڈپلومیسی کے پس منظر میں دیکھیں تو انہیں اس دورے کے پس پردہ حقائق کو سمجھنے

میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

مسئلہ کشمیر اور سرحد پار ''دہشت گردی''

جنرل پرویز مشرف نے دورہ بھارت میں ہر جگہ کشمیر کا ذکر کیا اور مذاکرات میں بھی کشمیر ہی کے ذکر کو مقدم رکھا، حتیٰ کہ وہ بھارت کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ کو مشترکہ اعلامیہ میں اس کا تذکرہ شامل کرنے پر قائل کرنے میں ابتدائی مرحلہ میں کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر بھارت کشمیر کو متنازعہ معاملہ، بلکہ نفس مسئلہ تسلیم کرنے میں بھی متردد رہا- اس طرح صدر پاکستان عالمی سطح پر پاکستان کے اس موقف کو پھر سے اجاگر کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل تنازعہ کشمیر پر ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوئے بغیر دونوں ملکوں کے تعلقات کا معمول پر آنا اور جنوبی ایشیا میں کشیدگی کا کم ہونا ممکن نہیں، جبکہ بھارت اس مسئلہ کو حل کرنے بلکہ اسے متنازعہ تسلیم کرنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے اور اس کی یہی ہٹ دھرمی دراصل کشیدگی کو کم کرنے اور باہمی تصادم کو روکنے کے امکانات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جنرل پرویز مشرف نے تنازعہ کشمیر کے تذکرہ کے بغیر مشترکہ اعلامیہ کو قبول کرنے کی بجائے اعلامیہ کے بغیر واپس آنے کو ترجیح دے کر کشمیری عوام اور پاکستان کی رائے عامہ کو اپنے بارے میں یہ اعتماد دلا دیا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستانی اور کشمیری عوام کے موقف کے ساتھ واضح کمٹمنٹ رکھتے ہیں اور اسے بلا جھجک ہر فورم پر پیش کرنے اور اس پر ڈٹ جانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ اور اسی طرح صدر پاکستان نے تحریک آزادی کشمیر اور اس کی پشت پناہی کرنے والی پاکستانی رائے عامہ کو نیا حوصلہ اور اعتماد بخشا ہے جسے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ حکومت پاکستان بین الاقوامی فورم پر ان کے جذبات واحساسات کی کماحقہ ترجمانی نہیں کر پاتی اور پاکستانی حکومتیں مسئلہ کشمیر پر قومی موقف اور بین الاقوامی مصلحتوں کے درمیان ترجیحات طے کرنے میں اکثر و بیشتر لچک کا مظاہرہ کر جاتی ہیں۔

بھارت کے پاس سب سے بڑا پوائنٹ ''سرحد پار دہشت گردی'' کا ہے جسے وہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کے ساتھ منسلک کر کے پیش کر رہا ہے اور بین الاقوامی رائے عامہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اصل بات ''دہشت گردی کی روک تھام'' کی ہے جس میں پاکستان تعاون

کے لیے تیار نہیں۔ لیکن اس کے لیے مشکل یہ ہے کہ وہ کشمیری عوام کی جن مسلح کارروائیوں کو ''دہشت گردی'' قرار دے رہا ہے ان کا تعلق کشمیری عوام کی اس تاریخی جدوجہد سے ہے جو وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اپنے لیے خود ارادیت کا مسلمہ حق حاصل کرنے کے لیے گزشتہ نصف صدی سے جاری رکھے ہوئے ہیں، اس لیے مسئلہ کشمیر کے تنازعہ کو حل کیے بغیر ان عسکری کارروائیوں کو دہشت گردی قرار دلوانا آسان بات نہیں ہے۔ جبکہ جنرل پرویز مشرف نے مسئلہ کشمیر کے حل کرنے میں بھارت کے انکار کو ایک بار پھر ''فلیش'' کر کے دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ کشمیر میں عسکری کارروائیوں کا تعلق کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی سے ہے اور مسئلہ کشمیر کے حل کا دارومدار بھارت کے طرز عمل پر ہے اس لیے ان عسکری کارروائیوں کی جن کو بھارتی حکومت دہشت گردی قرار دے رہی ہے بالواسطہ طور پر ذمہ داری خود بھارت پر عائد ہوتی ہے۔

اس لیے ہماری ناقص رائے صدر جنرل پرویز مشرف کا دورہ بھارت کامیاب رہا کیونکہ اس سے انہوں نے جو مقاصد حاصل کیے ہیں وہ شاید کسی ''گول مول مشترکہ اعلامیہ'' کی صورت میں حاصل نہ ہو پاتے۔ البتہ اب اصل ضرورت اس حوالے سے مستقبل کی منصوبہ بندی کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ صدر پرویز مشرف اگر آئندہ بھی اسی سنجیدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے تو وہ بھارت کو مسئلہ کشمیر کے حل کی ضرورت کا احساس دلانے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد---۲۶ جولائی ۲۰۰۱ء)

دورۂ بھارت کے نتائج

صدر جنرل پرویز مشرف کے بھارت کے دورہ کے نتائج پر دنیا بھر میں بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ ان کے اس دورہ کے اختتام پر کوئی مشترکہ اعلامیہ جاری نہیں ہو سکا اور بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے ساتھ مذاکرات کی کئی نشستوں کے باوجود مشترکہ اعلامیہ پر اتفاقِ رائے نہیں ہوا۔ البتہ مذاکرات جاری رکھنے پر دونوں لیڈر متفق ہیں اور بھارتی وزیراعظم نے صدر پرویز مشرف کی طرف سے دی گئی دورۂ پاکستان کی دعوت قبول کر لی ہے جبکہ ستمبر میں نیویارک میں بھی دونوں لیڈروں کی ملاقات متوقع

ہے۔

☆ مشترکہ اعلامیہ پر اتفاقِ رائے نہ ہونے کی وجہ پاکستانی لیڈروں کے نزدیک یہ ہے کہ بھارتی وزیراعظم مسئلہ کشمیر کو ایک تنازعہ کے طور پر تسلیم کرنے اور اعلامیہ میں اس کا ذکر کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔

☆ جبکہ بھارتی لیڈروں کا کہنا ہے کہ صدر پرویز مشرف مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کی طرف سے جاری عسکری کارروائیوں کو کشمیریوں کی جنگِ آزادی قرار دینے پر مصر تھے اور اسے دہشت گردی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے مشترکہ اعلامیہ جاری نہ ہو سکا۔

ان دونوں میں سے کوئی وجہ بھی ہو، یہ بات بہرحال دونوں حکومتوں نے تسلیم کر لی ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل تنازعہ کشمیر کے مسئلہ پر ہی ہے، اور اسے حل کیے بغیر نہ جنوبی ایشیا میں امن کی ضمانت دی جا سکتی ہے، اور نہ ہی پاکستان اور بھارت کے درمیان دیگر تنازعات پر مفاہمت کی طرف کوئی پیشرفت ممکن ہے۔

ہمارے خیال میں صدر پرویز مشرف کے بھارت جانے کی بنیادی غرض بھی یہی تھی کہ مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کیا جائے اور جنوبی ایشیا کے امن کے حوالے سے اس کی اہمیت کو واضح کیا جائے۔ اس لیے مشترکہ اعلامیہ جاری نہ ہونے کے باوجود اس مشن میں وہ کامیاب رہے ہیں، اور اب حالات اس رخ کی طرف بڑھتے نظر آ رہے ہیں کہ بھارت کو بالآخر ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ ترک کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہوگا، اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کو ان کی آزادانہ مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع فراہم کرنا ہوگا، اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔

اس لیے امید ہے کہ آئندہ مذاکرات میں اس سلسلہ میں مزید پیشرفت ہوگی اور کشمیری عوام اپنی طویل جدوجہد اور قربانیوں کے منطقی نتائج حاصل کرنے میں آخرکار کامیاب ہوں گے۔ البتہ پاکستان کو اس سلسلہ میں عالمی میڈیا اور سفارتکاری کے محاذ پر نئے سرے سے صف بندی کرنا ہوگی اور مسئلہ کشمیر کی اہمیت سے عالمی رائے عامہ کو آگاہ کرنے کے لیے تدبر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کام کو منظّم کرنا ہوگا۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---اگست ۲۰۰۱ء)

عاصمہ جہانگیر کا کردار

روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۲۱ جولائی ۲۰۰۱ء کی خبر کے مطابق صدر مملکت جنرل پرویز مشرف گزشتہ روز اپنی پریس کانفرنس کے دوران انسانی حقوق کی علمبردار عاصمہ جہانگیر کے بھارت میں کردار کے بارے میں جذباتی ہو گئے۔ ان سے جب کہا گیا کہ عاصمہ جہانگیر آگرہ سمٹ کے دوران بھارت میں تھیں جہاں وہ اپنے ہی ملک کے خلاف پراپیگنڈے میں مصروف رہیں۔ تو صدر مملکت کچھ سوچ میں پڑ گئے اور انہوں نے کہا کہ وہ اس کے بارے میں کیا کہیں؟ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو باہر جا کر اپنے ملک کی عزت کو بھول جائے؟ وہ اس بارے میں بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر اس وقت کہہ نہیں سکتے۔ اس کے بعد جب صدر سے دوسرا سوال ہوا تو انہوں نے سوال کرنے والے صحافی سے کہا کہ وہ پچھلے سوال پر بہت جذباتی ہو گئے تھے لہٰذا وہ اس سوال کو سمجھ نہیں سکے۔

اس خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدر پرویز مشرف بیگم عاصمہ جہانگیر اور انسانی حقوق کے اس قماش کے دیگر علمبرداروں کی بیرون ملک سرگرمیوں اور ان کی سنگینی سے بخوبی آگاہ ہیں، اور یہ لوگ باہر ملکوں میں جا کر پاکستان کے خلاف جو زہر فشانی کرتے رہتے ہیں وہ اس سے بے خبر نہیں ہیں۔

☆ بیگم عاصمہ جہانگیر لاہور ہائیکورٹ کی وکیل ہیں اور انسانی حقوق کمیشن پاکستان کی چیئر مین ہیں۔ ان کے شوہر ملک جہانگیر ایڈووکیٹ قادیانی ہیں، اور عاصمہ جہانگیر اس بات کو اخباری بیانات میں تسلیم کرتے ہوئے کئی بار یہ کہہ چکی ہیں کہ وہ ایک قادیانی کی بیوی ہونے میں کوئی حرج نہیں سمجھتیں۔

☆ عاصمہ جہانگیر اور ان کا انسانی حقوق کمیشن ایک عرصہ سے پاکستان کے اسلامی تشخص، دستور کی اسلامی دفعات، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے دستوری فیصلے، حدود و قصاص کے شرعی قوانین، توہینِ رسالت کی شرعی سزا، اور دیگر اسلامی قوانین و احکام کے خلاف مسلسل سرگرمِ عمل ہیں، اور اس کمیشن کا سب سے بڑا ہدف پاکستان کو سیکولر ریاست کی حیثیت دینا ہے۔

- ☆ عاصمہ جہانگیر اور ان کے رفقاء پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کے خلاف بھی سرگرمِ عمل رہے ہیں،
- ☆ اور پاکستان کے بھارت کے ساتھ تنازعات میں پاکستان کے موقف اور مفادات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے انسانی حقوق کے یہ نام نہاد علمبردار امن اور مفاہمت کے نام پر مجاہدینِ کشمیر اور پاکستان کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔

ان حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ اگر صدر پرویز مشرف ان لوگوں کی اس قسم کی سرگرمیوں سے باخبر ہیں تو انہیں صرف ''کیا کہا جا سکتا ہے'' پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایسے افراد اور حلقوں کے بارے میں کچھ کہنا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ کرنا بھی چاہیے۔ جن لوگوں کی اسلام دشمنی اور وطن دشمنی اس حد تک واضح ہو چکی ہو اُن کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا کسی طرح بھی قابلِ فہم اور مناسب بات نہیں ہے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۰۱ء)

افغانستان پر امریکی حملے کی معاونت کیلئے بھارت کا حوالہ

صدر جنرل پرویز مشرف نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے جن ترجیحات کا اعلان کیا ہے وہ صرف ان کی نہیں بلکہ پاکستان کے ہر شہری کی ترجیحات ہیں۔ میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں جو پاکستان کی سالمیت اور قومی وحدت کے تحفظ کو دوسری ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں اور پاکستان کی عسکری اور ایٹمی صلاحیت کو ہر حالت میں برقرار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ تاثر دینا کہ جو لوگ امریکہ اور افغانستان کے حالیہ تنازعہ کے تناظر میں صدر پرویز مشرف سے اختلاف کر رہے ہیں ان کی ترجیحات اس سے مختلف ہیں، قطعی طور پر غلط بات ہے۔ بات ترجیحات کی نہیں بلکہ انہیں بروئے کار لانے کے لیے طریق کار کی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان ترجیحات پر عملدرآمد کے لیے صدر صاحب نے جو راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے خطاب میں جس طریق کار کا عندیہ دیا ہے وہ ان ترجیحات کے نفاذ و عملداری کا نہیں بلکہ خدانخواستہ انہیں سبوتاژ کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اس طریق کار سے پوری دیانتداری اور شرح صدر کے ساتھ اختلاف کر رہے ہیں۔

صدر پرویز مشرف نے امارت اسلامی افغانستان پر حملوں کے لیے امریکہ کو سہولتیں فراہم کرنے کی پالیسی کے حق میں کہا ہے کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو بھارت یہ کر گزرے گا اور وہ امریکہ کو اس مقصد کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کی پیشکش کر چکا ہے، اس لیے ہم بھارت کو سبقت کا موقع نہیں دینا چاہتے کیونکہ اس سے امریکہ بھارت کے ساتھ ہو جائے گا اور ہمارے ’’کشمیر کاز‘‘ کو نقصان پہنچے گا۔

سچی بات ہے کہ صدر صاحب کے اس بھولپن پر مجھے ہنسی آتی ہے اس لیے کہ یہ بات وہ شخص تو کہہ سکتا ہے جس نے امریکہ کو پہلی بار دیکھا ہو، اس کی تاریخ، اس کے قومی مزاج سے کوئی واقفیت نہ رکھتا ہو مگر ایسے ملک کے سربراہ کے منہ سے یہ بات بھولپن اور سادگی ہی کہلائے گی جو گزشتہ نصف صدی سے ''امریکہ دوستی'' کے مسلسل چرکے کھا رہا ہے۔ امریکہ کے بارے میں یہ توقع رکھنا خودفریبی کی انتہا ہے کہ وہ افغانستان کے خلاف پاکستان کی زمین یا فضا استعمال کرنے کے بعد اس خطہ میں اپنی ترجیحات بدل دے گا اور بھارت کو اپنے مخالفین میں شمار کر کے کشمیر کو آزادی دلوانے کے لیے پاکستان کی سپورٹ کرے گا۔

پاکستان کے ساتھ اس وقت امریکہ کا مفاد صرف اس قدر ہے کہ وہ پاکستان اور افغانستان کی نظریاتی وحدت کو توڑنا چاہتا ہے، ان کی باہمی دوستی کو دشمنی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے، پاکستان اور افغانستان کے وسطی ایشیا کے ساتھ روابط کو ختم کرنا چاہتا ہے، اور چین کے خلاف اپنے مجوزہ حصار کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب کچھ حاصل ہو جانے کے بعد امریکہ کی ترجیحات بدستور وہی رہیں گی جو پہلے چلی آرہی ہیں اور جن ترجیحات میں پاکستان کو بھارت پر ترجیح دینا یا کم از کم اس کے برابر رکھنا بھی امریکی مفادات سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے صدر مشرف اور ان کے ساتھ اس مسئلہ کو پاک بھارت تنازعہ اور کشمکش کے تناظر میں دیکھنے والے دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی سوچ اور مطالعہ کا دائرہ کشادہ کریں اور وسیع تر عالمی تناظر میں امریکہ کے مفادات، پالیسیوں اور عزائم کا جائزہ لیں۔

جنرل پرویز مشرف سے زیادہ کون اس بات سے واقف ہوگا کہ عربوں نے بھی اسی غلط فہمی میں امریکی کیمپ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے عروج کے دور میں روس کے کیمپ میں شمار ہونے والے بعض عرب ممالک اسی توقع پر امریکی کیمپ میں چلے گئے تھے کہ ہم اس خطہ میں امریکہ کو سہولتیں فراہم کریں گے تو امریکہ ہمارے ساتھ ہو جائے گا، اور جب امریکہ ہمارے ساتھ ہوگا تو فلسطین کے مسئلہ کے حل کے لیے ہمیں رعایتیں دے گا اور اسرائیل کے مقابلہ میں ہمیں ترجیح دے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ صدر صاحب کو اگر خود واقفیت نہ ہو تو برادر مسلم ملک عرب جمہوریہ مصر کے صدر جناب حسنی مبارک سے کسی وقت راز داری کے ساتھ

پوچھ لیں کہ اسرائیل کے مقابلہ میں ترجیح اور مسئلہ فلسطین کے حل میں تعاون کی توقع پر امریکہ کے ساتھی بننے والے ملکوں کے ساتھ امریکہ بہادر نے کیا سلوک کیا ہے؟

فلسطین کی صورتحال سب کے سامنے ہے، وہاں اسرائیل کے جبر وتشدد، فلسطینیوں کے قتل عام، اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کرنے کی مسلسل سازشیں کسی ذی شعور شخص سے مخفی نہیں ہیں۔ جبکہ اسرائیل کے مقابل جو عرب ممالک کھڑے ہیں وہ سب کے سب امریکہ کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے امریکہ کو تیل کے چشموں پر بالادستی دلائی ہے، فوجی استعمال کے لیے زمین اور اڈے فراہم کر رکھے ہیں، اور امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، صرف اس لیے کہ اسرائیل کے مقابلہ میں امریکہ انہیں بھی کچھ رعایت دے دے۔ لیکن ''امریکی دوستی'' کے اس فریب نے انہیں معروف محاورے ''دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا'' کے مصداق اقوام عالم کی برادری میں بے بسی اور عبرت کی تصویر بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس لیے جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ ہماری ترجیحات بھی وہی ہیں جو انہوں نے بیان کی ہیں، ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہے تو سب کچھ ہے، ہمیں بھی اس بات کا شعور ہے کہ ملکی معیشت کو مستحکم کرنا ہماری اولین ضرورت ہے، ہم بھی پاکستان کے حساس مراکز ایٹمی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا ہر قیمت پر تحفظ چاہتے ہیں، اور ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ مسئلہ کشمیر جلد از جلد حل ہو اور امریکہ سمیت سب عالمی قوتیں اس میں انصاف کا ساتھ دیں۔ لیکن اس کا صحیح راستہ امریکہ کے ساتھ قرب بڑھانا اور اسے اپنی داخلی حدود میں عسکری دخل اندازی اور رسائی کے مواقع فراہم کرنا نہیں بلکہ اس کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنا ہے۔ ہم اس وقت انتہائی نازک موڑ پر کھڑے ہیں، جس طرف بھی مڑ گئے واپسی کے لیے دور دور تک کوئی ''یوٹرن'' نہیں ہے، اس لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد...... ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء)

پاک بھارت تعلقات: تاریخی پس منظر اور بین الاقوامی سیاست

جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل محمد عزیز خان نے گزشتہ دنوں راولاکوٹ کی ایک تقریب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ قوم کے ہر باشعور شہری کے دل کی آواز ہے اور ہمیں ان باتوں پر اس لیے بھی زیادہ خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ کافی عرصہ کے بعد ''ادھر سے'' ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آیا ہے جس سے تپش اور لو کے اس موسم میں وقتی طور پر ہی سہی، مگر کچھ سکون سا محسوس ہوا ہے۔ جنرل صاحب نے پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے یہ کہہ کر قوم کو گزشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہندو مسلم کشمکش کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو جانے سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات معمول پر آ جائیں گے، وہ غلطی پر ہیں اس لیے کہ بھارت کا تنازع ہمارے ساتھ صرف کشمیر کے مسئلہ پر نہیں بلکہ اس کے ایجنڈے کا بنیادی ہدف جنوبی ایشیا پر اپنی بالادستی، یا جنرل صاحب موصوف کے بقول ''تھانیداری قائم کرنا'' ہے اور وہ پاکستان کو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتا ہے۔

دراصل عالمی قوتوں اور فری ورلڈ ٹریڈ کے نام پر دنیا کی معیشت کو اپنے قبضے میں لینے کی خواہش مند طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ کشیدگی کو کسی نہ کسی طرح کم کیا جائے تاکہ انہیں آزاد منڈیاں فراہم ہوں اور وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنی مصنوعات کو کھلی مارکیٹ میں لا سکیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی نظام اور فلسفہ و تہذیب کی راہ میں پاکستان کو ایک نظریاتی اور تہذیبی رکاوٹ تصور کرتے ہوئے عالمی استعمار اس کی موجودہ پوزیشن کے برقرار رہنے

پر راضی نہیں ہے، اس لیے اس کے سوا اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ پاکستان اور بھارت کی صلح ہو اور انہیں یورپی یونین طرز کی کسی نیم سیاسی یا تجارتی وحدت میں یکجا کر دیا جائے، جس کے بعد پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے دستبردار کرانا آسان ہو جائے گا، اس کی فوج کے سائز کو بھی کم کیا جا سکے گا، اور اس طرح پاکستان ایک اسلامی ملک اور عالم اسلام کی نظریاتی قیادت کی صلاحیت سے بہرہ ور ریاست کی بجائے بھارت کے زیر اثر ایک ملک کا درجہ اختیار کر لے گا۔ لیکن ان منصوبہ سازوں کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ کم از کم ایک ہزار سالہ مسلم ہندو کشمکش کے تاریخی پس منظر میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ نہ تو ہندو ذہنیت اپنے پڑوس کے مسلمانوں کو اس حالت میں قبول کر سکتی ہے کہ وہ ایک برابر کی قوت اور قوم کے طور پر رہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے یہ صورتحال قابل قبول ہوگی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ان کی بالادستی کے تاثر کے ساتھ زندگی گزاریں۔

آپ حالات کا جو بھی تجزیہ کر لیں اور دنیا کے حالات میں تبدیلیوں اور نئے عالمی رجحانات کا جس قدر ڈھنڈورا پیٹ لیں، مگر اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جنوبی ایشیا میں مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کی حریف قومیں ہیں جن کے درمیان دشمنی اور کشمکش کی تاریخ ایک ہزار سال سے زیادہ طویل پس منظر رکھتی ہے اور جن کے درمیان آج بھی ایک دوسرے پر بالادستی کے نہ صرف جذبات موجود ہیں بلکہ اس کے لیے دونوں طرف سے تیاریاں بھی جاری ہیں۔ مغربی اقوام اگر یہ سمجھتی ہیں کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی ایسی مصالحت کرا سکتی ہیں جس سے یہ دونوں قومیں باہم شیر وشکر ہو کر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن یا جی ایٹ کی چراگاہ بن جائیں گی تو یہ ان کی غلط فہمی ہے اور انہیں اس حوالہ سے اپنے تجزیوں اور اندازوں کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مسئلہ کشمیر کے حل کے حق میں نہیں ہیں، مسئلہ کشمیر تو ایک زندہ تنازع ہے جس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالنا ہوگا اور یہ نہ صرف مغربی اقوام بلکہ آزادی اور انسانیت کا نام لینے والی دنیا بھر کی تمام اقوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ کشمیریوں کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں، اور پاکستان جو کشمیریوں کے جائز اور مسلمہ حق کے لیے کشمیری عوام کا ساتھ دے رہا ہے، اسے کشمیریوں کے ساتھ تعاون سے دستبردار کرانے کے لیے دباؤ ڈالنے کی بجائے اس کے موقف پر سنجیدگی سے غور کریں۔ مسئلہ کشمیر کا جو حل بھی کشمیری عوام کی خواہشات اور

ان کے مسلمہ حقوق کے مطابق ہوگا، اس کا خیر مقدم کیا جائے گا، لیکن مسئلہ کشمیر کا کوئی ایسا حل جس میں کشمیری عوام کی وحدت، آزادی اور ان کے شہری حقوق کو عالمی استعمار کی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا جائے اور بڑی طاقتیں اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیری عوام کے حقوق اور قربانیوں کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی کا کوئی حل ان پر مسلط کر دیں تو اس سے کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ مزید الجھ جائے گا اور یقیناً ایک نئی کشمکش کا نقطہ آغاز ثابت ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی مسئلہ کشمیر کا کوئی نہ کوئی حل مسلط کرنے کے بعد پاکستان اور بھارت کو مصالحت کے بہانے کسی سیاسی یا تجارتی وحدت کے دائرے میں اکٹھا کر کے اگر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ اس سے ایک ہزار سالہ مسلم ہندو کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا تو یہ خام خیالی کی بات ہوگی۔ اس کشمکش کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مغل بادشاہت کے دور میں کوئی مسئلہ کشمیر موجود نہیں تھا، لیکن جنوبی ہند کے جنونی ہندوؤں نے دہلی کے مسلم اقتدار کے خاتمہ کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ مرہٹوں کی یلغار کا راستہ روکنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے آنا پڑا تھا اور پانی پت کے میدان میں تلوار کے زور پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا بھی اس میں برابر کا حق ہے اور وہ بھی اس خطہ میں آزادی اور خودمختاری کے ساتھ زندہ رہنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

آج بھی جنوبی ہند میں ''ہندو احیائیت'' کی تحریک پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ''مرہٹہ ازم'' ایک بار پھر منظّم شکل میں سامنے آ رہا ہے اور تین سو سال قبل کی طرح آج بھی اس کا ایجنڈا یہی ہے کہ مسلمان اس خطہ میں یا ان کے تابع اور برخوردار بن کر رہیں اور یا ملک چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ 'ہندو احیائیت کے اس ایجنڈے اور یلغار کا سامنا سر جھکا کر اور دنیا کی بڑی قوتوں سے امن کی بھیک مانگ کر نہیں ہوگا بلکہ ماضی کی طرح آج بھی اس کا حل شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر میں ہے، احمد شاہ ابدالی کی یلغار میں ہے اور پانی پت کے میدان میں ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ پانی پت کی ایک اور لڑائی کا میدان گرم ہو رہا ہے۔ اسے روکنے کے لیے ہر طرف سے کوششیں ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن تاریخ کے عمل کو کبھی روکا جا سکا ہے اور نہ اب روکا جا سکتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر قوموں کی تاریخ کے نقشے بنانا اور چیز

ہے، تاریخ اپنے آپ کو ایک بار پھر دہرانے جا رہی ہے اور اس کی آندھی جب اٹھتی ہے تو اس کا راستہ روکنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن ارشادات میں ''غزوۂ ہند'' کی بات فرمائی ہے اور اس کے فیصلہ کن مرحلہ کا اس خطہ میں اسلام کی بالادستی اور مسلمانوں کے غلبہ کی صورت میں بعض ارشادات میں ذکر فرمایا ہے، تاریخ کے مسلسل عمل کا رخ اسی جانب ہے اور جلد یا بدیر وہ آخری اور فیصلہ کن معرکہ بہرحال بپا ہو کر رہنا ہے۔ اس حوالہ سے تو ہمیں کسی قسم کا کوئی تردد یا شبہ نہیں ہے، البتہ کچھ عرصہ سے پاکستان کی عسکری قیادت کے بارے میں یہ شک ذہنوں میں ابھرنے لگا ہے کہ کہیں جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ ماضی اور تاریخ کے مسلسل عمل کا شعور اور ادراک ہماری عسکری قیادت کے ذہنوں سے محو تو نہیں ہو گیا؟ جنرل محمد عزیز خان نے راولاکوٹ کی تقریر میں ہمارا یہ شک دور کر دیا ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۲۷ جون ۲۰۰۳ء)

کیا پاک بھارت انضمام ممکن ہے؟

مولانا فضل الرحمان نے دورہ بھارت سے واپسی پر بعض اخبارات میں شائع ہونے والی ان خبروں کی تردید کی ہے کہ انہوں نے پاکستان اور بھارت کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے گول میز کانفرنس کی کوئی تجویز پیش کی ہے، انہوں نے کہا کہ وہ ''اکھنڈ بھارت'' کے حامی نہیں ہیں اور نہ ہی اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی بات کی ہے۔

مولانا فضل الرحمان کی اس وضاحت کے بعد ہمارے خیال میں اس حوالہ سے گفتگو کو آگے بڑھانے کی گنجائش باقی نہیں رہی، لیکن مسئلہ صرف مولانا فضل الرحمان کا نہیں بلکہ ان دنوں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرانے کے مشن پر جولوگ ٹریک ٹو یا بیک چینل ڈپلومیسی پر کام کر رہے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد اس قسم کی باتیں کہہ رہی ہے اور ملک کے بعض ذمہ دار اخبار نویس حضرات نے بھی اپنے کالموں میں اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے ''یورپی یونین'' طرز کے کسی مشترکہ نظام کا حصہ بننے کی افادیت کا جائزہ لینا چاہیے۔ جبکہ جنوبی ایشیا کے مستقبل کے نقشہ کے لیے سامنے آنے والی مختلف تجاویز میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا کی طرز پر یونائیٹڈ اسٹیٹس آف ساؤتھ ایشیا، یا یورپی یونین کی طرز پر انڈین یونین کا کوئی ایسا نظام ضرور قائم ہوجانا چاہیے جس میں پاکستان اور بھارت دونوں شامل ہوں، اور اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی ختم کی جائے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات کو کسی نہ کسی طرح حل کر کے دونوں کو ایک نظم کا حصہ بنانے کے جو فوائد گنوائے جا رہے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

☆ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کم ہوگی اور ایک دوسرے کے مقابلہ اور باہمی مسابقت

کے ماحول میں دفاع پر جو بھاری اخراجات ہو رہے ہیں انہیں کم کر کے فنڈز کو عوام کی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔

☆ دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت کی صورت میں ایٹمی قوت کی ضرورت نہیں رہے گی اور دونوں یا کم از کم پاکستان کو ایٹمی قوت سے دستبرداری پر مجبور کیا جا سکے گا۔

☆ پاک فوج کا سائز کم کیا جا سکے گا جس کا ایک عرصہ سے عالمی طاقتوں کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

☆ ایک جداگانہ اور خودمختار نظریاتی اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کسی نہ کسی وقت عالم اسلام کے اتحاد اور اس کی قیادت کے لیے جو کردار ادا کر سکتا ہے اس کا امکان کم ہو جائے گا۔

☆ سرحدات کا کنٹرول نرم پڑنے سے نہ صرف دونوں ملک ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ تجارت کر سکیں گے بلکہ ''فری ٹریڈ'' کے عنوان سے دنیا بھر کی تجارت پر اجارہ داری کے خواہش مند بڑے صنعتی ممالک کو ایک بڑی آزاد منڈی میسر آ جائے گی۔

☆ چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور مستقبل میں ایک عالمی طاقت کے طور پر اس کے امکانی کردار کا راستہ روکنے کے لیے اس کے گرد حصار مکمل کیا جا سکے گا۔

یہ اور اس قسم کے اور ممکنہ فوائد ہیں جن کے پیش نظر پاکستان اور بھارت کو کسی نہ کسی مشترکہ نظم کا حصہ بنانے کی تجویز آ رہی ہے اور اس کا ماحول بنانے کے لیے سالہا سال سے بیک ڈور، بیک چینل اور ٹریک ڈپلومیسی کے ذریعے مختلف شعبوں میں مسلسل کام ہو رہا ہے۔ اس میں تازہ تبدیلی صرف یہ ہوئی ہے کہ اس مہم میں مولانا فضل الرحمان اور جمعیت علماء اسلام بھی اب ایک اہم حصہ اور کردار بنتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ ہمارے نزدیک یونائیٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا یا انڈین یونین قسم کی یہ تجاویز دراصل جمعیت علماء ہند کے اس فارمولے کی صدائے بازگشت ہیں جو قیامِ پاکستان سے قبل جمعیت علماء ہند نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں پیش کیا تھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ برصغیر کو پاکستان اور بھارت کے نام پر دو الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کرنے کی بجائے ایک کنفیڈریشن کے تحت صوبوں کو مکمل خودمختاری دے دی جائے اور دفاع، خارجہ پالیسی،

مواصلات اور دیگر ضروری شعبوں کے لیے کنفیڈریشن طرز کا مشترکہ نظام وضع کر لیا جائے۔ اس تجویز کو اس وقت مسترد کر دیا گیا تھا، لیکن آج وہی بات پاکستان اور بھارت کے مستقبل کے حوالہ سے مختلف حلقوں کی تجاویز میں سامنے آ رہی ہے۔

مگر ہمارے لیے سوچنے کی بات ہے کہ کیا پاکستان کی جداگانہ خودمختار حیثیت اور اس کے اسلامی نظریاتی تشخص کو ختم کرنا یا کسی مشترکہ نظام کا حصہ بنا کر اسے کمزور کر دینا آج کے حالات کے تناظر میں مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا؟ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے اور پاکستان کو اس کے نظریاتی تشخص اور عسکری و ایٹمی صلاحیت سے محروم کر کے انڈیا کے ساتھ کسی نظم میں شریک کرنے کا مطلب جنوبی ایشیا پر بھارت کی بالادستی کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہوگا، جس کے بعد (خدانخواستہ) نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ وسطی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان بھی بھارت اور اسرائیل کے اس حصار میں آ جائیں گے جسے امریکہ اور یورپی یونین کی مکمل پشت پناہی حاصل ہوگی، اور اس کے نتائج کا اندازہ کرنا کسی ذی شعور مسلمان اور پاکستانی کے لیے مشکل کام نہیں ہے۔

تاریخ یہ کہتی ہے کہ ہمارے جن بزرگوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور برصغیر کی تقسیم کو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف قرار دیا تھا، قیامِ پاکستان کے بعد ان بزرگوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اب پاکستان کی بقا اور استحکام میں ہی جنوبی ایشیا بلکہ پورے عالم اسلام کا مستقبل وابستہ ہے اور مسلمانوں کو اس نئے وطن کے استحکام اور سلامتی کے لیے محنت کرنی چاہیے۔

☆ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا وہ تاریخی خط حضرت مولانا زاہد الحسینیؒ آف اٹک کی کتاب ''چراغ محمدؐ'' میں موجود ہے جس میں حضرت مدنیؒ نے فرمایا تھا کہ پاکستان کے قیام سے ہمارے اختلاف کی نوعیت ایسی تھی جیسی کسی محلّہ میں مسجد بنانے کے لیے جگہ اور نقشے سے اختلاف ہو جائے، ایک فریق الگ جگہ اور اپنے نقشے کے مطابق مسجد بنانے پر اصرار کر رہا ہو اور دوسرا گروہ اس جگہ اور نقشہ سے اختلاف کر رہا ہو، لیکن جب ان میں سے کوئی فریق اپنے نقشے کے مطابق مسجد بنا لے تو مسجد بن جانے کے بعد سب کی مسجد ہے اور اس کے تقدس کی حفاظت سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

☆ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اس اعلان کو جانباز مرزا مرحوم نے تفصیل کے ساتھ ’’کاروان احرار‘‘ میں نقل کر دیا ہے جس میں انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں جلسہ عام میں کہا تھا کہ ہماری ایک رائے تھی جسے قوم نے قبول نہیں کیا لیکن اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے تو ہم سب کا وطن ہے، اس کی سالمیت، خودمختاری اور استحکام کے لیے جدوجہد کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے اور ہم پاکستان کے تحفظ اور دفاع میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

☆ تحریک پاکستان کی مخالفت میں سب سے بڑا نام مولانا ابوالکلام آزادؒ کا لیا جاتا ہے، انہوں نے صرف قیامِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کے خلاف کانگریس کی مہم کی قیادت کی کہ اس دور میں انڈین نیشنل کانگریس کے سربراہ وہی تھے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے مختلف مسلم شخصیات اور حلقوں کو پاکستان کے استحکام کے لیے کام کرنے کی تلقین کی اور پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری کے تحفظ کو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں اور عالم اسلام کے لیے ضروری قرار دیا۔ صدیقی ٹرسٹ کراچی نے حال ہی میں ’’ابوالکلام آزاد اور پاکستان‘‘ کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں دیگر شخصیات کے علاوہ معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر برکت علی قریشی کا یہ انکشاف بھی نقل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی کانگریسی تھے اور مولانا آزادؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے دوستوں میں سے تھے، انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے کہنے پر بھارت میں رہنے کا فیصلہ کیا اور پنڈت نہرو نے انہیں کسی عرب ملک میں بھارت کا سفیر بنانے کی پیشکش کی جسے انہوں نے قبول کر لیا لیکن بعد میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے کہنے پر انہوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور بھارت میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مولانا آزاد نے انہیں کہا کہ آپ کا بھارت میں رہنے کا فیصلہ درست نہیں ہے آپ کو پاکستان جانا چاہیے اور اس نئے مسلم ملک کے استحکام اور ترقی کے لیے کام کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے تعجب سے مولانا آزادؒ سے ان کے اس ارشاد کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ

”میرے بھائی ہم نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی اور کئی اسباب میں سے ایک سبب اس مخالفت کا یہ خوف بھی تھا کہ اس تقسیم کے ساتھ ملت اسلامیہ ہند بھی تقسیم ہو جائے گی اور اس کی طاقت گھٹ جائے گی، مگر ملت کی اکثریت نے ہماری رائے کے خلاف فیصلہ دیا، ہم ہار گئے اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ پاکستان وجود میں نہ آتا تو اور بات تھی اور اب ظہور میں آ گیا ہے تو ہر دوسرے اسلامی ملک کی طرح ہمیں یہ ملک بھی عزیز ہے بلکہ دوسرے ممالک سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اب اسے باقی رہنا چاہیے، اس کا بن کر بگڑ جانا سارے عالم اسلام کی شکست کے برابر ہوگا اور اس کا وجود میں آ کر ناپید ہو جانا سارے عالم اسلام کی توہین ہوگا۔ اب آپ لوگ بھارت کی طرف نہ دیکھیں اب آپ پاکستان کو مضبوط بنائیں، ہم یہاں آپ لوگوں کی بہتری کے لیے دعا کرتے رہیں گے، آپ پاکستان کی خدمت کریں“۔

ہمارے خیال میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اس ارشاد میں ہم سب کے لیے پیغام یہ ہے کہ پاکستان کے مستقبل کو محدود علاقائی مفادات کے حوالہ سے نہ دیکھا جائے بلکہ عالم اسلام کے اجتماعی مفاد کے تناظر میں دیکھا جائے۔ پاکستان کو عالم اسلام کے مجموعی ماحول سے الگ کر دینے کی کوئی تجویز نہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مفاد میں ہے اور نہ ہی ملت اسلامیہ کے مفاد میں ہو سکتی ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۲۹ جولائی ۲۰۰۳ء)

پاکستان اور عالم اسلام کا مستقبل

مولانا فضل الرحمان کی قیادت میں جمعیت علماء اسلام کا وفد بھارت کے دورے سے واپس آ گیا ہے، وفد میں جمعیت کے تین دوسرے لیڈر حافظ حسین احمد، مولانا گل نصیب خان، اور مولانا قاضی حمید اللہ خان بھی شامل تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں حاضری کے علاوہ جمعیت علماء ہند کے راہنماؤں اور بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی سمیت متعدد بھارتی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں جن میں انڈین نیشنل کانگریس کی لیڈر سونیا گاندھی بھی شامل ہیں۔ اس دورے کا اصل پس منظر تو یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل پشاور میں جمعیت علماء اسلام کے زیراہتمام منعقد ہونے والی ''خدمات دارالعلوم دیوبند کانفرنس'' میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علماء ہند کے قائدین پاکستان تشریف لائے تھے، اور اب جمعیت علماء اسلام کے قائدین نے ضروری سمجھا کہ وہ بھی بھارت جائیں اور دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علماء ہند کے مراکز میں حاضری دیں، مگر اس کے ساتھ چونکہ سیاسی ماحول سے فائدہ اٹھانا اور اپنی ہر بات سے سیاسی فوائد حاصل کرنا ہر سیاسی لیڈر کا حق سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے موجودہ علاقائی سیاست اور ماحول کے تناظر میں اس کی کوشش بھی ہوئی اور اس کے اثرات وثمرات بھی سامنے آئے۔

☆ پاکستان اور بھارت کے درمیان ٹریک ٹو اور بیک چینل ڈپلومیسی کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے، دانشوروں، صحافیوں، ریٹائرڈ افسروں، جرنیلوں اور ثقافتی فنکاروں کے وفود آ جا رہے ہیں، پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور دونوں ملکوں کو میز پر بٹھانے اور باہمی گفتگو کے ذریعے تنازعات کو حل کرانے کی تگ و دو ہو رہی ہے۔

☆ بڑے صنعتی ممالک کے گروپ جی ایٹ کو اس بات کی جلدی ہے کہ تنازعات جلدی کسی کنارے پر لگیں تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان سرحدوں کو پابندیوں کو ختم یا کم از کم کر کے ''فری ٹریڈ'' کے ذریعے اس وسیع و عریض منڈی سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

☆ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت اور ایک مضبوط فوج کو زائد از ضرورت سمجھنے والوں کی خواہش ہے کہ پاک بھارت مصالحت کا اہتمام کر کے پاکستان سے کہا جائے کہ اب اسے ایٹمی صلاحیت اور اتنی بڑی فوج کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے وہ ان سے دستبردار ہونے کی تیاری کر لے۔

☆ پاکستان کی نظریاتی حیثیت اور اسلامی تشخص کو عالم اسلام کے مستقبل کے حوالے سے خطرہ باور کرنے والوں کا جی چاہتا ہے کہ اسے یورپی یونین طرز کی کسی ''انڈین یونین'' کا حصہ بنا کر اس کی چودھراہٹ کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا جائے، تاکہ یہ امکان ہی سرے سے باقی نہ رہے کہ عالم اسلام کبھی اسلام کے نام پر دوبارہ متحد ہو سکتا ہے اور پاکستان اس کی قیادت کر سکتا ہے۔

اس تناظر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے کی کوششوں میں یہ پہلو بھی خاصا مؤثر ثابت ہو سکتا ہے کہ جمعیت علماء اسلام پاکستان اور جمعیت علماء ہند کے درمیان تعلقات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ پاکستان کے ہزاروں علماء کرام اور لاکھوں دینداروں کی عقیدت اور تعلیمی وفکری تعلق کو دونوں ملکوں کی باہمی کشیدگی اور کشمکش میں کمی لانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس پس منظر نے جمعیت علماء اسلام پاکستان کے قائدین کے دورۂ بھارت میں اچھا خاصا سیاسی رنگ بھر دیا۔ اسے ''علماء ڈپلومیسی'' کا نام دیا گیا اور اس کے حوالے سے پاکستان اور بھارت کے باہمی قرب میں اضافہ کی نوید سنائی گئی۔ وفد کے سربراہ مولانا فضل الرحمان اور ان کے رفقاء نے بھی اس ''رنگ آمیزی'' سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی۔ اور خدا جانے یہ خود ان کی حکمت عملی تھی یا کسی ''بریفنگ'' کا نتیجہ کہ ان کے اس دورے کو پاک بھارت کشیدگی کم کرنے کی اس مہم سے پوری طرح جوڑ دیا گیا۔ جمعیت علماء اسلام کے راہنماؤں کے بھارت جانے سے عمومی تاثر یہی سامنے آیا کہ وہ بھی اس ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کا حصہ بن گئے ہیں

جو پاکستان اور بھارت کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے ایک عرصہ سے جاری ہے، اور جسے مذکورہ بالا مقاصد کے لیے بتدریج آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

اس دوران میڈیا کے ''گوریلا سیکشن'' نے اس صورتحال سے خوب فائدہ اٹھایا، مولانا فضل الرحمان کے حوالے کے گرما گرم خبریں سامنے آئیں، چٹ پٹے بیانات پڑھنے کو ملے، پاکستان اور بھارت کو دوبارہ متحد کرنے کے امکان پر بات ہوئی، اور جرمنی کے اتحاد کا حوالہ بھی دیا گیا، کشمیری مجاہدین کی مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں تحفظات کا اظہار ہوا، جموں و کشمیر کی کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد بنانے کا ذکر ہوا، شملہ معاہدے کو تنازعات کے حل کے لیے بنیاد بنانے کی تجویز منظر عام پر آئی، اور بھارتی وزیراعظم کی پاکستان آنے کی آمادگی کی خوشخبری بھی قوم نے سنی۔ مولانا فضل الرحمان نے ان میں سے بہت سی باتوں کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے یہ باتیں نہیں کہیں اور خاص طور پر ''اکھنڈ بھارت'' والی بات تو انہوں نے قطعاً نہیں کہی اور نہ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے حوالے سے یہ باتیں ایک بار بین الاقوامی پریس میں آ چکی ہیں تو ایک عرصہ تک گفتگو اور تبصروں کا موضوع رہیں گی، اور مولانا فضل الرحمان کی واضح تردید کے باوجود ہر موقع پر ان کا حوالہ دیا جائے گا۔

جناب سرور کائناتؐ نے غالباً اسی قسم کی صورتحال کے حوالے سے فرمایا تھا کہ **''اتقوا مواضع التهم''** تہمت کے مقامات سے بچو۔ یعنی ایسی جگہ مت کھڑے ہو جہاں تمہیں دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ شک و شبہ سے دوچار ہوں اور کسی کو تمہارے بارے میں کچھ کہنے کا موقع مل جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا فضل الرحمان نے یہ باتیں نہیں کہیں اور وہ جو تردید کر رہے ہیں سو فیصد درست ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کے جس قافلے میں وہ شامل تھے اور ان سے قبل جو لوگ بھارت گئے ہیں یا بعد میں جانے والے ہیں ان میں اکثر لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں، اور وہ صرف زبانی نہیں بلکہ بیانات اور کالموں میں بھی یہ باتیں آ رہی ہیں، اس لیے اس کیچڑ میں چلتے ہوئے کپڑے بار بار سمیٹنے کے باوجود وہ اس کے چھینٹوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا فضل الرحمان کے واضح تردیدی بیانات کے باوجود ایک دوست نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ کیا مولانا فضل الرحمان نے یہ باتیں کہیں ہیں اور آپ کا اس سلسلہ میں کیا موقف ہے؟ میں

نے جواب میں عرض کیا کہ جب مولانا فضل الرحمان کہتے ہیں کہ انہوں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی اور یہ سب کچھ میڈیا کے ''گوریلا سیکشن'' کی کارستانی ہے تو ہمیں ان کی بات پر یقین کر لینا چاہیے اور ان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ باقی رہی بات ہمارے موقف کی تو اس کی وضاحت قیامِ پاکستان کے فوراً بعد تحریک پاکستان کے دو بہت بڑے مخالفوں نے کر دی تھی۔

ان میں ایک سید حسین احمد مدنیؒ جن کا مکتوب اٹک کے مولانا قاضی زاہد الحسینیؒ کی کتاب ''چراغ محمدؐ'' میں موجود ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ قیامِ پاکستان سے قبل ہمارے اختلاف کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسے کسی محلّہ میں مسجد بنانے پر اختلاف ہو جائے۔ ایک گروہ اس کے سائز، مقام اور نقشہ میں ایک رائے رکھتا ہو اور دوسرے فریق کی رائے اس سے مختلف ہو۔ ان میں ایک فریق غالب آ گیا اور اس نے اپنی تجویز کے مطابق مسجد بنا لی، دوسرے فریق کی رائے نہ چل سکی۔ لیکن جب مسجد بن گئی تو وہ سب کی مسجد ہے اور اس کے تقدس کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہے۔

دوسرے بزرگ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہیں جو تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ لیکن جب پاکستان بن گیا تو انہوں نے لاہور میں کھلے بندوں جلسہ عام منعقد کر کے اعلان کیا کہ ہماری ایک رائے تھی جسے قوم نے قبول نہیں کیا، اس لیے ہم قوم کا فیصلہ قبول کرتے ہیں، پاکستان ہمارا وطن ہے اس کی بقا اور استحکام ہماری ذمہ داری ہے اور ہم اس کی سالمیت اور تحفظ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

اس کے بعد کسی اور حوالہ کی ضرورت اگرچہ باقی نہیں رہی، لیکن اس حوالے سے ایک اور بات کو تذکرہ بھی ضرور کرنا چاہوں گا۔ جن دنوں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان کا بحران درپیش تھا اور جنرل یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمان اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان پاکستان کے مستقبل کے بارے میں مذاکرات جاری تھے، اس موقع پر قومی اسمبلی کے چھوٹے گروپوں نے بھی مذاکرات میں حصہ لیا تھا اور اس مذاکراتی وفد میں مولانا مفتی محمودؒ شامل تھے۔ مفتی صاحبؒ نے جمعیت علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں یہ بات بتائی کہ وہ اور خان عبدالولی خان دونوں شیخ مجیب الرحمان سے ملاقات و گفتگو کے لیے گئے تو انہوں نے شیخ صاحب مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

’’شیخ صاحب! آپ مسلم لیگی ہیں اور ہمیں کانگریسی کہا جاتا ہے۔ کل آپ پاکستان بنا رہے تھے تو ہم نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرو، اس سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو نقصان ہوگا، مگر آپ نے ہماری بات نہیں سنی۔ آج آپ لوگ پاکستان توڑ رہے ہیں تو ہم آپ کو یہ کہنے آئے ہیں کہ پاکستان کو نہ توڑو، اس سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو نقصان ہوگا.......‘‘

کیونکہ پاکستان جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز ہے، اور جس حالت میں بھی ہے، ان کی آزادی اور خودمختاری کی علامت ہے۔ اس کی بقا و استحکام اور سالمیت و خودمختاری سے صرف جنوبی ایشیا ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مستقبل وابستہ ہے، اس لیے اسے ختم یا کمزور کرنے کی کسی کوشش کو حضرت مدنیؒ اور امیر شریعتؒ کے کسی پیروکار کی حمایت حاصل نہیں ہوسکتی۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور......۵ اگست ۲۰۰۳ء)

کیا ہمارے فیصلے ہمیشہ دباؤ کے تحت ہوتے رہیں گے؟

جنرل پرویز مشرف اور مسٹر اٹل بہاری واجپائی اپنے ملکوں سے چل پڑے ہیں، دونوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنا ہے اور دونوں نے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش سے ملاقات کرنی ہے جو آج کی عالمی صورتحال اور خاص طور پر جنوبی ایشیا کے مستقبل کے بارے میں بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے کی جانے والی قیاس آرائیوں کے پس منظر میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کو کم کرانے اور مسئلہ کشمیر کا کوئی نہ کوئی حل نکالنے کے لیے گزشتہ کئی برسوں سے بیک ڈور اور ٹریک ٹو ڈپلومیسی پر جو کام ہو رہا ہے اس کا نتیجہ نکلنے کا وقت آ گیا ہے اور صدر بش کے ساتھ پرویز مشرف اور واجپائی کی ملاقاتوں کے بعد اس کی کوئی واضح صورت سامنے آ جائے گی۔

چند ماہ قبل مئی کے دوران جب میں نیویارک آیا تھا تو باخبر دوستوں کی ایک محفل میں یہ بات سننے میں آئی تھی کہ کشمیر کا مسئلہ ''چناب فارمولے'' کے مطابق حل کر دینے پر کم و بیش سب فریقوں کا اتفاق ہو گیا ہے اور اب اس کا رسمی اعلان ہونا باقی ہے۔ اس کے بعد پاکستان اور کشمیر کے متعدد لیڈروں کی زبان سے چناب فارمولے کا تذکرہ قوم نے سنا اور اب یہ توقع کی جا رہی ہے کہ دریائے چناب کی بنیاد پر کشمیر کو تقسیم کر کے پاکستان اور بھارت دونوں کو اسے قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے گا۔ جس کی طرف شاید امریکہ، پاکستان اور بھارت کے حکمرانوں کی اسی ملاقات میں عملی پیشرفت کا آغاز ہو جائے۔

دورہ امریکہ کے لیے پاکستان سے روانگی کے بعد جنرل پرویز مشرف سے منسوب جو بیانات بین الاقوامی پریس میں آئے ہیں ان میں دو باتیں بطور خاص اہمیت رکھتی ہیں:

(۱) ایک بیان کے مطابق جنرل پرویز نے عالمی برادری سے اپیل کی ہے کہ وہ پاکستان میں ان کو سپورٹ کرے ورنہ مغربی قوتوں کو پاکستان میں کٹر بنیاد پرستوں کا براہ راست سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدر پرویز مشرف نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد جو پالیسی افغانستان کے حوالہ سے اختیار کی تھی وہ اسے پاکستان میں بھی عملاً نافذ کرنا چاہتے ہیں اور انہیں توقع ہے کہ وہ مغرب کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہونے کی صورت میں پاکستان میں دینی قوتوں کو قومی منظر سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بات ملک کے دینی حلقوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے اور ان کے بارے میں پرویز حکومت کے عزائم کی عکاسی کرتی ہے۔

(۲) دوسرا بیان آج نظر سے گزرا جس میں صدر پرویز مشرف نے کہا ہے کہ عراق کے حالات مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں اس لیے وہاں پاکستان کی فوج کو بھیجنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ بات اگر انہوں نے کہی ہے تو انتہائی خوش آئند ہے اور اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم جنرل پرویز مشرف سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ کیا ہمارے فیصلے ہمیشہ حالات کے دباؤ یا موافقت اور عدم موافقت کی بنیاد پر ہی ہوتے رہیں گے؟ اور کیا عراق میں حالات میں مزید بگاڑ نہ ہوتا تو وہاں پاکستان کی فوج کو بھیجنا مناسب ہو جاتا؟ ہمارے خیال میں اسی طرز عمل نے ہماری قومی پالیسی کے گرد بحرانوں کا تانا بانا بن رکھا ہے اور قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ ہم اس طرز عمل سے جتنی جلد ہو سکے نجات حاصل کر لیں۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد...... ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء)

تعلیمی نظام اور بین الاقوامی مطالبات

......دوسری طرف ملک کے ریاستی اور سرکاری تعلیمی اداروں کا نصاب و نظام تعلیم بھی ردوبدل کے اس عمل سے دوچار ہے اور اسے دو حوالوں سے یلغار کا سامنا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں جس درجہ میں بھی دینی تعلیم اور اسلامی اقدار کا مواد موجود ہے، اسے نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جہاد کی آیات نصاب سے نکالنے کی کوشش پر قومی اسمبلی میں ہنگامہ ہو چکا ہے اور حکمران گروہ لوگوں کو یہ یقین دلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے کہ نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا رہی۔ جبکہ سرکاری تعلیمی بورڈ کو آغا خان فاؤنڈیشن کے تعلیمی نظام کے ساتھ منسلک کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آغا خان فاؤنڈیشن کے ذریعے سے ایجوکیشن بورڈز اور تعلیمی نصابوں کو از سر نو سیکولر تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلام کی تعلیم کا جو عنصر کسی بھی درجہ میں موجود ہے، اسے خارج کر کے بین الاقوامی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر پورے نصاب تعلیم کو سیکولر بنا دیا جائے۔ ایک طرف وفاقی وزراء نصاب سے اسلامی مواد خارج نہ کرنے کی یقین دہانی کرانے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ تعلیمی بورڈز کو منسلک کر کے عملاً تمام تبدیلیوں کی راہ ہموار کر دی گئی ہے۔

اس عالمی یلغار کے تیسرے ریلے کا رخ بھی ریاستی اور حکومتی تعلیمی نظام و نصاب کی طرف ہے اور اس کا ہدف یہ ہے کہ تعلیمی نصاب میں جو مواد بھارت کے بارے میں منفی جذبات کا باعث بن رہا ہے، وہ خارج کر دیا جائے۔ اس کی زد میں تاریخ بھی ہے کہ مغلوں کی بادشاہت کا تذکرہ بھارت کے لیے قابل قبول نہیں ہے، تحریک آزادی کے بہت سے مسلم ہیرو بھارت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے، کشمیر اور اس کی تحریک آزادی کا تذکرہ بھارت کے خلاف منفی جذبات ابھارتا

ہے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے شہداء بھی بھارت کی جارحیت کے خلاف دفاع وطن کا جذبہ پیدا کرنے میں خاصا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ سارا مواد تعلیمی نصاب سے خارج کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر پاکستان کو عالم اسلام اور اسلامی برادری سے الگ کرنے کے بعد اب دوسرے مرحلے میں اسے جنوبی ایشیا کی کسی یونین یا کنفیڈریشن کا حصہ بنانے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ اور ہمیں اس مہم کو دیکھ کر برادر مسلم ملک ترکی یاد آ رہا ہے جسے کہا گیا تھا کہ وہ ترکی ہے، یورپین ہے اور مغرب کا حصہ ہے، اسے عالم اسلام کی چودھراہٹ سے کیا سروکار ہے؟ وہ مسلم دنیا کی چودھراہٹ چھوڑ دے، عالم عرب اور عالم اسلام سے الگ ہو جائے اور ''سب سے پہلے ترکی'' کو اپنا ہدف بنائے۔ اس غریب نے ایسا ہی کیا اور اس کے لیے بہت کچھ قربان کر دیا لیکن ''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم'' کے مصداق اس کے ہاتھ سے عالم اسلام کی چودھراہٹ بھی گئی، خلافت اور اسلامی نظام قانون بھی ہاتھ سے جاتا رہا، اور یورپی یونین میں شرکت کا خواب بھی پورا نہ ہوا۔

پاکستان بنانے والوں نے اسے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مرکز اور مسلم دنیا کی قیادت کے لیے تشکیل دینے کا تصور پیش کیا تھا۔ علامہ محمد اقبالؒ کا خواب یہی تھا اور قائداعظمؒ تحریک پاکستان کے دوران میں مسلسل یہ بات دہراتے رہے کہ وہ اسلامی تہذیب کے احیا اور ایک فلاحی اسلامی ریاست کا نمونہ پیش کرنے کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن آج یہ سارا فلسفہ، پوری سوچ اور مکمل جدوجہد جنوبی ایشیا کی اجتماعیت اور عالمی ہم آہنگی کے نام پر عالمی استعمار کے ایک اشارۂ ابرو پر قربان کی جا رہی ہے۔ یہ امتحان کا وقت ہے اور آزمائش کا مرحلہ ہے، علماء کرام کے لیے بھی اور محبّ وطن دانشوروں کے لیے بھی کہ وہ قوم کو اس بحران سے نکالنے کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دینی قیادت اور قومی دانش کو اس نازک مرحلہ میں صحیح اور دانشمندانہ فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور...... ۱۹ مارچ ۲۰۰۴ء)

پاکستانی اور اسرائیلی وزرائے خارجہ کی ملاقات

پاکستان کے وزیر خارجہ جناب خورشید محمود قصوری اور اسرائیل کے وزیر خارجہ سلوان شلوم کے درمیان گزشتہ دنوں استنبول میں ہونے والی ملاقات حسب توقع دنیا بھر میں موضوع بحث بنی ہوئی ہے اور اس کے حق میں اور خلاف دلائل دیے جا رہے ہیں۔ دنیا کے کوئی بھی دو ملک آپس میں کسی بھی سطح پر رابطہ کر سکتے ہیں اور ان کے درمیان ملاقات و مذاکرات کا اہتمام ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ پاکستان نے اب تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا اور اسرائیل کے بارے میں پاکستان عوام کے جذبات میں شدت و حساسیت پائی جاتی ہے، اس لیے اس ملاقات کو خلاف معمول قرار دیا جا رہا ہے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے کہ اتنا بڑا اقدم پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیے بغیر اٹھایا گیا ہے اور متحدہ مجلس عمل نے اس ملاقات کے خلاف یوم احتجاج بھی منایا ہے جس کے تحت ملک کے مختلف علاقوں میں احتجاجی مظاہرے ہوئے ہیں۔

جبکہ دوسری طرف حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے یہ کہہ کر اس ملاقات کا جواز پیش کیا ہے کہ اگر یہودی عورتوں کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے تو ان کے ساتھ ملاقات و مذاکرات کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ہی وزیراعظم جناب شوکت عزیز نے قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا اور ایسا جب بھی ہوگا، پارلیمنٹ کو اعتماد میں لے کر کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ آزاد فلسطینی ریاست کے قیام اور القدس کو اس کا دارالحکومت قرار دیے جانے تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ادھر بین

الاقوامی پریس میں یہ خبریں بھی آرہی ہیں کہ ماہ رواں کے دوران میں نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف اور اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون کے درمیان ملاقات کا امکان بھی موجود ہے۔

متحدہ مجلس عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد نے اس پیشرفت کو اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کی طرف پہلا قدم قرار دیا ہے جبکہ دوسری طرف بہت سے دانشوروں کا کہنا ہے کہ بھارت کے ساتھ اسرائیل کے تیزی سے بڑھتے ہوئے تعلقات کے پس منظر میں توازن قائم کرنے کے لیے یہ رابطے ضروری ہیں اور فلسطین کی ریاست کے قیام کے سلسلے میں کسی مؤثر کردار کی پوزیشن میں آنے کے لیے بھی پاکستان کا اسرائیل کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔

اس ملاقات کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ ہجری سال کے اعتبار سے یہ ملاقات ۲۷ رجب کو ہوئی ہے جسے محض اتفاق قرار دینا بہت مشکل ہے۔ ۲۷ رجب کو اسلامی تاریخ میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کی شب کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج واسرا کے اعزاز سے نوازے گئے تھے اور اسلامی عقیدہ کے مطابق حضرت محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس شب ساتوں آسمانوں، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کے بہت سے مناظر دکھانے کے علاوہ بیت المقدس میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی امامت کے منصب پر فائز فرمایا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ جب حضرت جبریلؑ کے ہمراہ بیت المقدس پہنچے تو حضرات انبیائے کرامؑ سب کے سب وہاں جمع تھے اور صفیں باندھے ہوئے نماز کی امامت کے لیے کسی کے آگے بڑھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت جبریلؑ نے نبی اکرمؐ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں مصلے پر کھڑا کر دیا اور آنحضرتؐ نے حضرات انبیائے کرامؑ کی امامت کے فرائض سرانجام دیے جس پر انھیں ''امام الانبیاء'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ بیت المقدس کا ہے اور اسرائیل کے ساتھ عالم اسلام کے تنازع میں مرکزی حیثیت بیت المقدس کو ہی حاصل ہے، اس لیے یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ پاکستان اور اسرائیل کے وزرائے خارجہ کی ملاقات کا اہتمام اس روز ہوا۔

پاکستان کے حکمرانوں کے بارے میں ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں اس دن کی اہمیت کا علم نہیں ہوگا کیونکہ پاکستان سمیت مسلم دنیا کے اکثر حکمران اپنی دینی روایات سے باخبر نہیں ہوتے،

بلکہ اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کسی مسلم ملک میں حکمرانی کے منصب پر فائز ہونے والا شخص اسلام کی مذہبی اور دینی روایات سے بے خبر اور لاتعلق ہی رہے، البتہ اسرائیل کے حکمرانوں کے بارے میں یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسلامی روایات سے اس درجہ بے خبر ہوں گے اور انھوں نے اس ملاقات کے لیے ۲۷ رجب کا انتخاب محض اتفاق سے ہی کر لیا ہوگا۔ بہرحال اس میں المیہ کا یہ پہلو ہمارے نزدیک ضرور موجود ہے، اگر پاکستان کے حکمرانوں کو اس دن کی دینی اہمیت کا علم نہیں ہے تو یہ افسوسناک بات ہے اور اگر علم ہونے کے باوجود یہ دن اس ملاقات کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو افسوس کا یہ پہلو اور بھی زیادہ گہرا اور المناک ہو جاتا ہے۔ ملاقات کی ضرورت واہمیت پر گفتگو ہو سکتی ہے اور حالات کے مطابق اس کو کسی حد تک گوارا بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن زندہ قومیں ایسے امور کے لیے دنوں اور اوقات کا اہتمام سوچ سمجھ کر کیا کرتی ہیں جیسا کہ اسرائیل نے کیا ہے، اور غافل قومیں اپنی روایات واقدار سے ایسے مواقع پر بالکل بے گانہ ہو جایا کرتی ہیں جیسا کہ ہماری طرف سے اس کا اظہار ہوا ہے۔

اس ملاقات کے حوالے سے دو باتیں اور بھی ہمارے خیال میں توجہ طلب ہیں۔

ایک بات یہ کہی جا رہی ہے کہ پاکستان اور اسرائیل کے درمیان دوطرفہ طور پر کوئی تنازع نہیں ہے، اس لیے ان دونوں کے درمیان روابط اور سفارتی تعلقات کے قیام میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان بیت المقدس اور فلسطینی عوام کی مظلومیت کو براہ راست اپنا مسئلہ نہیں سمجھتا اور اسے صرف عربوں کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور نہ صرف پاکستان کے اسلامی تشخص اور دستور پاکستان کی تصریحات کی نفی کے مترادف ہے بلکہ پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کے دینی جذبات کی توہین بھی ہے۔ بیت المقدس دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کی طرح پاکستان کے مسلمانوں کا بھی قبلۂ اول ہے اور اس کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں کی عقیدت اسی طرح ہے جیسے دنیا کے دیگر مسلمانوں کی ہے۔ اس لیے بیت المقدس کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن جانے کو پاکستان کا براہ راست مسئلہ نہ سمجھنا اور اس کی موجودگی میں یہ کہنا کہ پاکستان اور اسرائیل کے درمیان کوئی دوطرفہ تنازع موجود نہیں ہے، حقائق کا انکار ہے اور اس ''علاقائی نیشنلزم'' کے منفی ثمرات میں سے ایک ہے جو مسلمانوں پر

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے ساتھ مسلط کی گئی تھی اور جس کے گورکھ دھندے میں الجھ کر دنیا بھر کے مسلمان ایک دوسرے سے لاتعلق اور بے گانہ ہوتے جا رہے ہیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو جسد واحد سے تعبیر فرمایا تھا اور اسلام کو پوری نسل انسانی کا مذہب قرار دے کر رنگ، نسل، علاقہ اور زبان کی تفریق سے بالاتر امت کی عملی شکل دنیا کے سامنے پیش کی تھی، مگر ہم مغرب کی پیروی میں پھر اس مقام سے نیچے اتر کر رنگ، نسل، علاقہ اور زبان کی قومیتوں کے دائرے میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ مغرب کی تو مجبوری ہے کہ مذہب کے معاشرتی کردار سے دستبرداری کے بعد اس کے پاس اجتماعیت اور معاشرت کی کوئی مشترکہ اساس باقی نہیں رہ گئی، اس لیے اسے نیشنلزم کے دائروں کا سہارا لینا پڑا۔ مگر ہمارے لیے مغرب کی پیروی ہی مجبوری اور پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے اور ہمارے پاس علاقائی قومیتوں میں بٹے رہنے کا یہی ایک جواز ہے کہ چونکہ مغرب میں ایسا ہو رہا ہے اس لیے ہمیں بھی یہی کرنا ہے۔ اس کے سوا دنیا بھر کے مسلمانوں کے مسائل اور حالات سے لاتعلق ہونے کا ہمارے پاس اور کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

دوسری بات بھی اسی سے متعلق ہے کہ پاکستان کے مفادات اور نفع ونقصان کے تمام دائروں کو صرف اور صرف جنوبی ایشیا کی حدود کا پابند کیا جا رہا ہے اور حالات کے جبر نے ہمارے نفع نقصان کا صرف ایک ہی معیار قرار دے دیا ہے کہ بھارت کے ساتھ معاملات کی نوعیت کیا ہوگی۔ ہم نے افغانستان پر فوج کشی کے لیے امریکہ کو اسٹریٹیجک سہولتیں فراہم کیں، اس لیے کہ اگر ہم نہیں کریں گے تو بھارت ایسا کر گزرے گا، اور اب اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے آغاز کے لیے بھی یہی دلیل سب سے زیادہ وزنی سمجھی جا رہی ہے کہ بھارت کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات میں توازن لانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کے درمیان طاقت کے توازن کے ساتھ ساتھ عالمی تعلقات اور اثر ورسوخ میں توازن کا موجود ہونا اور اس کا اہتمام کرنا ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس ضرورت سے انکار نہیں ہے، لیکن اسے عالم اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے لاتعلق ہونے کا جواز قرار دینے میں ہمیں کلام ہے اور ہم اس فلسفہ اور فکر کو درست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پھر بھارت کے ساتھ ہمارے تنازع کی بنیاد کیا ہے؟ ہم نے متحدہ ہندوستان کی تقسیم

اور پاکستان کے نام سے الگ ملک کے قیام کی بنیاد اسلام پر رکھی تھی اور مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب و معاشرت کے تحفظ اور سوسائٹی میں اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ و عملداری کو پاکستان کے وجود کی واحد وجہ جواز قرار دیا تھا۔ اس لیے اگر عالمی سطح پر اسلام کا یہ کردار قابل تسلیم نہیں ہے تو صرف جنوبی ایشیا کی حد تک اسلام کے اس کردار کو پاکستان کے وجود و بقا کے لیے وجہ جواز قرار دینا بھی بہرحال محل نظر ہو کر رہ جائے گا اور پاکستان خدانخواستہ اپنے وجود کے جواز سے محروم ہو جائے گا۔

(ستمبر ۲۰۰۵ء)

پاک امریکہ تعلقات: سابق صدر جنرل محمد ایوب خان کے خیالات

پاکستان کے بعض سیاستدانوں کے ساتھ امریکی ایلچی رچرڈ ہالبروک کی ملاقات اور گفتگو نے بہت سی پرانی باتوں کی یاد ذہن میں تازہ کردی ہے۔ ہالبروک کو شکوہ ہے کہ اربوں ڈالر کی امداد کے باوجود پاکستانیوں میں امریکہ مخالف جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک بہت پرانا پڑھا ہوا ناول یاد آ گیا ہے جو انقلابِ فرانس سے پہلے کے جاگیردارانہ ماحول کے حوالے سے تھا۔ ناول اور اس کے کرداروں کے نام تو یاد نہیں رہے مگر اس کا ایک پلاٹ ذہن کے کسی کونے کے ساتھ چپکا رہ گیا تھا جو ہالبروک کے اس شکوے کے ساتھ ہی اسکرین پر ابھر آیا ہے۔ کہانی کے مطابق ایک فرانسیسی جاگیردار بگھی پر اپنے کسانوں اور مزارعوں کی بستی سے گزر رہا تھا، راستے میں ایک جگہ بچے کھیل رہے تھے کہ اچانک ایک بچہ بگھی کے سامنے آ گیا۔ لیکن بگھی کے کوچوان نے رفتار کم کرنے کی بجائے اس بچے کے اوپر سے بگھی گزار دی جس سے بچہ کچلا گیا۔ اس کا باپ قریب ہی کھڑا تھا وہ غصے اور صدمے کی حالت میں بگھی کی طرف لپکا اور اس کو روکنے کی کوشش کی۔ جاگیردار جو یہ سارا منظر اپنی سیٹ پر بیٹھا دیکھ رہا تھا، اس نے کسان کو غصے میں دیکھ کر جیب سے ایک سکہ نکالا اور اس کی طرف پھینک دیا۔ کسان نے وہ سکہ غصے سے پکڑا اور اسے واپس بگھی کی طرف اچھال دیا جس پر جاگیردار نے انتہائی نفرت سے اس کسان کو گالی دیتے ہوئے اپنے کوچوانوں سے پوچھا کہ یہ اور کیا چاہتا ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ مسٹر ہالبروک کا یہ شکوہ پڑھ کر مجھے کم از کم ربع صدی قبل پڑھے ہوئے ناول کا

یہ حصہ بے ساختہ یاد آ گیا ہے مگر حسرت یہ رہی کہ پلاٹ کے باقی سارے کردار پورے تھے مگر سکہ بکھی کی طرف واپس اچھال دینے کا خانہ خالی نظر آیا۔ خدا جانے یہ حسرت کب پوری ہوگی؟ دراصل یہ مسٹر ہالبروک کا قصور نہیں ہے، مغربی استعمار کی قیادت اور دانش ابھی تک اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ امریکہ کے خلاف غصہ صرف اس وجہ سے ہے کہ غصہ کرنے والے غریب لوگ ہیں جنہیں امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے پاس دولت کی کثرت دیکھ کر غصہ آتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ انہیں بھی اس دولت میں سے حصہ دیا جائے۔ اس لیے کم و بیش ہر مغربی حکمران اور دانشور اس بات پر زور دے رہا ہے کہ ان غریب لوگوں کو پیسے دیے جائیں اور کچھ ڈالر ان کی طرف پھینکے جائیں تا کہ یہ خاموش رہیں، بلکہ ڈالر پھینکے جانے پر اپنے ''آقاؤں'' کا شکریہ ادا کریں اور ان کی وفاداری کا دم بھرتے رہیں۔

اکانومی اور معیشت کے چکر میں الجھی ہوئی اس سرمایہ دارانہ ذہنیت اور جاگیردارانہ مزاج کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ غصہ صرف پیسوں کی کمی پر نہیں آیا کرتا، اس کے اسباب اور بھی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر مشرقی اقوام اور ان میں سے بھی خصوصاً مسلم اقوام کے ہاں غصہ کے دیگر اسباب زیادہ مؤثر اور متحرک ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے مذہب کی توہین پر غصہ آتا ہے، قرآن کریم کی بے حرمتی پر غصہ آتا ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی پر غصہ آتا ہے، بیت اللہ اور بیت المقدس کی توہین پر غصہ آتا ہے، دنیا کے کسی حصے میں مسلمان بھائیوں کے مارے جانے پر غصہ آتا ہے، اور اپنے ملکوں اور اسباب وعوامل پر دوسرے لوگوں کے ناجائز تسلط اور جبر واستبداد پر بھی غصہ آتا ہے۔ اس غصے کا جب کوئی مداوا نہیں ہوتا اور اسے کم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ اسے طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو یہی غصہ بڑھتے بڑھتے نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ غصہ ڈالروں کی بارش سے نہیں دبتا اور نہ ہی زبانی لیپا پوتی سے اس میں کوئی کمی آتی ہے۔

مسٹر ہالبروک سے گزارش ہے کہ وہ مسلمانوں کے غصے اور امریکہ کے خلاف ان کے جذبات کو ڈالروں کے پیمانے سے نہ ماپیں بلکہ اس کے اصل اسباب کی طرف نظر کریں۔ کیونکہ جب تک مسلمانوں اور پاکستانیوں کے غصے اور نفرت کے اصل اسباب کو سنجیدگی کے ساتھ دور کرنے کی

کوشش نہیں کی جائے گی، ڈالروں کی جھنکار اور نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ سے اس غصے اور نفرت کو کم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔

اس گفتگو میں ایک پاکستانی سیاستدان نے مسٹر ہالبروک سے کہا کہ امریکہ ہمارا آقا نہ بنے بلکہ دوست بنے اور دوستوں کی طرح ہمارے ساتھ معاملات کرے۔ یہ بات بھی صدائے بازگشت ہے پاکستان کے سابق صدر جناب محمد ایوب خان مرحوم کے اس ردعمل کی جو انہوں نے پاکستان کی طرف سے امریکہ کے ساتھ دوستی کی پرخلوص کوششوں اور امریکہ کی طرف سے اس کے کم از کم الفاظ میں غیر مثبت جواب پر ظاہر کیا تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل جو کتاب شائع کی اس کا نام ہی ''آقا نہیں، دوست'' ہے۔ ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' کے عنوان سے لکھی جانے والی اس کتاب میں انہوں نے امریکہ کو یہی پیغام دیا تھا جو مسٹر ہالبروک کو ایک پاکستانی سیاستدان نے کم وبیش نصف صدی کے بعد دیا ہے۔ مسٹر ہالبروک کے ساتھ پاکستانی سیاستدانوں کی اس ملاقات کی رپورٹ اخبارات میں پڑھنے کے بعد میں نے ایوب خان مرحوم کی یہ کتاب تلاش کی۔ یہ کتاب جو کبھی فٹ پاتھوں پر آسانی سے مل جایا کرتی تھی اب مجھے دوران سفر ٹیکسلا میں ایک دوست حافظ محمد رفیق کی لائبریری سے دستیاب ہوئی۔ سابق صدر محمد ایوب خان مرحوم نے اپنی خارجہ پالیسی کا تذکرہ کرتے ہوئے امریکہ اور بھارت کے ساتھ اپنے معاملات کے مختلف مراحل بیان کیے ہیں جن کی چند جھلکیاں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

محمد ایوب خان مرحوم لکھتے ہیں کہ

> ''دنیا آج مساوات کے لیے لڑ رہی ہے۔ افراد کے درمیان مساوات اور اقوام کے درمیان مساوات، خواہ وہ بڑی ہوں یا چھوٹی، اس لیے ضروری ہے کہ تمام دنیا صاف صاف اس بات کو تسلیم کرے کہ ہر قوم مساویانہ حقوق اور مواقع کی مستحق ہے۔ دنیا کے ملکوں کی آزادی اور خودمختاری کی، ان کے رقبے (اور) وسائل کی بنیاد پر درجہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ یہ بڑی صاف بات ہے اور کوئی بھی اس سے انکار کی جرأت نہیں کرے گا۔ یہ دنیا بڑوں ہی بڑوں کی دنیا ہے، خواہ وہ دو بڑے ہوں یا تین بڑے، یا چار بڑے، یا اور بھی زیادہ۔ یہی دنیا

کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ملک، خصوصاً وہ جو ابھی صنعتی ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے ہیں، انہوں نے غلامی کا طوق تو اتار پھینکا ہے لیکن ابھی ان میں سے اکثر اپنی فضا کو سامراجی اثرات سے پاک صاف کر کے اپنے انفرادی وجود اور تصورات کو ابھار نہیں سکے۔ ہمیں بھی اپنی انفرادیت کو تسلیم کرانا اور ایک مساوی اور باوقار حیثیت حاصل کرنے کے لیے لڑنا ہے۔ بھارت نے شروع ہی سے ہماری راہ میں مشکلات پیدا کرنے کی ٹھان رکھی ہے، اس نے ہمارے لیے پناہ گیروں کی بحالی کا زبردست مسئلہ اس لیے پیدا کیا تھا کہ ہماری معیشت مفلوج ہو کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں وہ ساز و سامان دینے سے بھی انکار کر دیا جس میں ملک کی تقسیم سے پہلے ہمارا حصہ تھا۔ اس نے ہمیں ان دریاؤں کے بہاؤ کا رخ بدل دینے اور ان کا پانی روک لینے کی دھمکی دی جو ہمارے ملک میں بہتے ہیں۔ پھر اس نے تمام معاہدوں اور اصولوں کے خلاف جموں و کشمیر کی ریاست کے ایک بڑے حصے پر بزور قبضہ کر لیا اور اپنی فوجیں وہاں جمع کر کے ہمارے ملک کی سلامتی کے لیے ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا۔ ان سب باتوں کی تہہ میں بھارت کی یہ ہوس کارفرما تھی کہ وہ یا تو پاکستان کو اپنے میں جذب کر لے یا اسے اپنا حاشیہ نشین بنا لے۔ بھارتی لیڈروں نے اپنے ارادوں کو ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا۔ اچاریہ کرپلانی نے، جو ۱۹۴۷ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر تھے، علی الاعلان کہا ''نہ تو کانگریس اور نہ قوم اکھنڈ بھارت سے دستبردار ہوئی۔''

''اس زمانے میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے، جو پہلے انڈین ہوم منسٹر تھے اور کانگرس پارٹی کے مرد آہن کہلاتے تھے، یہ کہا تھا ''بہت دیر نہ گزرے گی کہ ہم دوبارہ ایک ہو کر اپنے ملک کی اطاعت گزاری میں باہم شریک ہو جائیں گے۔''

’’میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء کا جو زمانہ گزرا، اس میں ہمیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کیسی تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے امریکہ نے اپنی حکمتِ عملی کو حالات کے تابع کر دیا ہے۔ نیز یہ کہ جو تبدیلیاں وہ کر رہا ہے ان سے امریکی پالیسیوں اور پروگراموں کے اخلاقی پہلوؤں کی بابت لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ پاکستان کے لوگوں کو سخت مایوسی ہو رہی تھی۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ اور پاکستان میں بڑی محنتوں سے جو رشتہ قائم ہوا تھا اب لوگوں کے دلوں سے اس کا احترام اٹھتا جا رہا تھا۔ ہم ہندوستان کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے، نہ ہندوستان کے حملے کی صورت میں امریکہ کی امداد پر بھروسہ کر سکتے تھے۔ امریکہ جس پالیسی پر عمل کر رہا تھا، ہم جانتے تھے کہ اس سے آگے چل کر ایشیا میں اس کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔ لیکن ہمارے پاس امریکہ کو اس پالیسی سے باز رکھنے کے ذرائع نہیں تھے۔ امریکی حکومت کے دل و دماغ میں چین کا خطرہ چھایا ہوا تھا اور وہ ہندوستان سے بے اختیارانہ آس لگا رہی تھی کہ ہندوستان چینی خطرے کا توڑ ثابت ہوگا۔‘‘

’’ادھر پچھلے دس برس میں امریکہ کی پالیسیوں میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، جو ہندوستان کے بالمقابل امریکہ کے اتحادی پاکستان کے لیے متواتر نقصان کا باعث ہوتی رہیں۔ جب ہم نے پہلے پہل امریکہ کے ساتھ اتحاد کیا تھا تو اس غیر جانبداری کو، جسے ہندوستان ’’ناطرفداری‘‘ کے نام سے موسوم کرنا زیادہ پسند کرتا تھا، امریکہ میں شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ درحقیقت ’’غیر اخلاقی‘‘ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ دونوں فریقوں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرو۔‘‘

محمد ایوب خان مرحوم کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب میں یہ اقتباسات ہم نے اس لیے پیش کیے

ہیں تاکہ مسٹر ہالبروک پر یہ بات واضح ہو کہ انہیں آقا کے بجائے دوست بننے کا جو مشورہ دیا گیا ہے وہ آج کا نہیں ہے بلکہ نصف صدی پہلے ان کے ملک سے یہ گزارش کی گئی تھی اور اس کے اسباب بھی واضح کر دیے گئے تھے۔ پاکستان کے حالات، امریکی پالیسیاں، اور پاکستانیوں کے جذبات آج بھی اسی طرح ہیں جیسے نصف صدی پہلے تھے۔ ان کی شدت میں تو کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن ان میں کوئی فرق اور تغیر نہیں آیا۔ امریکہ کے لیے ہمارے جذبات وہی ہیں، اور پیغام بھی وہی ہے جو ہمارے سابق صدر جناب محمد ایوب خان مرحوم نے ۱۲ جولائی ۱۹۶۱ء کو امریکی کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں دیا تھا۔ ایوب خان مرحوم لکھتے ہیں کہ

> ''میں نے کانگرس کو اس کی ذمہ داریاں اور اس کے عالمی فرائض یاد دلائے۔ جب میں نے کہا کہ ''جو لوگ آپ کا ساتھ دیں گے وہ پاکستان ہی کے لوگ ہوں گے'' تو اس پر بڑی تالیاں بجائی گئیں، لیکن ابھی ان تالیوں کا شور تھمنے نہ پایا تھا کہ میں نے اتنا اور بڑھا دیا کہ ''بشرطیکہ۔۔۔ بشرطیکہ آپ بھی پاکستان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی مصلحت کے تقاضے کچھ بھی ہوں، آپ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو ہمارے مسائل کو مشکل بنا دے یا ہماری سلامتی کو کسی قسم کے خطرے میں ڈال دے۔ جب تک آپ اس بات کو یاد رکھیں گے ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی''۔

جناب ہالبروک سے گزارش ہے کہ وہ امریکی کانگرس کے سامنے پاکستان کے صدر کے ۱۲ جولائی ۱۹۶۱ء کے اس خطاب کو ایک بار پھر پڑھ دیں اور عزت مآب باراک حسین اوباما کو بھی پڑھا دیں۔ کیونکہ پاکستان کے حکمران کچھ بھی کرتے رہیں مگر پاکستانی قوم کے ذہن نصف صدی بعد بھی ''بشرطیکہ۔۔۔ بشرطیکہ'' کے اسی نکتے پر اٹکے ہوئے ہیں۔ اور ''بشرطیکہ'' تقاضوں کی طرف توجہ دیے بغیر امریکی حکمرانوں کو پاکستانی قوم سے اس کے غصے اور نفرت کے جذبات میں کمی کی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور......۱۵ فروری ۲۰۰۹ء)

جنوبی ایشیا پر امریکی تسلط کی پالیسی

مولانا فضل الرحمان صاحب کے ساتھ کافی عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی، وہ گزشتہ دنوں گوجرانوالہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے ضلعی امیر مولانا قاری عبدالقدوس عابدؒ کی وفات پر تعزیت کے لیے تشریف لائے اور گکھڑ میں والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی بیمار پرسی کے لیے بھی گئے جو ہجری اعتبار سے ستانوے برس کے پیٹے میں ہیں اور کئی برس سے صاحبِ فراش ہیں مگر ضعف، بیماریوں کے ہجوم اور نقاہت کے باوجود بحمد اللہ یادداشت پوری طرح قائم ہے......

ملاقات میں اس کے علاوہ اور بھی متعدد مسائل پر گفتگو ہوئی، خاص طور پر ممبئی دھماکوں اور اس کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی میں اضافے کی صورتحال زیر بحث آئی۔ مولانا فضل الرحمان کا کہنا ہے کہ جنوبی ایشیا میں امریکی اثر ورسوخ میں مسلسل اضافہ پورے خطے کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ اس خطے کے اکثر ممالک اس خطرے کو محسوس کر رہے ہیں اور یہ سوچ آگے بڑھ رہی ہے کہ جنوبی ایشیا کو مکمل امریکی تسلط سے بچانے کے لیے اس خطے کے ممالک کو مل جل کر کوئی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ اس سوچ پر عملی کام بھی دھیرے دھیرے ہو رہا ہے، خاص طور پر پاکستان اور بھارت کی قیادتیں اس سلسلہ میں باہمی تعاون کی راہیں تلاش کرنے میں مصروف ہیں لیکن جب بھی اس حوالے سے کوئی پیشرفت نظر آنے لگتی ہے ممبئی کے حالیہ سانحہ جیسا کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو جاتا ہے اور سارے کام کو بریک لگ جاتی ہے۔ ممبئی کے حالیہ واقعات بھی اسی سلسلہ کی کڑی نظر آتے ہیں، جن قوتوں کو ان سے فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ حالات کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کے لیے پورا زور لگا رہی ہیں۔ اس موقع پر دونوں ملکوں بالخصوص بھارت کی قیادت کو ہوش مندی سے کام لینا ہوگا اور ایسے کسی رخ سے بچنا ہوگا جس سے دوسری قوتوں کو دخل

اندازی اور پھر اس کے بہانے اپنے اثر ورسوخ اور تسلط میں اضافے کا موقع مل سکتا ہو۔

جماعۃ الدعوۃ پر پابندی کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ جماعۃ الدعوۃ ایک رفاہی تنظیم ہے جو امتِ مسلمہ کی رفاہی خدمات میں پیش پیش ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمی سطح پر گلوبلائزیشن کا جو نیٹ ورک مسلط کیا جا رہا ہے اور اس کے زیر سایہ لوکلائزیشن کا جو نظام قائم کیا جا رہا ہے اس میں ملٹی نیشنل کمپنیاں اور این جی اوز مصروف کار ہیں۔ عالمی استعمار کا پروگرام یہ ہے کہ عالمی سطح پر نظام کو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے کنٹرول کیا جائے اور مقامی سطح پر این جی اوز کو معاملات میں اس قدر دخیل بنا دیا جائے کہ ملکوں اور قوموں کی اصل سیاسی، مذہبی اور معاشرتی قیادتوں کی حیثیت محض نمائشی سی رہ جائے اور پوری دنیا کو ایک نظام کے شکنجے میں کس لیا جائے۔ این جی اوز کے آگے بڑھنے کا میدان رفاہی خدمات تھا جن میں الرشید ٹرسٹ، الاختر ٹرسٹ اور جماعۃ الدعوۃ جیسی دینی تنظیموں نے آگے بڑھ کر این جی اوز کو کارنر کیا اور یہ میدان خود سنبھال لیا، جس سے این جی اوز کو اپنا وہ ایجنڈا آگے بڑھانے میں دشواری ہو رہی ہے جو وہ رفاہی خدمات کی آڑ میں کرنا چاہ رہی تھیں۔ الرشید ٹرسٹ، الاختر ٹرسٹ اور جماعۃ الدعوۃ وغیرہ کی کردار کشی کر کے انہیں راستہ سے ہٹایا جا رہا ہے تا کہ این جی اوز کے لیے میدان ہموار کیا جا سکے۔ ورنہ ہزارہ اور آزاد کشمیر میں زلزلہ سے متاثرین کی خدمت اور بحالی کے لیے جماعۃ الدعوۃ اور دیگر دینی رفاہی تنظیمیں خود اقوام متحدہ کی ٹیموں کے ساتھ کام کر چکی ہیں، ان کی بے لوث خدمات کو عالمی سطح پر سراہا گیا ہے اور ان کا عالمی اداروں کی طرف سے اعتراف بھی کیا گیا ہے۔

مولانا فضل الرحمان قومی اسمبلی کی کشمیر کمیٹی کے چیئرمین ہیں، اس حوالہ سے انہوں نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ آخر کار کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق ہی حل ہوگا اور ان کے حق خود ارادیت سے دنیا کا کوئی باشعور شخص انکار نہیں کر سکتا۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتیں پابند ہیں کہ وہ کشمیری عوام کو ان کے حق خود ارادیت کی بنیاد پر اپنا مسئلہ خود حل کرنے کا موقع دیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس خطہ میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور اسے مکمل تسلط میں تبدیل کرنے کی خواہشمند قوتوں کو اس بہانے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کا موقع نہ دیا جائے، کیونکہ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو پھر کسی کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا۔

مولانا فضل الرحمان کا کہنا ہے کہ پاکستان پر دباؤ بڑھایا جا رہا ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اس کے گرد عالمی حصار تنگ کیا جا رہا ہے حالانکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر لڑی جانے والی یہ جنگ دراصل جنوبی ایشیا میں امریکی اثر ورسوخ کو بڑھانے اور اس اثر و رسوخ کو مکمل تسلط میں تبدیل کرنے کے لیے ہے۔ بھارت سمیت اس خطے کے تمام ممالک کو اس حقیقت حال کا سنجیدگی کے ساتھ ادراک کرنا ہوگا اور جنوبی ایشیا کو امریکی تسلط میں جانے سے روکنے کے لیے خطے کے سب ممالک کو مل جل کر مؤثر کردار ادا کرنا ہوگا۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور......۳ جنوری ۲۰۰۹ء)

موجودہ حالات اور جنرل حمید گل

دو روز قبل جنرل (ر) حمید گل صاحب نے فون پر مجھے کہا کہ ۸ دسمبر کو راولپنڈی میں کچھ حضرات کو ملک کی موجودہ صورتحال کے حوالہ سے جمع ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں آپ کی آمد بھی ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی محدود سطح کا مشاورتی اجلاس ہوگا لیکن میں جب ۳ بجے کے لگ بھگ راولپنڈی صدر کے فلیش مین ہوٹل کے مین ہال میں داخل ہوا تو وہاں ایک اچھے خاصے قومی سیمینار کا سماں تھا۔ مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ ریٹائرڈ فوجی افسران، سابق سفارتکار اور دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والے ممتاز حضرات راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی صورت میں کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ اسلام آباد کے مولانا عبدالخالق صاحب علماء کرام کا خیر مقدم کرنے اور انہیں مناسب مقامات پر بٹھانے میں مصروف تھے۔ مجھے انہوں نے ایک طرف کرسیوں کی پہلی رو میں علامہ احمد علی قصوری، علامہ علی غضنفر کراروی، آغا مرتضٰی پویا اور خاکسار راہنما جناب حمید الدین المشرقی کے ساتھ بٹھا دیا۔ سامنے کی رو میں دیگر حضرات کے ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ اور مولانا انوار الحق حقانی تشریف فرما تھے۔

تقریب کا آغاز جنرل حمید گل کے نام پر شروع کی جانے والی انٹرنیٹ ویب سائیٹ کے باقاعدہ افتتاح سے کیا گیا جس کے بارے میں ان کی صاحبزادی محترمہ عظمٰی گل نے بتایا کہ یہ ویب سائیٹ انہوں نے اپنے والد محترم کو ان کی سالگرہ پر تحفے کے طور پر پیش کرنے کے لیے بنائی ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں افغانستان، کشمیر، جہاد اور اسلامی نظام کے بارے میں جنرل حمید گل کے مضامین کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جنرل حمید گل مائیک پر آئے اور موجودہ علاقائی صورتحال پر شرکاء کو مختصر بریفنگ دی۔ انہوں نے بتایا کہ جو صورتحال اس وقت ملک کو درپیش ہے یہ اس وقت بھی ہمیں درپیش تھی جب ۱۹۸۷ء میں سوویت یونین نے افغانستان

سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی نہ صرف یہ کہ افغانستان میں فوجوں کی تعداد بڑھا دی تھی بلکہ پاکستان میں بھی بم دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کے پیچھے روس، افغانستان اور انڈیا کی خفیہ ایجنسیاں تھیں اور ان میں پاکستان کے ہزاروں شہری جاں بحق ہو گئے تھے۔ امریکہ بھی انہی لائنوں پر چل رہا ہے اور افغانستان سے ۱۸ ماہ کے بعد فوجوں کی واپسی شروع کرنے کے اعلان کے بعد اس نے فوجوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے اور ادھر پاکستان میں خودکش بم دھماکوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔

جنرل حمید گل نے کہا کہ امریکہ نے افغانستان سے بہر حال جانا ہے، اس سے یہاں کی علاقائی صورتحال میں جو تبدیلیاں آئیں گی ان پر غور کرنا اور ان کے حوالہ سے اپنی ذمہ داریوں کا تعین ہماری ذمہ داری ہے اور اسی مقصد کے لیے آپ حضرات کو زحمت دی گئی ہے۔ انہوں نے ملک کے اندر کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے خودکش بم دھماکوں اور ان میں بے گناہ شہریوں کی قیمتی جانوں کے ضیاع کو افسوسناک قرار دیا اور کہا کہ اس سلسلہ میں بیرونی عوامل بالخصوص بھارت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصل عوامل کو بے نقاب کرے۔ اسی طرح ان عناصر کو بھی اس بات پر غور کرنا چاہیے جو انتقام اور بدلے کے لیے فوجی مراکز اور مساجد پر حملے کر رہے ہیں کہ ان کی ایسی کارروائیوں سے پاکستان کمزور ہو رہا ہے، دشمن کو تقویت مل رہی ہے اور دینی حلقے بدنام ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے وزیر داخلہ علماء کرام سے فتویٰ جاری کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ علماء کرام کوئی فتویٰ قرآن وسنت کی روشنی میں ہی دے سکتے ہیں اور انہیں پھر پرویز مشرف کے غیر شرعی اقدامات پر بھی فتویٰ جاری کرنا پڑے گا اور دیگر غیر اسلامی پالیسیاں بھی فتوؤں کا عنوان بنیں گی۔

جنرل صاحب نے موجودہ صورتحال کی اصلاح کے لیے ہاؤس کے سامنے چند تجاویز پیش کیں جنہیں ہاؤس نے کانفرنس کی طرف سے متفقہ موقف کے طور پر منظور کر لیا۔

(۱) قبائلی علاقے میں جاری آپریشن اور عسکری گروپوں کی طرف سے جنگ میں دونوں طرف سے فوری طور پر سیز فائر ضروری ہے اور ہم دونوں طرف کے ذمہ دار حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ فوری طور پر سیز فائر کی یہ اپیل منظور کرتے ہوئے جنگ بند کر دیں۔

(۲) فریقین میں مذاکرات اور مصالحت کے لیے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام اور مختلف طبقات کے ممتاز حضرات پر مشتمل وفد تشکیل دیا جائے جو قبائلی علاقوں میں جا کر اس مصالحت کے لیے راہ ہموار کرے۔ اگر حکومت اور فریق ثانی اس تجویز کو منظور کر لیں تو ہم یہ وفد تشکیل دینے اور جانوں پر کھیل کر وہاں جانے کے لیے تیار ہیں۔

(۳) امریکہ کے ساتھ تعاون واشتراک پر نظر ثانی کی جائے اور اسے محدود اور مشروط کیا جائے اور تعاون کی شرط کے طور پر امریکہ سے مطالبہ کیا جائے کہ:

☆ ایٹمی قوت کے طور پر پاکستان کو بھارت کے برابر درجہ دیا جائے۔

☆ کشمیر کے معاملات میں بھارت کی مسلسل مداخلت کا نوٹس لیا جائے۔

(۴) بلوچستان میں عوام کے مشتعل جذبات کو کم کرنے کے لیے پرویز مشرف کے خلاف فوری طور پر ٹرائل شروع کیا جائے۔

(۵) جن خفیہ معاہدات کے نتیجے میں پاکستان کی حدود میں ڈرون حملے ہو رہے ہیں، بلیک واٹر کے اہلکار بلا روک ٹوک ملک میں مسلح طور پر پھر رہے ہیں اور دیگر اس طرح کی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان معاہدات کو منظر عام پر لایا جائے اور قوم کو بتایا جائے کہ یہ معاہدات کیا ہیں؟

جنرل حمید گل کا کہنا ہے کہ امریکہ جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہے جو ان کے خیال میں یہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی جوہری قوت کو ختم کر دیا جائے یا کم از کم مشترکہ نگرانی میں دے دیا جائے اور بھارت کی سرحد سے پاکستانی فوجوں کو مغربی سرحد پر منتقل کرا دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ قائداعظم نے پاکستان بننے کے بعد مغربی چھاؤنیوں کو خالی کرنے کا حکم دیا تھا اور ساری فوجیں مشرقی سرحد پر بھارت کے ساتھ لگا دی تھیں لیکن اب اس پالیسی کو تبدیل کرانے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے جس سے مشرقی سرحد پر پاکستان کی پوزیشن کمزور ہو گی اور بھارت کی بالادستی کی راہ ہموار ہو گی۔ اس صورتحال پر نظر رکھی جائے اور اسی طرح ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کے مطابق امریکہ کے ڈرون حملے بند کرائے جائیں اور قومی خودمختاری کے تحفظ کے لیے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔

جنرل صاحب کا کہنا ہے کہ افغانستان سے امریکہ کی واپسی کی صورت میں ہمارے مقتدر حلقوں کی طرف سے اس خوف کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ اس سے خطے پر طالبان کا تسلط قائم ہوگا اور پاکستان میں بھی طالبانائزیشن کو فروغ حاصل ہوگا۔ ہمارے پاس اس کا واضح حل موجود ہے کہ ہم طالبانائزیشن کو روکنے کے لیے پاکستان میں دستور کے مطابق نفاذ اسلام کی طرف پیشرفت کریں اور سیاسی و جمہوری طریقے سے نفاذ شریعت کر کے طالبان کے ہاتھ سے یہ ہتھیار چھین لیں۔ کیونکہ افغانستان کے اقتدار میں واپسی کے بعد طالبان کے پاس پاکستان کے معاملات میں دلچسپی اور مداخلت کا یہی بہانہ ہوگا جسے ہم اپنے دستور پر سنجیدہ عملدرآمد کے ذریعے ختم کر سکتے ہیں اور اب ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی آپشن باقی نہیں رہا۔ جنرل صاحب نے کہا کہ پاکستان میں نفاذ اسلام ہمارے دستور کا تقاضا ہے لیکن یہ نفاذ شریعت قرارداد مقاصد کے مطابق ہوگا، دستور کی اسلامی دفعات کے مطابق ہوگا اور جمہوری و سیاسی عمل کے ذریعے ہوگا، اور ہمارے حکمران طبقے اگر طالبانائزیشن کا راستہ روکنے میں سنجیدہ اور مخلص ہیں تو انہیں یہ کرنا ہی ہوگا۔

جنرل حمید گل نے ہاؤس سے اپنی ایک تجویز کی منظوری بھی لی کہ ہمارے مطالبات اور تجاویز پر اگر حکومت کوئی مثبت طرز عمل اختیار نہیں کرتی، بالخصوص امریکہ کے ساتھ تعاون پر نظر ثانی اور ڈرون حملے بند کرانے میں کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھاتی تو ہمیں قومی سطح پر ایک تحریک منظّم کرنا ہوگی جو غیر سیاسی بنیادوں پر ہوگی اور تمام طبقات مل کر امریکی مداخلت کا راستہ روکنے کے لیے سڑکوں پر آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ابھی تحریک کے وقت اور پروگرام کا اعلان نہیں کر رہے، صرف یہ بتا رہے ہیں کہ اگر حکومت نے کچھ نہ کیا تو ہم خود کریں گے اور اگر فی الواقع حکومت نے کچھ نہ کیا تو ہم سرکردہ حضرات اور راہنماؤں سے مشاورت کے ساتھ قومی تحریک کا پروگرام مرتب کریں گے، اس کے لیے مشترکہ فورم تشکیل دیں گے اور اس کے وقت اور طریق کار کا اعلان کریں گے۔

یہ مختصر سی روداد ہے جنرل حمید گل کے طلب کردہ مشترکہ اجتماع کی، اس کی دیگر تفصیلات و جزئیات کے حوالہ سے پھر کسی موقع پر گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، لاہور ...... ۱۰ دسمبر ۲۰۰۹ء)

پاک بھارت تعلقات: ایک جائزہ

(ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اسلامیات کے رکن ڈاکٹر یوگندر سکند کی طرف سے ارسال کردہ سوالنامہ کے جوابات)

سوال نمبر ۱: بھارت اور پاکستان دونوں اپنے قومی تشخص کی بنیاد ایک دوسرے کی مخالفت کو قرار دیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں ایسی صورتحال میں دونوں ملکوں کے مابین پُرامن تعلقات حقیقتاً ممکن ہیں؟

جواب: قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان کے قومی تشخص کی بنیاد یہ تھی کہ جنوبی ایشیا کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور اپنے دین کے حوالے سے الگ تشخص رکھتے ہیں، اس لیے جس خطے میں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی الگ ریاست قائم ہونی چاہیے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایسٹ تیمور میں مسیحی اکثریت وہاں الگ ریاست کا باعث بنی اور اب جنوبی سوڈان اسی مسیحی اکثریت کے حوالے سے الگ ملک بننے جا رہا ہے۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد ہماری رولنگ کلاس، جس کی تربیت نوآبادیاتی ماحول میں ہوئی تھی اور وہ وہی نفسیات ومزاج رکھتی تھی، دین کی بنیاد پر تشخص اور قومی بنیاد اسے ہضم ہونے والی نہیں تھی۔ پھر اس کے ساتھ ہی برصغیر کی تقسیم کے ایجنڈے کو مسئلہ کشمیر کھڑا کر کے الجھا دیا گیا، اس لیے باہمی دشمنی کی بنیاد پر قومی تشخص کی روایت آگے بڑھتی گئی۔ میرے نزدیک یہ مصنوعی بنیاد ہے۔ اگر ہم اپنی اصل بنیاد کی طرف واپس لوٹ جائیں اور بھارت بھی اس کا عملی احترام کرے تو اس دشمنی کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اگر سعودی عرب اور ایران کے ساتھ بھارت کے دوستانہ تعلقات ومعاملات ہو سکتے ہیں تو ایک اسلامی پاکستان کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتے؟

سوال نمبر ۲: بھارت اور پاکستان دونوں میں انتہاپسند عناصر موجود ہیں (پاکستان میں اسلامی اور بھارت میں ہندو) جو دونوں ممالک کے مابین پُراَمن اور بہتر تعلقات کے شدت سے مخالف ہیں۔ اس مشکل پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟ اسلامی زاویہ نگاہ سے آپ اس صورتحال کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں یہ بات شاید قرینِ قیاس نہیں ہے کہ پاکستان میں جن طبقات کو انتہاپسند اور شدت پسند سمجھا جاتا ہے، وہ بھارت کے ساتھ دشمنی کا اظہار اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کافر اکثریت کا ملک ہے۔ اگر ایسا ہو تو ان کے جذبات چین کے بارے میں اسی طرح کے ہونے چاہئیں۔ اس لیے پاکستان کے انتہا پسند طبقوں کی شدت پسندی کے اسباب کچھ اور تلاش کرنے چاہئیں۔ غالباً مسئلہ کشمیر کے حل میں مسلسل تاخیر اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں پاکستان سے علیحدگی میں بھارت کا کردار ان شدت پسندانہ جذبات کی اصل وجہ ہے اور اس مبینہ شدت پسندی کو کم کرنے کی کوئی بھی کوشش اس کے پسِ منظر کا لحاظ رکھے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سوال نمبر ۳: پاکستان کے انتہاپسند گروپ مثلاً لشکرِ طیبہ کا اصرار ہے کہ بھارت کے ساتھ پُراَمن تعلقات ممکن نہیں اور یہ کہ مسلمانوں کو ہر حال میں بھارت کے خلاف جہاد کرنا ہوگا تا آنکہ وہ ایک عظیم تر پاکستان میں ضم ہو جائے۔ اس موقف کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟ کیا اسلام میں اس کی اجازت ہے؟

جواب: یہ جذبات دونوں طرف یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ بھارت کے انتہا پسند ہندوؤں کا نعرہ اکھنڈ بھارت کا ہے اور پاکستان کے انتہا پسند مسلمان دہلی کے لال قلعے پر پاکستان کا پرچم لہرانے کا دعوٰی کرتے ہیں۔ یہ دونوں جذباتی باتیں ہیں۔ جب تک باہمی تنازعات کے حل کی کوئی صورت نہیں نکلتی یہ نعرے اسی طرح لگتے رہیں گے۔ اس کا راستہ تلاش کرنا دونوں طرف کے سنجیدہ راہنماؤں کی ذمہ داری ہے۔

سوال نمبر ٤: پاکستان کے انتہاپسند اسلامی گروپ مثلاً لشکرِ طیبہ کتبِ حدیث میں موجود ایک روایت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں غزوۃ الہند کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ اس غزوے میں شریک ہوں گے، وہ دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ آپ کی رائے میں اس حدیث کا کیا

درجہ ہے؟ کیا یہ صحیح اور متواتر ہے؟ کیا آپ کے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ لشکرِ طیبہ جیسے گروہ اس سے مراد موجودہ حالات میں انڈیا کے خلاف جہاد کرنا لیتے ہیں اور کیا اس حدیث کی یہ تعبیر درست ہے؟

جواب: غزوہ ہند کی روایات موجود ہیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی پیش گوئیاں عالمی صورتحال میں پوری ہو چکی ہیں اور باقی بھی اپنے وقت پر پوری ہوں گی۔ لیکن ان کا وقت متعین نہیں ہے اور ان کی کسی بھی موقع پر تطبیق کرنا ایسا کرنے والوں کے اپنے ذوق، استنباط اور استدلال کے درجہ کی باتیں ہیں۔ ماضی میں بھی اس خطے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی بہت سی جنگوں پر ان کا اطلاق کیا گیا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہوتا رہے گا۔ لیکن کیا قوموں اور ملکوں کی پالیسیوں اور تعلقات کی بنیاد ان پیش گوئیوں پر رکھی جا سکتی ہے؟ یہ بات محل نظر ہے۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ ان پیش گوئیوں میں کوئی وقت طے نہیں کیا گیا اس لیے قوموں اور ملکوں کی پالیسیوں میں ان کو بنیاد بنانا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ پیش گوئیاں پوری ہونا الگ بات ہے اور کسی پیش گوئی کو ازخود پورا کرنے کا عمل اس سے مختلف امر ہے۔ آج کے دور میں کسی مسلمان ملک کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات کی بنیاد معروضی حالات، دوطرفہ مفادات اور مسلّمہ بین الاقوامی عرف و تعامل ہی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

سوال نمبر ۵: آپ کی سیاسی جماعت، جمعیت علماء اسلام کا پاک بھارت تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے علانیہ موقف کیا ہے؟

جواب: میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کا ایک غیر متحرک رکن ہوں اور اس کی پالیسی سازی اور قیادت میں میرا ایک عرصہ سے کوئی کردار نہیں ہے۔ جب کہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان ہیں جو پاکستانی پارلیمنٹ کی قومی کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں۔ وہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ بھارت کے ساتھ پاکستان کے بہتر تعلقات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسئلہ کشمیر ہے، وہ اگر بین الاقوامی معاہدات و اعلانات اور کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل ہو جائے تو باقی تنازعات و معاملات میں مثبت پیشرفت ہو سکتی ہے۔

سوال نمبر ٦: آپ کے خیال میں مسلم اور ہندو مذہبی قائدین دونوں ممالک کے تعلقات کو بہتر بنانے میں اگر

کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں تو وہ کیا ہے؟ کیا اب تک فروغِ امن کی کوششوں کے حوالے سے ان قائدین کی غیر فعالیت یا خاموشی کے ان تعلقات پر کوئی منفی یا مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

جواب: مسلم اور ہندو مذہبی قائدین کے درمیان ملاقاتوں اور مکالمہ کی کوئی صورت نکل سکے تو اس سے فائدہ ہوگا، لیکن یہ مکالمہ باہمی مشترکات کے فروغ، شدت پسندی کو کنٹرول کرنے اور خطے کے امن اور ترقی کے حوالے سے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی راہنما اگر خلوص کے ساتھ مل بیٹھیں تو وہ زیادہ بہتر تجاویز دے سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۷: جمعیت علماء ہند نے حال ہی میں دارالعلوم دیوبند میں ایک بڑا کنونشن منعقد کیا ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ جموں اور کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ سمجھتے ہیں اور کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق یا خود مختاری کے خلاف ہیں (جب کہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کشمیر میں بھارتی افواج کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی مذمت بھی کی ہے)۔ ایک پاکستانی، ایک عالم اور ایک دیوبندی جماعت کے رکن کی حیثیت سے آپ اس موقف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کو قومی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ کسی بھی ملک کی کسی کمیونٹی کے لیے قومی مسائل میں قومی موقف سے انحراف مناسب نہیں ہوتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے پاکستان میں رہنے والی ہندو اقلیت کشمیر سمیت تمام قومی مسائل میں قومی موقف کی تائید کرتی ہے اور کم و بیش ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

سوال نمبر۸ : آپ کے خیال میں مسئلہ کشمیر کے حل کا بہترین، معقول ترین اور عملی حل کیا ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات کیا کہتی ہیں؟

جواب: مسئلہ کشمیر کے حل کی دو ہی اصولی بنیادیں ہیں: مسلّمہ بین الاقوامی معاہدات اور کشمیری عوام کی آزادانہ مرضی۔ اس سے ہٹ کر کوئی حل شاید ہی کامیاب ہو سکے۔ اگر اقوام متحدہ ایسٹ تیمور اور جنوبی سوڈان میں استصواب رائے کرا سکتی ہے تو کشمیر میں استصوابِ رائے کروانے میں اسے ٹال مٹول سے کام نہیں لینا چاہیے اور میرے خیال میں یہی اسی مسئلے کا صحیح حل ہے۔

سوال نمبر ۹: پاکستان کے انتہاپسند اسلامی گروہ بھارت اور ہندوؤں کی شدید مخالفت پر مبنی آئیڈیالوجی کا پرچار کرتے اور اسلام کی تعبیر بھی اس کے مطابق کرتے ہیں۔ (اسی طرح ہندو انتہا پسند گروپ بھی بھارت میں پاکستان اور اسلام کی شدید مخالفت پر مبنی آئیڈیالوجی کا پرچار کرتے ہیں۔) آپ کی رائے میں اس انتہاپسندانہ اسلامی موقف کے منفی اثرات ہندوؤں کو دعوتِ اسلام دینے کی ذمہ داری پر کیا پڑتے ہیں جن میں بھارت کے ہندو بھی شامل ہیں اور پاکستان کی ہندو اقلیت بھی؟

جواب: میرے خیال میں دونوں طرف صورتحال ایک جیسی ہے۔ مسلمانوں کے ایک بڑے حصے میں بھارت اور ہندوؤں کے خلاف شدید مخالفت پائی جاتی ہے اور ہندوؤں کے ایک بڑے حلقے میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اسی درجہ کی شدید مخالفت کا رویہ بھی موجود و متحرک ہے۔ اسی طرح دعوت کے میدان میں ہندوؤں کو مسلمان کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے اور ہندوستان کے بہت سے مسلمانوں کو ہندو مذہب سے منحرف قرار دے کر واپس ہندو مذہب میں شامل کرنے کی تحریک بھی کام کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں دونوں طرف کے اعتدال پسند راہنماؤں کو کردار ادا کرنا چاہیے جس کا دائرہ باہمی گفتگو اور مشترکہ جذبہ کے ساتھ ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ منافرت، دشمنی اور ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کا ماحول دونوں طرف سے دعوت کے عمل میں رکاوٹ ہے۔ اس کا دونوں طرف کے سنجیدہ راہنماؤں کو جائزہ لینا چاہیے۔

سوال نمبر ۱۰: بھارت اور ہندو مخالف جذبات کے، جنہیں دوسرے عوامل کے علاوہ نام نہاد اسلامی عناصر بھی بھڑکاتے ہیں، پاکستان کی ترقی پر مثبت یا منفی اثرات کیا مرتب ہوئے ہیں؟ کیا اس کو فرقہ وارانہ، طبقاتی اور علاقائی تقسیم کے تناظر میں پاکستانی قوم میں اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے، جیسا کہ اس رویے کے حامیوں نے کوشش کی ہے؟ کیا یہ پاکستانی قوم یا مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا ایک فی الواقع اسلامی منہج ہے؟

جواب: میرے خیال میں پاکستان اور بھارت کے درمیان قومی سطح پر دشمنی کے جذبات کا ماحول برقرار رکھنا عالمی استعمار کی طے شدہ پالیسی اور ایجنڈے کا حصہ ہے جو دونوں ملکوں کی ترقی

میں رکاوٹ ہے اور شاید عالمی ایجنڈے کا بنیادی ہدف بھی یہی ہے۔ سوال نمبر ا کے جواب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ماحول مصنوعی ہے۔ پاکستان میں قوم کی وحدت کی اصل بنیاد بھارت دشمنی نہیں، بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ محبت وعقیدت ہماری قومی وحدت کی اصل اساس ہے جس کا اظہار ابھی حال میں ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کے حوالے سے قوم کے کم وبیش تمام طبقات نے متحد ہو کر ایک بار پھر کر دیا ہے۔

سوال نمبر ۱۱: پاکستان کے اسلامی گروپوں کی طرف سے بھارت اور ہندو مخالف جذبات کو ہوا دینے کی پالیسی کے مضمرات بھارت کی مشکلات کا شکار مسلم اقلیت کے حوالے سے کیا ہیں؟ کیا پاکستانی گروہوں نے اس بات پر کبھی غور کیا ہے کہ ان کے بھارت مخالف رویے کے یقینی طور پر منفی اثرات بھارتی مسلمانوں کی زندگیوں، تحفظ اور بھلائی پر پڑیں گے اور اس سے بھارت کے انتہا پسند ہندو گروپوں کو تقویت ملے گی؟

جواب: یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں اور بھارت کے خلاف شدت پسندانہ جذبات کے اظہار کے اثرات بھارت کی مسلمان اقلیت پر پڑتے ہیں، لیکن یہ بات سوچنے کی ہے کہ بھارت میں اسلام اور پاکستان کے خلاف شدت پسندانہ جذبات کے اظہار کے اثرات پاکستان میں بسنے والی ہندو اقلیت پر کیوں نہیں پڑتے؟ اگر اس پہلو سے تقابل کیا جائے تو دونوں طرف کی صورتحال ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ میرے خیال میں بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کا بھارتی قومیت کے ساتھ مضبوط تعلق اور بھارت کے امن و ترقی کے لیے ان کا بھرپور کردار اس قدر مستحکم ہے کہ اس طرح کے اثرات سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ یہ بات اصولی طور پر درست ہے کہ کسی بھی معاملے میں شدت پسندانہ رویہ بہر حال ٹھیک نہیں ہوتا۔ اعتدال اور توازن کا راستہ ہی ہر دور میں بہتر اور مفید رہا ہے اور دونوں طرف سے اس کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ...... اپریل ۲۰۱۱ء)

جنرل باجوہ اور بلوچستان

آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ نے گزشتہ روز بلوچستان کے مختلف تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے پونے دوسو کے لگ بھگ طلبہ کے ایک گروپ سے بات چیت کرتے ہوئے انہیں تلقین کی ہے کہ وہ مختلف بیرونی ایجنسیوں اور اداروں کی طرف سے پاکستان کے بارے میں کیے جانے والے منفی پراپیگنڈا سے متاثر نہ ہوں اور وطن عزیز کی سلامتی واستحکام اور فلاح وترقی کے لیے تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا تعلق بلوچ رجمنٹ سے ہے اور وہ بلوچستان کے شہریوں اور نوجوانوں سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بیرون ملک بہت سے ادارے اور ایجنسیاں بلوچستان کے حوالہ سے مخالفانہ پروپیگنڈا کر کے وطن عزیز پاکستان کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں جس کا جواب ہمیں متحد اور منظّم ہو کر دینا ہوگا۔

محترم باجوہ صاحب کے یہ ارشادات حرف بہ حرف درست ہونے کے ساتھ ساتھ برموقع بھی ہیں کہ بلوچستان کے حوالہ سے پاکستان کے خلاف بیرونی سرگرمیوں میں تیزی آرہی ہے اور سوئٹزرلینڈ میں اس سلسلہ میں آویزاں کیے جانے والے بینروں کے علاوہ بھارتی دانشوروں کا ایک حلقہ اپنی حکومت پر زور دے رہا ہے کہ وہ بلوچستان میں نام نہاد آزادی کی تحریک کو سپورٹ کرے جیسا کہ وزیراعظم نریندر مودی نے چند دن قبل ایک تقریر میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ گزشتہ روز یوٹیوب پر ایک ڈاکومنٹری دیکھنے کا موقع ملا جس میں کسی بھارتی تجزیہ نگار نے سی پیک منصوبے کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اس سے مبینہ طور پر بھارت کو پہنچنے والے نقصانات کا ذکر کیا ہے اور اس کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ بھارت بلوچستان کا کارڈ استعمال کرے اور وہاں آزادی کے نام سے اٹھائی جانے والی آواز کو مضبوط کرے۔ بھارتی حکومت کو دنیا بھر میں مقبوضہ کشمیر کے حوالے سے جن

سوالات اور الزامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے جواب میں بھی وہ بلوچستان کا حوالہ دیتے ہیں، حالانکہ بلوچستان دیگر علاقوں کی طرح ’’قانونِ آزادئ ہند ۱۹۴۷ء‘‘ کے تحت پاکستان میں شامل ہوا تھا اور کشمیر نے بھی اسی قانون کے تحت پاکستان میں شامل ہونا تھا لیکن بھارت نے کشمیری عوام کی خواہشات کے علی الرغم اس پر بزورِ طاقت قبضہ جما لیا جبکہ اس قبضہ کو طوالت دینے میں عالمی قوتوں کے مفادات آج تک کارفرما ہیں۔

سی پیک منصوبے سے کس کس کو فائدہ ہوگا اور کون کون نقصان میں رہے گا یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس سے خطہ میں طاقت و معیشت کا توازن کن تبدیلیوں سے دوچار ہوگا یہ بھی ایک مستقل گفتگو کا متقاضی ہے۔ لیکن سرِ دست اتنی بات واضح ہے کہ یہ عظیم معاشی منصوبہ چونکہ پاکستان سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے پاکستان کی بے پناہ ترقی کے واضح امکانات دکھائی دے رہے ہیں اس لیے یہ پاکستان کے روایتی حریف بھارت کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی طاقتوں کو کھٹک رہا ہے۔ اور یہ ظاہر و پوشیدہ قوتیں اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے خدانخواستہ روکنے کے لیے اپنے اپنے دائروں میں سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں جن کا منظر دن بدن واضح ہوتا جا رہا ہے۔

سی پیک میں مرکزی کردار بلوچستان اور اس کی بندرگاہ گوادر کا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ منفی سرگرمیوں کا سب سے بڑا ہدف بھی وہی ہوگا۔ بلوچستان میں آزادی کی محدود اور مصنوعی تحریک ان سرگرمیوں کا ایک اہم دائرہ ہے اور بلوچستان کو قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی اس قسم کی منفی سرگرمیوں کا نشانہ بنایا جا تا رہا ہے:

☆ ایک دور میں بلوچ اور پختون قوموں کے درمیان غلط فہمیاں بڑھانے اور انہیں منفی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی مہم چلتی رہی،

☆ پھر بلوچوں کو قومیت کے حوالہ سے آزادی اور خودمختاری کا خواب دکھلا کر اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی،

☆ ایک موقع پر کوئٹہ میں پنجابی اور غیر پنجابی کا سوال بھی ابھارا گیا،

☆ جبکہ ہزارہ قوم کے معاملہ میں باہمی قتل و قتال کو بھی اس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن ان میں سے کوئی کارڈ بھی کامیابی کے ساتھ نہیں کھیلا جا سکا اور اس قسم کی ہر مہم میں اس کے

منصوبہ کاروں کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بلوچستان کے عوام پاکستان سے محبت رکھتے ہیں اور پاکستانی کہلانا ہی پسند کرتے ہیں۔ لیکن ایک وجہ اور بھی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اور اس کے بعد کم وبیش ہر الیکشن کے موقع پر جمعیۃ علماء اسلام بلوچستان کی ایک اہم سیاسی اور عوامی قوت کے طور پر سامنے آتی رہی ہے جو حوصلہ مند اور محبّ وطن علماء کی قیادت سے بہرہ ور ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کو ایک مضبوط و مستحکم اسلامی ریاست کے طور پر ترقی دینے کی خواہش مند ہے اور بلوچستان کے تمام علاقوں اور قومیتوں میں یکساں اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ اگر کوئی منصف مزاج تجزیہ نگار خالصتاً سیاسی اور سماجی نقطہ نظر سے قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک کی صورتحال کا جائزہ لے تو اس کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا کہ بلوچستان میں خدانخواستہ علیحدگی یا تقسیم کی کسی بھی تحریک کے مقابلہ میں سب سے مضبوط رکاوٹ یہی دینی و سیاسی قوت ثابت ہوئی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا۔

اس لیے آرمی چیف محترم کے ارشادات و جذبات کی تائید کرتے ہوئے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ بلوچستان کے حوالہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف بین الاقوامی طور پر منظّم کی جانے والی سازشوں سے نمٹنے کے لیے جہاں ان اقدامات کی ضرورت ہے جو فوج سمیت ریاستی ادارے اس وقت کر رہے ہیں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف قومیتوں کے حامل بلوچستان کے شہریوں کے درمیان عقیدہ و دین کے رشتہ کو اور زیادہ مضبوط کیا جائے اور دینی وحدت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ کیونکہ یہی وہ وحدت اور رشتہ ہے جو کسی بھی منفی تحریک کا راستہ روکنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر رکاوٹ بن سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی محترم جنرل قمر جاوید باجوہ کے ساتھ ''گرائیں'' ہونے کے ناتے سے ایک اور گزارش بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ان کا تعلق گکھڑ کی باجوہ فیملی سے ہے اور میرا ''جم پل'' بھی وہی ہے بلکہ ان کے خاندان کے بزرگ محترم میجر غلام حسین باجوہ مرحوم کے ساتھ میرے نیازمندانہ مراسم رہے ہیں اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں گکھڑ ریلوے اسٹیشن پر بھارتی فضائیہ کی بمباری سے شہید ہونے والے نوجوان صفدر باجوہ شہیدؒ میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ وہ گزارش یہ ہے کہ بیرون ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف بہت سے دیگر مورچے بھی مصروف عمل ہیں جنہیں

مختلف بیرونی ایجنسیاں اورادارے سپورٹ کررہے ہیں۔ان میں سےایک مورچہ قادیانیوں کا ہے جواسلامی جمہوریہ پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے متفقہ دستوری فیصلے کومسترد کرتے ہوئے دستور و قانون پرعملدرآمد کا بائیکاٹ کرکے بلکہ اسے چیلنج کرکےاس کے خلاف بین الاقوامی فورموں پر مورچہ لگائے ہوئے ہیں جس سے ریاست کی ''دستوری رٹ'' سوالیہ نشان بن کررہ گئی ہے جبکہ ریاست کی رٹ قائم کرنااوردستور کی بالادستی کا احترام کروانا ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہے۔اس مسئلہ پر ہم نے مسلح افواج سمیت تمام ریاستی اداروں کی ہمیشہ حمایت کی ہے حتیٰ کہ ''اسلامی شریعت'' کے نام پر ریاستی رٹ کوچیلنج کرنے والوں کوبھی ہماری دوٹوک مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ اسلامی شریعت کے نام سے ریاستی رٹ کوچیلنج کرنے والوں کے خلاف اگر کارروائی ہو سکتی ہے، جو کہ حکومت کا دستوری وقانونی حق ہے،تو عقیدۂ ختم نبوت سے انکار کے نام پردستور کی بالادستی کوچیلنج کرنے اوراس کے لیے بین الاقوامی فورموں پر پاکستان کے خلاف مسلسل ''مورچہ بندی'' کاعمل بھی فوج سمیت تمام ریاستی اداروں کی توجہ کا مستحق ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سالمیت واستحکام اورفلاح وترقی کے لیے آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ کے جذبات واحساسات اوراقدامات کے ساتھ مکمل یکجہتی اورہم آہنگی کا اظہار کرتے ہوئے ہم ان کی کامیابی کے لیے بارگاہِ ایزدی میں خلوص دل کے ساتھ دعاگو ہیں،آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۳۰ستمبر۲۰۱۷ء)

سعودی عرب اور پاکستان سے امت مسلمہ کی توقعات

سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ محمد بن سلیمان آل سعود پاکستان اور بھارت کا دورہ کر کے واپس تشریف لے جا چکے ہیں اور دونوں ملکوں کے ساتھ سعودی عرب کے بہت سے معاشی معاہدات کے بعد اب اس خطہ میں نئی اقتصادی منصوبہ بندی کا آغاز ہوگیا ہے۔ پاکستان کو اپنے قیام کے وقت سے ہی سعودی عرب کی پرخلوص دوستی، معاونت بلکہ بہت سے عالمی معاملات میں شراکت حاصل رہی ہے اور حرمین شریفین کے ساتھ محبت وعقیدت کے باعث سعودی عرب کو ہمیشہ پاکستان کی حکومت اور عوام کے مرکز محبت کا مقام حاصل رہا ہے جو آئندہ بھی اسی طرح جاری رہے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ......

ملتِ اسلامیہ اور عالم اسلام کی اجتماعی مشکلات ومسائل اور دنیا کے مختلف حصوں میں ظلم وجبر کا شکار مسلمانوں کی دادرسی کی طرف توجہ کی درخواست کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان مشکلات ومسائل اور مظلومیت وبے بسی کا دائرہ دن بدن وسیع ہورہا ہے اور دادرسی کے امکانات کم ہوتے جارہے ہیں۔ عالمی نظام کا استعماری شکنجہ فلسطین، کشمیر، اراکان اور سنکیانگ سمیت کسی مقام پر بھی مسلمانوں کی مظلومیت، بے کسی اور قتل عام کی روک تھام میں کوئی کردار ادا کرنے کی بجائے مسلسل چشم پوشی اور ظالم قوتوں کو تحفظ فراہم کرنے میں مصروف ہے اور صورتحال دن بدن سنگین تر ہوتی جارہی ہے۔ جبکہ دنیا بھر کی مسلم حکومتیں بالخصوص اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) بھی زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہیں کر پارہیں، فیا اسفاہ ویا ویلاہ۔ ان حالات میں مسلمانوں کی نظریں ترکی، سعودی عرب،

پاکستان اور ملائیشیا کے حکمرانوں کی طرف بار بار اٹھتی ہیں اور ادھر سے ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفاد کے حوالے سے آنے والی کوئی بھی امید افزا خبران کے کرب واضطراب میں کمی کا باعث بنتی ہے۔

اس دوران کشمیری عوام کی مظلومیت کی تازہ لہر نے خطہ میں ایک بار پھر کشیدگی کا اضافہ کر دیا ہے اور بھارت کی جنونی قیادت اس اشتعال کو مسلسل بڑھانے میں مگن ہے۔ بھارتی حکومت کی دھمکیوں کے جواب میں وزیراعظم پاکستان نے جو جرأتمندانہ موقف اختیار کیا ہے وہ قوم کے دلوں کی آواز ہے مگر ہمارے خیال میں معاملہ صرف اتنا نہیں ہے۔ اصل ضرورت مسلم حکمرانوں کے خواب غفلت سے بیدار ہونے کی ہے اور ملت اسلامیہ کی اجتماعی صورتحال کا جائزہ لے کر ٹھوس حکمت عملی اختیار کرنے کی ہے۔ کیونکہ ہر جگہ ظلم و جبر اور مظلومیت و بے کسی کی اصل وجہ اسلام اور ان لوگوں کا مسلمان ہونا ہے، ان خطوں کے لوگ خدانخواستہ اپنے مسلمان ہونے پر نظر ثانی کا اظہار کر دیں تو ان کی یہ مظلومیت اور مجبوری کسی جگہ بھی باقی نہیں رہے گی۔ عالمی استعمار اور ظلم و جبر کا بازار گرم کرنے والی قوتیں تو یہی چاہتی ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا مسلم حکمران بھی نعوذ باللہ اسی کا انتظار کر رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہرحال پاکستان، سعودی عرب، ترکی اور ملائیشیا جیسے بااثر مسلم ممالک کے حکمرانوں کو ہی دینا ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۲۳ فروری ۲۰۱۹ء)

اقلیتوں کے حقوق اور اسلامی روایات

میں نے کسی مضمون میں سعودی دانشور ڈاکٹر محمد المسعری کے حوالہ سے فتح بیت المقدس کا واقعہ لکھا تھا کہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیت المقدس کی چابیاں وصول ہونے کے بعد یہودیوں کے اس عبادت خانے کے بارے میں پوچھا جسے عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد مسمار کر دیا تھا۔ لوگوں نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں اب کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی دستار مبارک اتاری اور کوڑا کرکٹ اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ ساتھ لگ پڑے اور چند لمحوں میں وہ جگہ صاف ہوگئی جہاں حضرت عمرؓ نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔

لیکن دو روز قبل ایک دوست کے پاس بھارت کے حضرت مولانا نجیب اللہ ندوی کی کتاب ''اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات'' نظر سے گزری جس میں انہوں نے حافظ ابن کثیر کی ''البدایۃ والنہایۃ'' کے حوالہ سے یہ واقعہ ذرا مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اس جگہ مسجد تعمیر نہیں کی بلکہ اس کی صفائی کر کے اسے چھوڑ دیا اور صفائی کے بعد جب نماز کا وقت ہوا تو نماز کی ادائیگی کے لیے اس جگہ سے باہر آ گئے اور اس کی حدود سے باہر الگ جگہ نماز ادا فرمائی۔ اس پر بعض ساتھیوں نے دریافت کیا کہ امیر المومنین! وہ بھی تو عبادت گاہ تھی، اس جگہ نماز ادا کرنے میں کیا حرج تھا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اگر اس جگہ نماز ادا کر لیتا تو بعد میں تم نے وہاں مستقل قبضہ کر لینا تھا کہ یہاں ہمارے امیر المومنینؓ نے نماز ادا کی ہے اس لیے ہم اس جگہ پر مسجد بنائیں گے۔ جبکہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں پر اس طرح قبضہ کیا جائے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے احترام کا کس اہمیت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے اور خلفاء اسلام نے اس کی کس طرح پاسداری کی ہے۔ ویسے تو اب غیر مسلموں کی بہت سی عبادت گاہیں مساجد کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ برطانیہ میں سینکڑوں مساجد ایسی ہیں جو پہلے عیسائیوں کے چرچ تھے اور اب وہاں مساجد ہیں۔ لیکن یہ تبدیلی قبضہ کی صورت میں نہیں آئی بلکہ مسیحی مذہبی اداروں نے خود یہ چرچ بیچے ہیں اور مسلمانوں نے انہیں خرید کر وہاں مساجد بنائی ہیں۔ حتیٰ کہ گزشتہ دنوں گلاسگو حاضری کے موقع پر میں نے ایک ایسی مسجد و مدرسہ بھی دیکھا اور وہاں بیان کا موقع بھی ملا جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ یہ یہودیوں کا سینی گاگ (عبادت خانہ) تھا۔ مجھے اس پر تعجب ہوا کیونکہ یہودی عام طور پر اپنی عبادت گاہ کو فروخت نہیں کیا کرتے۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ چند سال قبل تک یہ عمارت یہودیوں کی عبادت گاہ تھی جو انہوں نے فروخت کر دی اور مسلمانوں نے اسے خرید کر مسجد بنا لیا اور اس میں قرآن کریم کی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم ہے۔

ہمارے ہاں پاکستان کے مختلف حصوں میں بعض مساجد ایسی ہیں جو ہندوؤں اور سکھوں کی ان عبادت گاہوں میں بنائی گئی ہیں جو وہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جبکہ بھارت میں جن علاقوں سے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے وہاں کی ہزاروں مساجد ہندوؤں کے مندروں اور سکھوں کے گوردواروں میں تبدیل ہو چکی ہیں، ان میں سے ایک مسجد میں نے بھی دیکھی ہے۔ وہ اس طرح کہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر بھارت جانے کا اتفاق ہوا تو میں لدھیانہ بھی گیا جہاں مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے فرزند مولانا محمد احمد لدھیانویؒ کا چند روز تک مہمان رہا۔ اس دوران میں نے ایک مسجد دیکھی جس کی باہر کی ہئیت تو مسجد کی تھی اور مینار بھی بدستور قائم تھے لیکن اس کے اندر مندر تھا اور مسجد کے مرکزی ہال میں پوجا کے لیے مورتیاں نصب کی گئی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر طبیعت پر اس قدر اثر ہوا کہ اس کے بعد مزید وہاں ٹھہرنے کو جی نہ چاہا۔

خلفاء اسلام نے اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں کے حقوق اور مفادات کی حفاظت کی ہے اور ان کا کردار اس سلسلہ میں ایک ایسا نمونہ ہے جس کی دوسرے کسی مذہب میں مثال نہیں پیش کی جا

سکتی۔ مولانا مجیب اللہ ندوی نے اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ اور سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خلافت کا منصب قبول کیا اور ذمہ داریاں سنبھال کر گزشتہ حکومتوں کے مظالم کی تلافی کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے عدل وانصاف کے واقعات سن کر سمرقند کے غیر مسلم باشندوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے شکایت کی کہ اب سے پندرہ سال قبل جب مسلم کمانڈر قتیبہ بن مسلم نے سمرقند فتح کیا تو اس شہر پر حملے سے قبل اسلامی احکام کے مطابق نہ تو انہیں اسلام کی دعوت دی اور نہ ہی دوسری شرائط پیش کیں بلکہ اچانک حملہ کر کے شہر فتح کر لیا۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے جس کی تلافی ہونی چاہیے۔

سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے خلیفہ بننے سے پندرہ برس قبل ہوئی تھی لیکن انہوں نے اسے ماضی کے حوالہ سے ٹالنے کی بجائے غیر مسلموں کی شکایت کی تلافی ضروری سمجھی اور جمیع بن حاضر الباجی کو اس شکایت کی انکوائری اور تصفیہ کے لیے خصوصی قاضی مقرر کر دیا۔ انہوں نے تحقیقات کے بعد شکایت کو درست پایا تو اس پر فیصلہ صادر کر دیا کہ شہر پر قبضہ چونکہ اسلامی احکام کے مطابق نہیں ہوا اس لیے مسلم افواج سمرقند شہر خالی کر دیں۔ چنانچہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہو گیا اور اسلامی فوج اس کا احترام کرتے ہوئے پندرہ سال قبل فتح کیا ہوا شہر خالی کر کے باہر کھلے میدان میں نکل آئی۔ اس منظر کو دیکھ کر شہر کے باشندے حیران و ششدر رہ گئے اور اصول و احکام کی اس پاسداری کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ان کی دعوت پر اسلامی فوج نے پھر شہر میں داخل ہو کر سمرقند کا نظم ونسق سنبھال لیا۔

مولانا ندوی کے قلم سے اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ کر لیجیے کہ شام اور حجاز کی سرحد پر عیسائیوں کا ایک طاقتور قبیلہ تھا جس نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں باقاعدہ تحریری معاہدہ کر کے چند شرائط کے تحت اسلامی قلمرو میں شامل ہونا منظور کیا اور حضرت عمرؓ نے یہ شرائط منظور کر لیں۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے دور میں کسی سیاسی مصلحت کی خاطر اس معاہدہ کو منسوخ کرنا چاہا۔ ہارون الرشید کا خیال تھا کہ معاہدہ منسوخ کر کے بنو تغلب پر فوج کشی کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مشورہ کے لیے حضرت امام محمدؒ کو بلایا اور خلوت میں ان کے سامنے اپنا ارادہ

بیان کر کے ان سے مشاورت چاہی۔ امام محمدؒ نے فرمایا کہ چونکہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ نے بنوتغلب کو امان دے رکھی ہے اس لیے ان کے خلاف فوج کشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے اس شرط پر بنوتغلب کو امان دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بپتسمہ نہیں دیں گے یعنی انہیں عیسائی بنانے کی رسم ادا نہیں کریں گے جبکہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔ امام محمدؒ نے جواب دیا کہ بچوں کو بپتسمہ دینے کے باوجود حضرت عمرؓ نے اس معاہدہ کو برقرار رکھا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے کہا کہ حضرت عمرؓ کو بنوتغلب کے خلاف فوج کشی کا مناسب موقع نہیں ملا تھا اس لیے وہ ایسا نہ کر سکے۔ امام محمدؒ نے جواب میں فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے پاس موقع تھا لیکن انہوں نے معاہدہ کی پاسداری کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے بنوتغلب کو غیر مشروط امان دی تھی اس لیے اس معاہدہ کو توڑنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ امام محمدؒ کے اس جواب پر ہارون الرشید سخت ناراض ہوا اور انہیں اپنے سامنے سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ لیکن اس ناراضگی کے باوجود خلیفہ ہارون الرشید کو بنوتغلب کے ساتھ حضرت عمرؓ کے معاہدہ کو توڑنے اور ان کے خلاف فوج کشی کا حوصلہ نہیں ہوا۔

میں پاکستان میں بسنے والی غیر مسلم اقلیتوں سے عرض کیا کرتا ہوں کہ انہیں اسلامی قوانین اور دینی قیادت سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں بلکہ آنجہانی جسٹس اے آر کارنیلیس اور آنجہانی مسیحی راہنما جوشوا فضل دین کی طرح پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی حمایت کرنی چاہیے۔ کیونکہ شرعی نظام کے نفاذ اور دینی قیادت کے آنے سے جہاں ملک میں عدل وانصاف کی فراہمی عام ہو جائے گی وہاں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق ومفادات کا بھی تحفظ ہوگا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور......۱۵ نومبر ۲۰۰۲ء)

بھارت کی مسلم اقلیت

﴿حالات و مسائل اور جدوجہد﴾

جامعہ ملیہ دہلی کے اسلامی تشخص پر آخری ضرب

ان دنوں بھارت کے مسلم جرائد میں جامعہ ملیہ کے بارے میں دہلی ہائیکورٹ کے ایک فیصلے پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے جس کے تحت جامعہ ملیہ میں داخلے کے لیے مخصوص کوٹے ختم کر کے تمام طلبہ کے داخلے میرٹ پر کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اور ماہنامہ افکارِ ملّی دہلی کے جون ۱۹۹۷ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق اس فیصلہ کے بعد مسلم طلبہ کو حاصل وہ سہولت بھی ختم ہوگئی ہے جو جامعہ ملیہ میں داخلہ کے لیے کوٹہ سسٹم کے تحت انہیں ایک حد تک حاصل تھی۔

جامعہ ملیہ کا قیام ۱۹۲۰ء میں عمل میں لایا گیا تھا اور اس کے قیام میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، حکیم اجمل خانؒ، اور ان کے رفقاء پیش پیش تھے۔ جو علی گڑھ یونیورسٹی کے سرکار پرستانہ رجحانات سے تنگ آ کر ایک ایسے اسلامی تعلیمی ادارے کے قیام کے خواہاں تھے جہاں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ ضروری دینی تعلیم بھی ہو، اور اس سے بڑھ کر وہ فرنگی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کے قومی رجحانات کی آبیاری کرے۔ چنانچہ اسی ہدف کو سامنے رکھ کر اس عظیم تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی گئی اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو تحریکِ آزادی کے عظیم قائد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے مبارک ہاتھوں سے اس کا افتتاح ہوا۔

جامعہ ملیہ مسلمانوں کا ایک ممتاز تعلیمی ادارہ تھا جو اپنی دو خصوصیات کے باعث تاریخ میں مستقل مقام رکھتا ہے:

(۱) ایک یہ کہ اس نے علی گڑھ یونیورسٹی کے سرکار پرستانہ رجحان کو مسترد کر کے مسلمانوں کی نئی پود کو آزادی کے لیے تیار کیا اور فرنگی استبداد کے خاتمہ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

(۲) اور دوسری یہ کہ دیوبند کے خالص دینی تعلیمی نظام اور علی گڑھ کے انگریزی تعلیمی نظام کے درمیان ایک ایسے متوازن تعلیمی نظام کا تصور جامعہ ملیہ کی صورت میں سامنے آیا جس میں دینی اور عصری دونوں تقاضوں کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

آزادی کے بعد ۱۹۸۸ء تک جامعہ ملیہ کو ایک مسلم ادارہ کی حیثیت حاصل رہی۔ مگر ۱۹۸۸ء میں جامعہ ایکٹ کے ذریعے اس کی جداگانہ مذہبی حیثیت ختم کر کے اسے سنٹرل یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا جس میں ہر مذہب کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں، اور یہ تاریخی ادارہ مسلمانوں کے مخصوص تعلیمی ادارے کی پہچان سے محروم ہو گیا۔ البتہ مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے کوٹہ سسٹم کے تحت بعض ایسی مراعات دے دی گئیں جن سے مسلمان طلبہ استفادہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب حال ہی میں دہلی ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں یہ کوٹہ سسٹم بھی ختم کر دیا ہے جس سے مسلمانوں کے حوالے سے جامعہ ملیہ کی رہی سہی شناخت بھی تاریخ کی نذر ہو گئی ہے۔

بھارت کے دینی جرائد اور مسلم اخبارات اس پر احتجاج کرتے ہوئے مسلمان تنظیموں کو اس سلسلہ میں مؤثر اور مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں، خدا کرے کہ ان کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہو۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... جولائی ۱۹۹۷ء)

پروفیسر ڈاکٹر خلیق احمد نظامی کا انتقال

گزشتہ ماہ بھارت کے ممتاز دانشور اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر خلیق احمد نظامی انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ کا نام پہلی بار ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' کے حوالے سے سنا تھا۔ اس کے بعد ان کی تصانیف ''تاریخِ مشائخِ چشت'' اور ''سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات'' دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر آکسفورڈ میں ان سے کئی بار ملاقات بھی ہوئی جہاں ان کے فرزند ڈاکٹر فرحان احمد نظامی ''آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے ایک بڑے تعلیمی منصوبے کے سربراہ ہیں۔

وہ خالص تعلیمی اور تاریخی ذوق کے آدمی تھے، جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی سمیت کئی تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے، کچھ عرصہ شام میں بھارت کے سفیر بھی رہے، شریف النفس اور وضع دار قسم کے بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ---فروری ۱۹۹۸ء)

بھارتی مسلمان مسلسل آزمائش میں

روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ جنوری ۱۹۹۸ء کی ایک خبر کے مطابق جمعیۃ علماء ہند کے سربراہ مولانا اسعد مدنی نے اعلان کیا ہے کہ مسلم پرسنل لاء میں کسی بھی قیمت پر مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی، کیونکہ مسلمانوں کے پرسنل قانون میں مداخلت دراصل مذہبِ اسلام میں مداخلت ہے۔ خبر کے مطابق انہوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر ایل کے ایڈوانی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ

> ''بھارتیہ جنتا پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی تو دوسرے قوانین کے ساتھ ساتھ ملکی آئین کے اندر رہتے ہوئے مسلم پرسنل لاء میں بھی تبدیلی کر دے گی۔''

دوسری طرف مالیر کوٹلہ (بھارت) سے مولانا مفتی فضیل الرحمان ہلال عثمانی کی ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ ''دارالسلام'' نے نومبر ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں ایڈوانی صاحب مذکور کا مسلمانوں کو یہ مشورہ نقل کیا ہے کہ

> ''اب آزادی کے پچاسویں برس وقت آ گیا ہے کہ مسلمان بغیر لاگ لپیٹ کے اعلان کر دیں کہ وہ ہندوؤں کو کافر نہیں سمجھتے۔''

نیز

> ''مسلمان رام، جین، بدھ جیسی شخصیات کو اس ملک کی تہذیبی علامت کے طور پر قبول کر لیں۔''

ان بیانات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بھارت کے مسلمان اس وقت کس کڑی آزمائش سے گزر رہے ہیں اور انہیں اپنے مذہبی تشخص اور خاندانی قوانین و اقدار کے تحفظ کے لیے کن صبر

آزما مراحل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل جب بابری مسجد شہید کی گئی تو لندن میں ایک بھارتی مسلمان دانشور سے بھارتی مسلمانوں کی مشکلات کے بارے میں گفتگو ہوئی، ان کا کہنا تھا کہ اب ہمارا تحفظ اور تشخص اسی میں ہے کہ پاکستان مستحکم ہو اور صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست بنے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم اب پاکستان کو ایک مستحکم اور صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنانے کے قابل رہ گئے ہیں؟

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ......فروری ۱۹۹۸ء)

قیامِ پاکستان کے خونریز واقعات اور سکھ راہنماؤں کا اعتراف

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۸اپریل ۱۹۹۸ء کی ایک خبر کے مطابق بیساکھی کے میلہ کے سلسلہ میں لاہور آئے ہوئے ایک سکھ راہنما اور شرومنی پربندھک کمیٹی کے ممبر سردار جنگ بہادر نے نوائے وقت سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ پنجاب کے موقع پر ہندوؤں کے ورغلانے پر سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا جس پر انہیں افسوس ہے۔

غالباً دو سال قبل کی بات ہے کہ لندن کے علاقہ ساؤتھال میں، جہاں سکھوں کی بڑی تعداد آباد ہے، ایک سکھ راہنما سے اس مسئلہ پر راقم الحروف کی گفتگو ہوئی تو انہوں نے بھی اعتراف کیا کہ ہم سے اس وقت بہت بڑی غلطی ہوئی کہ ہم نے ہندوؤں کے اکسانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اور اس کا خمیازہ ابھی تک ہم بھگت رہے ہیں۔ راقم الحروف نے ان سے عرض کیا کہ صرف ۱۹۴۷ء کی بات نہیں ہے بلکہ ۱۸۵۷ء میں بھی سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا جب ۱۸۵۷ء کی معروف جنگِ آزادی کے کمانڈر جنرل بخت خان مرحوم دہلی پر قبضہ کر چکے تھے اور غاصب انگریزوں کو کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی، اس وقت بھی پنجاب سے سکھوں کی تازہ دم فوج نے دہلی جا کر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور جنرل بخت خان سے دہلی کا قبضہ واپس لینے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اس وقت اگر سکھ فوجیں انگریزوں کی حمایت میں دہلی نہ پہنچتیں، اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دادا مرزا غلام مرتضٰی جیسے غدارانِ قوم انگریزوں کا ساتھ دینے کے لیے لڑاکا نوجوانوں کے دستے دہلی نہ بھجواتے تو جنگِ آزادی اپنے نتائج حاصل کر چکی تھی اور دہلی پر مجاہدینِ آزادی کا قبضہ

ہو چکا تھا۔

سکھوں کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات میں آ کر کام کر جاتے ہیں اور بعد میں سوچتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ کرنا چاہیے تھا یا کہ نہیں؟ اس لیے انہیں افسوس اور ندامت کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ مگر یہ صرف سکھوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، جو قوم یا گروہ بھی صرف جذبات اور جوش و خروش کے حوالے سے فیصلہ کرتا ہے اور نتائج و عواقب کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، تاریخ میں اسے یہی کردار ملتا ہے، اور جب پچھتاوے کی نوبت آتی ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا کیونکہ

اب پچھتائے کیا ہوت
جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... مئی ۱۹۹۸ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۱۰ اپریل ۲۰۰۱ء کے مطابق ننکانہ صاحب اور حسن ابدال میں بیساکھی کے میلے کی تقریبات میں شرکت کے لیے مشرقی پنجاب سے آنے والے معمر سکھ یاتریوں نے ۱۹۴۷ء کے واقعات پر شرمندگی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ۱۹۴۷ء کا بٹوارا ہوا تھا اور ہم آج شرمندہ ہیں کہ اس وقت ہم نے ہندوؤں کا ساتھ دیا۔

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے موقع پر جب پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تو مشرقی پنجاب کی سکھ اکثریت نے مسلمانوں کا جس بے دردی کے ساتھ قتلِ عام کیا تھا وہ تاریخ کا ایک ہولناک باب ہے۔ ہزاروں مسلمان شہید کر دیے گئے، لاکھوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، معصوم بچوں کو خنجروں اور نیزوں پر پرو دیا گیا، اور خواتین کی بے حرمتی کے وہ شرمناک مظاہرے ہوئے کہ قلم ان کے بیان سے قاصر ہے۔ یہ سب کچھ ہندوؤں کی شہہ پر ہوا لیکن اب جبکہ ہندو بنیے سے نصف صدی میں سکھوں کو خود بھی کچھ نہیں ملا تو انہیں مسلمانوں پر کیے گئے مظالم یاد آ رہے ہیں اور شرمندگی کے اظہار کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

سکھوں نے اس سے قبل ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بھی انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ اور جب مجاہدینِ آزادی کے کمانڈر جنرل بخت خان مرحوم نے انگریزی

فوجوں کوشکست دیتے ہوئے دہلی پر قبضہ کرلیا تھا تو پنجاب کی سکھ حکومت نے تازہ دم فوج بھیج کر جنرل بخت خان سے دہلی کا قبضہ واپس لیا تھا جس سے انگریزوں کا اقتدار پھر سے بحال ہو گیا تھا۔

جہاں تک سکھوں کے سیاسی حقوق اور ان کی جدوجہد کا تعلق ہے ہم اس کے مخالف نہیں ہیں، اور ان کے جائز حقوق اور جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں، لیکن سکھوں کے اس قومی طرزِ عمل کو بھول جانا بھی ہمارے بس میں نہیں ہے جو ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء میں انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اختیار کیا، اور چند بوڑھے سکھوں کی طرف سے ندامت کا اظہار اس کی شدت اور سنگینی میں کمی نہیں کرسکتا۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... مئی ۲۰۰۱ء)

دعوتِ اسلام کا فریضہ اور ہندوستان کی سرزمین

ماہنامہ الفرقان لکھنو کے ایڈیٹر مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی ان دنوں ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی دعوت پر برطانیہ آئے ہوئے ہیں اور مختلف شہروں میں علماء کرام کے خصوصی اجتماعات اور عوامی تقریبات سے خطاب کر رہے ہیں۔ ''الفرقان'' برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے قدیم دینی جرائد میں سے ہے جس کا اجرا عالم اسلام کی معروف علمی شخصیت حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے کیا تھا اور کم وبیش پون صدی سے یہ جریدہ جنوبی ایشیا کی دینی صحافت میں وقار اور سنجیدگی کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے فرزند ہیں، دارالعلوم دیوبند اور مدینہ یونیورسٹی کے فیض یافتہ ہیں، اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھارت میں تبلیغی جماعت کے ذمہ دار حضرات میں شمار ہوتے تھے مگر اسلام کی دعوت وتبلیغ کے حوالہ سے ایک محدود دائرے پر قناعت نہ کر سکے اور مسلمانوں کو دین کی طرف واپس لانے اور ان کی دینی تربیت کے کام کو تبلیغی جماعت کے سپرد کرتے ہوئے خود غیر مسلموں کو اسلام کی طرف راغب کرنے اور ان تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام سنبھال لیا۔

اس خطہ زمین میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کا عمل حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت سید علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش جیسے عظیم صوفیاء کرام کا ورثہ ہے۔ ان مشائخِ امت نے محبت اور اخلاق کے ذریعے اسلام کا پیغام اس سرزمین کے باشندوں تک پہنچایا اور لاکھوں پیاسے دلوں کو

سیراب کر گئے۔ مگر بدقسمتی سے اس روایت کا تسلسل قائم نہ رہا اور ہم مسلمانوں نے صدیوں تک جنوبی ایشیا میں سیاست اور اقتدار پر اپنی گرفت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہوئے محبت اور کردار کے ذریعہ اسلام کی دعوت وتبلیغ کی بساط لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آٹھ سو سال کے بعد جب بادل چھٹے تو پورے جنوبی ایشیا میں پھیلاؤ کے باوجود ہم سیاست واقتدار کے حوالہ سے شمال اور مشرق کے دو محدود دائروں میں سمٹنے پر مجبور ہو گئے۔

اسلام پوری نسل انسانی کا مذہب ہے اور اسے نسل انسانی کے ہر طبقہ، گروہ اور فرد تک پہنچانا ہم مسلمان کہلانے والوں کی ذمہ داری ہے۔ دنیا بھر کے انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے کے لیے جو کچھ ہمیں کرنا چاہیے، یا معروضی حالات میں جو کچھ ہو سکتا ہے، سچی یہ بات ہے کہ اس وقت روئے زمین پر موجود ہم مسلمانوں سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ اور اگر کسی جگہ شخصی یا محدود تنظیمی سطح پر کچھ ہو بھی رہا ہے تو اس پر دعوت کے تقاضوں کی بجائے ہماری داخلی ترجیحات غالب ہیں اس لیے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو رہے۔

بھارت کے داخلی حالات کے تناظر میں اس رخ پر کام کی ضرورت کا احساس ماضی قریب میں دیوبند کے ایک دردمند عالم دین اور دانشور مولانا شمس نوید عثمانیؒ نے اجاگر کیا جو پاکستان کے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بھتیجے تھے۔ ماہانہ تجلی دیوبند کا مطالعہ کرنے والے حضرات ان سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا موقف اور تحقیق یہ ہے کہ ہندو مذہب قدیم ترین آسمانی مذاہب میں سے ہے اور ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''وید'' کی تعلیمات بھی وہی ہیں جو دیگر آسمانی کتابوں تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم کی تعلیمات ہیں۔ لیکن برہمنوں اور پنڈتوں نے وید کو عام ہندو کی دسترس سے دور رکھا ہوا ہے تاکہ وہ اصل حقیقت سے آشنا نہ ہو سکیں۔ مولانا شمس نوید عثمانی مرحوم نے اپنی کتاب ''اب بھی نہ جاگے تو'' میں اپنی اس تحقیق کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ دوسری آسمانی کتابوں کی طرح ''وید'' میں بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی واضح پیش گوئیاں موجود ہیں۔ اور دنیا کے نجات دہندہ کے حوالہ سے ایسی تصریحات پائی جاتی ہیں جو حضرت محمدؐ کے سوا تاریخ انسانی کی کسی دوسری شخصیت پر صادق نہیں آتیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی تحقیق کی بنیاد پر بھارت کے ہندو معاشرے میں ماضی کے عظیم صوفیاء کرامؒ کی طرز پر ایک دعوتی تحریک کا

آغاز کیا اور اہل علم کو دعوت دی کہ وہ اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ کرتے ہوئے عام انسانوں کے ساتھ ربط بڑھائیں، ان کے دکھ درد میں شریک ہوں، اور انہیں اس بات کا احساس دلائیں کہ اسلام فی الواقع انسانیت کا مذہب ہے اور انسان کو دنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات کی راہ دکھاتا ہے۔

مولانا سجاد نعمانی اسی فکر کے علمبردار ہیں اور مولانا شمس نوید عثمانی مرحوم کی وفات کے بعد اس تحریک کی قیادت کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں کی مسلم ہندو کشمکش اور اس سے پیدا ہونے والی تلخیوں کے پس منظر میں اس کام کو آگے بڑھانا بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی ضرورت بہر حال موجود تھی۔ اور یہ وقت کا تقاضہ تھا جسے اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کے ساتھ شروع کیا گیا اور اس کے انتہائی حوصلہ افزا نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ اس تحریک کے دو میدان ہیں۔ ایک خدمت خلق کا میدان ہے کہ کسی قسم کی تفریق اور امتیاز کا لحاظ کیے بغیر معاشرہ کے نادار افراد کی خدمت اور انہیں ہر ممکن طور پر بنیادی ضروریات بالخصوص طبی سہولتیں فراہم کرنا۔ اس کے تحت یہ تحریک گزشتہ سال چالیس ہزار سے زائد افراد کو علاج معالجہ کی فری سہولتیں مہیا کر چکی ہے۔ جبکہ دوسرا میدان لوگوں کو مرنے کے بعد کی زندگی کی بہتری اور نجات کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا اور سادہ انداز میں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرانا ہے۔

مولانا سجاد نعمانی کا کہنا ہے کہ اس تحریک کے نتیجے میں ہزاروں لوگ متوجہ ہو رہے ہیں اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے حضرات مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد واقعات سنائے جن میں سے ایک کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک بار ٹرین میں سفر کر رہے تھے کہ نصف شب کے قریب کسی اسٹیشن سے سادھوؤں کا ایک گروہ ٹرین پر ان کے ڈبے میں سوار ہوا۔ ان میں ایک ضعیف العمر سادھو تھا جو ضعف اور سردی کے مارے کپکپا رہا تھا۔ انہوں نے اس بوڑھے سادھو کے لیے اپنی برتھ چھوڑ دی اور اسے کہا کہ وہ اس پر آرام کرے۔ پہلے تو ان سادھوؤں کو اس بات کا یقین ہی نہیں ہوا کہ کوئی مسلمان بالخصوص ایک مذہبی راہنما اور عالم دین نظر آنے والا مسلمان کسی ہندو سادھو کے لیے اپنی جگہ چھوڑ سکتا ہے۔ اس لیے ہچکچاہٹ اور تذبذب کی فضا کچھ دیر قائم رہی لیکن پھر ان کے اصرار پر وہ بوڑھا ہندو سادھو آرام

کے لیے ان کی برتھ پر لیٹ گیا۔ صبح منزل مقصود پر پہنچ کر ٹرین سے اترے تو پلیٹ فارم پر وہ بوڑھا سادھو مولانا نعمانی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ

''لگتا ہے وہ وقت آ گیا ہے۔''

مولانا کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کہ کون سا وقت آ گیا ہے؟ تو اس نے ٹالنے کی کوشش کی کہ نہیں کوئی بات نہیں لیکن ان کی طرف سے اصرار بڑھا تو اس نے کہا کہ ہم اس وقت کا ایک عرصہ سے انتظار کر رہے ہیں کہ جب تم مسلمان یہاں کے عام لوگوں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرو گے جو تمہارے پیغمبر کا عام انسانوں کے ساتھ تھا اور اس کے نتیجہ میں تمہارے پیغمبر کا مذہب یہاں کے لوگوں میں پھیل جائے گا۔ یہ کہہ کر سادھو رخصت ہو گیا اور مولانا نعمانی کہتے ہیں کہ اس کے ان جملوں سے ان کا اپنے مشن کی صداقت پر یقین پہلے سے بڑھ گیا اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ سارا عمل کسی منظّم منصوبہ بندی کا حصہ ہے جو دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔

مولانا سجاد نعمانی مختلف محافل میں عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ علماء کرام کو بھی ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلا رہے ہیں اور مختلف مفید نکات اٹھا رہے ہیں جن میں سے دو کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے علماء کرام سے کہا کہ وہ اس طرز عمل پر نظر ثانی کریں کہ ہم لوگ اپنے ماحول میں دین کی بات اسلام اور امت کی اجتماعی ضرورت کو سامنے رکھ کر نہیں کر رہے بلکہ اپنی اور اپنے مخاطبین کی سہولت کو بنیاد بنا کر کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام کے ہمہ گیر پہلوؤں کو موضوعِ گفتگو بنانے کی بجائے اپنے اپنے ذوق اور سہولت کے مطابق چند باتوں پر قناعت کیے ہوئے ہیں، جو بحیثیت عالم دین اپنے منصب اور ذمہ داریوں کے ساتھ انصاف نہیں، بلکہ یہ کم از کم الفاظ میں خیانت ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی اور اپنے مخاطبین کی سہولت نہ دیکھیں بلکہ دین اور ملت کی اجتماعی ضرورت کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق بات کریں تاکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کی ذمہ داریوں سے کسی نہ کسی حد تک عہدہ برآ ہو سکیں۔

دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ ہمارا یہ مزاج بن گیا ہے کہ دین کے جس شعبے یا دائرے میں ہم کام کر رہے ہیں اس کے سوا باقی سب شعبوں کی نفی اور تحقیر کے بغیر ہماری بات مکمل نہیں ہوتی۔

یہ سراسر زیادتی کی بات ہے اور دین کے اجتماعی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مولانا نعمانی نے اس سلسلہ میں دورِ صحابہؓ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اکابر صحابہ کرامؓ میں سے ہر بزرگ کا ذوق اور دائرہ کار الگ تھا۔ حضرت عمرؓ کا ذوق اور دائرہ کار الگ تھا جبکہ ان کے حقیقی بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذوق اور دائرہ کار ان سے بالکل مختلف تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ الگ شعبہ کے بزرگ تھے اور حضرت خالد بن ولیدؓ کا شعبۂ عمل ان سے بالکل مختلف تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تگ و تاز کا میدان اور تھا جبکہ حضرت حسان بن ثابتؓ نے اس سے قطعی طور پر الگ شعبے کو اپنی سرگرمیوں کے لیے چنا تھا۔ یہ فطرت کی تقسیم تھی۔ اور اگر کسی میں حوصلہ ہے تو ان میں سے کسی ایک کے کام اور ذوق کو غلط کہہ کر دکھائے۔ مولانا نے کہا کہ اگر آپ میں سے کوئی شخص یہ چاہے کہ دین کے کام کا جو ذوق اور دائرہ کار اس کا ہے دنیا کے سب لوگ اسی میں آجائیں تو نہ صرف یہ کہ ایسا ممکن نہیں ہے بلکہ فطرت کے بھی خلاف ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے قانون اور سنت کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے جو کبھی اور کسی کے لیے نہیں بدلتی۔ اس لیے ہر شخص کو اس کے اپنے ذوق کے مطابق اس کے شعبہ کار میں کام کرنے دیجیے اور اس کی راہنمائی کر کے اسی شعبہ میں اس سے دین کا کام لیجیے۔ یہی فطرت کا راستہ ہے اور یہی جناب نبی اکرمؐ کی سنت ہے۔

مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی کے بارے میں کچھ عرصہ سے مختلف لوگوں سے طرح طرح کی باتیں سنتے آرہے تھے اور کچھ دوستوں کا یہ شکوہ بھی پیش نظر تھا کہ انہوں نے دین کی خدمت کا معروف راستہ چھوڑ کر الگ لائن اختیار کر لی ہے۔ لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی، مختلف مجالس میں ان کی باتیں سنیں، اور باہمی گفتگو میں سوال و جواب کے مراحل سے گزرے تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ انہوں نے لگے بندھے روایتی طریق کار کا دائرہ ضرور توڑا ہے لیکن کوئی نیا راستہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو بہت پیچھے اور بہت ہی پیچھے خواجہ معین الدین چشتیؒ اور سید علی ہجویریؒ کی طرف لوٹ گئے ہیں جو شاید صرف ان کا فیصلہ نہیں، تاریخ اور فطرت کا تقاضہ بھی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد......۲۲ ستمبر ۱۹۹۸ء)

بندے ماترم کا ترانہ اور بھارتی مسلمان

روزنامہ جنگ لاہور ۲۰ نومبر ۱۹۹۸ء کی خبر کے مطابق ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ یوپی (اتر پردیش) کے سکولوں میں روزانہ تعلیم کے آغاز پر گائے جانے والے ترانہ ''بندے ماترم'' میں مسلمان طلبہ کی شمولیت جائز نہیں ہے کیونکہ اس کے ایک بند میں یہ کہا گیا ہے کہ ''ہم وطن کی پوجا کرتے ہیں''۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اپنے فتویٰ میں کہا ہے کہ وطن سے محبت ایک الگ جذبہ ہے لیکن پوجا صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور کی پوجا کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

بھارت کے سب سے بڑے صوبے یوپی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ہے جو ہندو انتہا پسندی کی علمبردار سمجھی جاتی ہے اور اس نے یہ حکم جاری کیا ہے کہ یوپی کے تمام سکولوں میں ہر روز صبح تعلیم کے آغاز سے پہلے یہ ترانہ اجتماعی طور پر گایا جائے۔ اس کے ردعمل میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سربراہ کو مسلمان طلبہ اور طالبات کے عقیدہ کے تحفظ کے لیے یہ فتویٰ جاری کرنا پڑا ہے اور بھارت کے دیگر سرکردہ علماء کرام نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

اس سے جہاں بھارت کے سیکولر ہونے کے نام نہاد دعوے کی قلعی کھلتی ہے وہاں بی جے پی کی انتہا پسند حکومت کے ہاتھوں مسلمانوں کو درپیش مسائل ومشکلات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھارتی مسلمانوں کو اپنے ایمان وعقائد اور ملی اقدار وروایات کے تحفظ میں استقامت اور صبر وحوصلہ کے ساتھ مشکلات ومسائل کا سامنا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور کامیابی سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... دسمبر ۱۹۹۸ء)

مولانا ابوالحسن علی ندوی سے بدسلوکی

گزشتہ شمارے میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سربراہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے یو پی (اتر پردیش) کے سرکاری سکولوں میں بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) کی حکومت کے آرڈر کے تحت روزانہ صبح گائے جانے والے اس ترانے میں مسلمان طلبہ اور طالبات کی شرکت کو ناجائز قرار دیا ہے جس کا ایک بند یہ ہے کہ

''ہم دھرتی کی پوجا کرتے ہیں''۔

اس اعلان کے بعد مولانا ندوی کو ہندو انتہا پسندوں کی طرف سے مسلسل طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑ رہا ہے۔ حتیٰ کہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۹ دسمبر ۱۹۹۸ء میں شائع شدہ ایک مضمون کے مطابق لکھنؤ پولیس نے گزشتہ دنوں مولانا موصوف کے گھر پر ریڈ کیا اور ان سے بدسلوکی کی اور بدتمیزی کا مظاہرہ بھی کیا، جس پر متعدد دینی حلقوں نے شدید احتجاج کیا ہے۔ اور چونکہ مولانا علی میاں کی علمی شخصیت عالمی سطح پر متعارف ہے اس لیے عالمی ذرائع ابلاغ بھی اس واقعہ پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں اور بی بی سی نے اس پر ایک مستقل پروگرام نشر کیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ بھارتی پولیس کا یہ شرمناک طرز عمل تاریخی تسلسل کا حصہ ہے، وہی تاریخی تسلسل جو اہلِ حق کے ساتھ اربابِ ظلم و جور کے ہمیشہ سے چلے آنے والے معاندانہ اور توہین آمیز رویہ سے عبارت ہے۔ اور جس کے سینکڑوں مظاہر کا تذکرہ خود مولانا موصوف نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''تاریخِ دعوت و عزیمت'' کی متعدد ضخیم جلدوں میں کیا ہے۔ بہرحال ہم بھارتی پولیس کی اس افسوسناک حرکت کی مذمت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت مولانا موصوف کو صحت و سلامتی کے ساتھ بھارتی مسلمانوں کی تادیر راہنمائی کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ......جنوری ۱۹۹۹ء)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا انتقال

۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو برطانیہ کے شہر برنلے میں مولانا عزیز الحق ہزاروی کے ہاں تھا کہ جامعہ الہدیٰ نوٹنگھم کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے ٹیلی فون پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے انتقال کی روح فرسا خبر دیتے ہوئے بتایا کہ حضرت مولانا ندویؒ آج صبح رائے بریلی (انڈیا) میں اپنا دنیا کا سفر مکمل کر کے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا ایک عرصہ سے علیل تھے مگر ضعف وعلالت کے باوجود اپنے مشن کے حوالہ سے ان کی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں۔ الشریعہ کے گزشتہ شمارہ میں قارئین نے بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سالانہ اجلاس میں حضرت مولاناؒ کا خطبہ صدارت ملاحظہ کیا ہے جو وہ علالت کی وجہ سے خود وہاں تشریف لے جا کر نہیں پڑھ سکے تھے اور ان کی طرف سے مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے شرکائے کانفرنس کو سنایا تھا۔ اس خطبہ صدارت میں حضرت مولاناؒ نے پرسنل لاء کے مسئلہ پر مسلمانانِ ہند کی جس جرأت اور حوصلہ کے ساتھ ترجمانی کی ہے وہ اکابر علمائے حق اور اربابِ عزیمت کی روایات کی آئینہ دار ہے۔

حضرت ندویؒ کا تعلق امیر المجاہدین حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تھا، ان کی ولادت ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور اس طرح انہوں نے عیسوی سن کے لحاظ سے پچاسی برس کی عمر پائی۔ انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ماحول میں تعلیم وتربیت کے مراحل طے کیے اور اپنے استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے جانشین کے طور پر ندوہ کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے۔ انہوں نے

ندوہ کے اکابر مولانا سید علی مونگیریؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ، اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی علمی روایات اور ملی خدمات کے پرچم کو نہ صرف بلند سے بلند تر کیا بلکہ ان کے دور میں ندوہ کے تعارف و خدمات کا دائرہ پورے عالم اسلام بالخصوص عالم عرب تک پھیلتا چلا گیا۔ اردو ان کے گھر کی زبان تھی جبکہ عربی میں انہیں بے تکلف گفتگو اور تحریر کا ملکہ حاصل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فصاحت وسلاست کے جس کمال سے نوازا تھا اس نے خود عرب دانشوروں اور اربابِ علم میں انہیں نمایاں اور ممتاز مقام دے دیا تھا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ خاندانی اعتبار سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، تعلیم و تربیت اور تگ و تاز میں انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ورثہ کو سنبھالا جبکہ روحانی طور پر انہیں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، اور حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی جیسے عظیم اکابر سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ اس طرح وہ مختلف عظیم الشان نسبتوں کا مجمع البحار بن گئے تھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مغربی ثقافت اور اس کے پیدا کردہ نظریاتی و علمی فتنوں کے تعاقب کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا تھا۔ وہ بلاشبہ اس دور میں اسلامی تہذیب وثقافت اور تاریخ و روایات کے بے باک نقیب تھے۔ انہوں نے اس حوالہ سے دنیائے اسلام کے اربابِ فکر و دانش کے ایک بڑے حصے کو ادراک و شعور کی منزل سے ہمکنار کیا اور مغرب کے سیکولر فلسفہ اور فری سوسائٹی کے تار و پود بکھیر کر ذہنی مرعوبیت کی فضا کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

راقم الحروف کو ایک عرصہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے نیاز حاصل تھے۔ ۱۹۸۴ء میں مکہ مکرمہ میں حضرت ندویؒ اور حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ کی پہلی بار زیارت ہوئی اور اس کے بعد آکسفورڈ اور لاہور میں حضرت ندویؒ سے کئی بار ملاقات و استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دو بار کوشش کی کہ ان سے ان کی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت حاصل کی جائے مگر موقع نہ ملا۔ چند ماہ قبل حضرتؒ کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا کہ میرا بیعت کا تعلق حضرت مولانا عبید اللہ انور قدس اللہ سرہ العزیز سے تھا، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلفاء میں سے آپ کے ساتھ طبیعت زیادہ مانوس ہے اس لیے بیعت کے تعلق اور روایت حدیث کی

اجازت کی درخواست کر رہا ہوں۔ اس کے جواب میں ابھی دو ماہ قبل ان کا گرامی نامہ موصول ہوا جس میں دونوں گزارشات کی قبولیت کی اطلاع تھی۔

اس کے بعد میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رمضان المبارک کے بعد کسی بہانے انڈیا جانے کا پروگرام بنا کر استاذ اور شیخ کی حیثیت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زیارت وملاقات کا شرف ایک بار پھر حاصل کیا جائے مگر تقدیر کا فیصلہ غالب آ گیا اور حضرت مرحوم میرے جیسے ہزاروں عقیدت مندوں کی امیدوں کو حسرتوں میں تبدیل کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے حضور پیش ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور اہل خاندان، تلامذہ، متسبین، احباب اور عقیدت مندوں کو صبر وحوصلہ کے ساتھ ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ......جنوری ۲۰۰۰ء)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھارت کے مظلوم مسلمانوں کے لیے بہت بڑے سہارے اور ڈھارس کی حیثیت رکھتے تھے اور صرف قلم اور زبان کی دنیا کے آدمی نہیں تھے بلکہ انہوں نے عملی میدان میں بھارتی مسلمانوں کی جرأت مندانہ قیادت کی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مسلمانوں کے خاندانی قوانین کے تحفظ کے لیے قائم ہونے والے کل جماعتی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سربراہ تھے اور انہوں نے آخر دم تک اس ذمہ داری کو پوری جرأت و استقامت کے ساتھ نبھایا۔

بھارت میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ان پر ایک عرصہ سے یہ دباؤ چلا آ رہا ہے کہ وہ نکاح، طلاق اور وراثت سے متعلقہ خاندانی قوانین میں مذہبی احکام سے دستبردار ہو کر ہندوؤں اور دیگر غیر مسلمانوں کے ساتھ مشترکہ خاندانی قوانین (کامن سول کوڈ) کو قبول کر لیں لیکن مسلمان اس کے لیے تیار نہیں ہیں، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سربراہی میں تمام مسلم جماعتوں اور مکاتبِ فکر کے نمائندوں پر مشتمل آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی قیادت کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے شخصی اور خاندانی قوانین کو ابھی تک تحفظ حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں اپنی وفات سے صرف دو ماہ قبل مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ممبئی میں ہونے والے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ملک گیر اجتماع میں جو خطبہ صدارت پیش کیا اس میں انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ نکاح، طلاق اور وراثت میں مذہبی احکام سے دستبردار ہونے کی دعوت کو ہم ارتداد کی دعوت سمجھتے ہیں اور اس کا اسی طرح مقابلہ کریں گے جس طرح ہمارے اسلاف نے ارتداد کی دعوت کا ہمیشہ کیا ہے۔

اسی طرح بھارت کے سب سے بڑے صوبہ یوپی میں بی جے پی کی حکومت نے جب سرکاری تعلیمی اداروں میں روزانہ صبح ''بندے ماترم'' کا ترانہ گانے کو تمام طلبہ اور طالبات کے لیے لازمی قرار دیا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اعلان کیا کہ اس ترانے کے بعض اشعار شرکیہ ہیں اور ہم مسلمان ہیں، کوئی شرکیہ ترانہ نہیں گا سکتے، اس لیے ہم موت قبول کرلیں گے مگر ہمارے بچے سکولوں میں یہ ترانہ نہیں پڑھیں گے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اس دوٹوک اور شدید احتجاج پر یوپی حکومت کو بالآخر اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے عالمِ اسلام کو سب سے زیادہ جس فتنے سے خبردار کیا اور اس کے لیے مسلسل محنت کی وہ ''نیشنلزم'' کا فتنہ ہے۔ مولانا ندویؒ کا کہنا ہے کہ وطنی قومیت کا یہ فتنہ عالمِ اسلام کا شیرازہ بکھیرنے اور خلافتِ اسلامیہ کو ختم کرنے کے لیے سازش کے تحت کھڑا کیا گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کو اس فتنے سے نجات حاصل کرنی چاہیے اور ملی سوچ اور جذبات کو فروغ دینا چاہیے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بہت سی علمی و روحانی نسبتوں کا مجموعہ تھے۔ ان کا خاندانی تعلق امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تھا اور وہ رائے بریلی کی عظیم خانقاہ دائرہ شاہ علم اللہؒ کے مسند نشین تھے۔ علمی طور پر وہ ندوۃ العلماء کے نمائندہ تھے اور روحانی طور پر انہیں حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری سے خلافت و اجازت حاصل تھی، اور بلاشبہ وہ ہمارے ان عظیم اسلاف و اکابر کی آخری نشانی تھے جو ہم سے جدا ہوگئے ہیں۔

اس تعزیتی ریفرنس کا مقصد جہاں مولانا ندویؒ کی خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کرنا اور ان کے ساتھ اپنی نسبت کا اظہار ہے وہاں نئی نسل کو ان کے کارناموں کا تعارف کرانا بھی ہے جو نئی پود کا حق

ہے کیونکہ ان جیسے بزرگوں اور اکابر کی خدمات اور کارناموں سے سبق حاصل کر کے ہی ہماری نئی نسل آنے والے دور میں ملتِ اسلامیہ کی صحیح طور پر خدمت اور رہنمائی کر سکتی ہے۔

(۲۵ فروری ۲۰۰۰ء کو مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں خطاب)

بھارت میں
خاتون مفتیوں کے پینل کا قیام

''واشنگٹن پوسٹ'' نے ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں حیدر آباد دکن کے حوالے سے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کے ایک دینی ادارے ''جامعۃ المومنات'' نے تین عالمہ خواتین کو افتا کا کورس کرانے کے بعد فتویٰ نویسی کی تربیت دی ہے اور ان پر مشتمل خواتین مفتیوں کا ایک پینل بنا دیا ہے جو خواتین سے متعلقہ مسائل کو براہ راست سنتی اور ان کے بارے میں شرعی اصولوں کی روشنی میں فتویٰ جاری کرتی ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کے تجزیہ نگار کا خیال ہے کہ یہ جنوبی ایشیا میں پہلی مثال ہے کہ خواتین سے متعلقہ مسائل پر خواتین کو فتویٰ جاری کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگرچہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ خواتین کے مسائل کے حوالے سے فتویٰ دیتی رہی ہیں اور بعد میں بھی امت مسلمہ میں عورتوں کے دینی امور میں رائے دینے کی روایت موجود رہی ہے، لیکن یہ معاملہ غیر رسمی رہا ہے۔ اب ہندوستان میں اس نئی روایت کا آغاز کیا گیا ہے جس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

جامعۃ المومنات حیدر آباد دکن کے بارے میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس میں دو ہزار کے لگ بھگ طالبات دینی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور اس کے دار الافتاء کے سربراہ مولانا مفتی حسن الدین نے اپنی نگرانی میں بائیس سالہ عالمہ مفتیہ ناظمہ عزیز اور ان کی دو ساتھیوں کو فتویٰ نویسی کے لیے تیار کیا ہے اور اب خواتین ان سے براہ راست رجوع کر کے اپنے مسائل کے بارے میں رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔ رپورٹ میں اس پینل کے بعض فتاویٰ کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن میں میک

اپ سے متعلقہ مسائل اور عورت کو طلاق ہو جانے کی صورت میں اس کے بچے کی پرورش کی ذمہ داری کے بارے میں سوالات شامل ہیں۔

حیدرآباد دکن کے اس دینی ادارے کے قائم کردہ خواتین مفتیوں کے اس پینل کے بارے میں مزید معلومات تو براہ راست رابطہ کے بعد ہی حاصل ہو سکیں گی، البتہ جتنی بات کا واشنگٹن پوسٹ نے اپنے مخصوص انداز میں ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعۃ المومنات کے اس اقدام کو عالمی سطح پر ایک بڑی تبدیلی کے طور پر محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حالات کے تناظر میں یہ ایک اہم اور انقلابی پیشرفت ہے لیکن جہاں تک عورتوں کے تعلیم حاصل کرنے اور دینی امور میں رائے دینے کا تعلق ہے، ہمارا ماضی اس سلسلے میں شاندار روایات کا حامل ہے اور اب سے ایک ہزار سال قبل تک ہمارے ہاں عورتوں کا علمی معیار اس قدر بلند رہا ہے کہ مغرب عورتوں کو آزادی اور مساوات کی منزل سے ہم کنار کرنے کے بلند بانگ دعووں کے باوجود اس کی ہم سری نہیں کر سکتا۔

خلفائے راشدینؓ کے دور میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی روایت کے حوالے سے جن سات صحابہ کرام کو حدیث نبوی کے سب سے بڑے راوی شمار کیا جاتا ہے، ان میں ایک ام المومنین حضرت عائشہ بھی ہیں جن سے دو ہزار سے زائد احادیث مروی ہیں اور ان سے براہ راست حدیث نبویؐ روایت کرنے والے مرد و خواتین کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ وہ صرف روایت ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ قرآن وسنت سے مسائل کا استنباط کرتی تھیں، فتویٰ بھی جاری کرتی تھیں، اپنے معاصر مفتیوں کے فتووں سے اختلاف کرتی تھیں اور ان کے فتووں کا تعلق صرف عورتوں کے مسائل سے نہیں ہوتا تھا بلکہ عقائد کی تشریح، عبادات، امت کے اجتماعی معاملات اور دیگر امور بھی ان کے فتاویٰ کا حصہ ہوتے تھے۔ ان سے خلفائے راشدین خود بھی رہنمائی حاصل کرتے تھے اور ان کے فتاویٰ عملاً نافذ ہوا کرتے تھے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے ایک مستقل کتابچہ میں ان فتاویٰ کا ذکر کیا ہے جن میں ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصر مفتیوں اور مجتہدین سے اختلاف کیا ہے اور ان سے مختلف فتاویٰ جاری کیے ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہم صحابہ کرام کبھی کسی ایسی مشکل میں نہیں پھنسے جس کے

بارے میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کے پاس ہم نے علم اور رہنمائی نہ پائی ہو۔ حضرت عروہ بن زبیر کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے زمانے میں قرآن وسنت کی تشریح، شعر وادب، تاریخ قبائل عرب، فرائض ومیراث اور طب میں حضرت عائشہؓ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علوم کی سب سے بڑی وارث بھی ایک خاتون تھیں جن کا نام عروہ بنت عبد الرحمان ہے۔ یہ مشہور صحابی حضرت اسعد بن زرارہؓ کی پوتی ہیں، بہت ذہین وفطین خاتون تھیں، حضرت عائشہ کے ہاں رہتی تھیں اور ان کی مایہ ناز شاگرد ہونے کے علاوہ ان کے بیشتر معاملات وامور کی ذمہ دار ہوتی تھیں۔ صحابہ کرام کے آخری دور میں جب اس بات کا خطرہ نظر آنے لگا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا براہ راست مشاہدہ کرنے والے اور ان کے ارشادات براہ راست سننے والے حضرات کے دنیا سے رخصت ہوتے چلے جانے کے باعث کہیں سنت واحادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے ساتھ ہی نہ چلا جائے تو امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے سرکاری طور پر اس کا اہتمام کیا کہ جناب نبی اکرمؐ کی احادیث وسنت کو جمع کر کے محفوظ کیا جائے اور باقاعدہ تحریر میں لا کر ان کی حفاظت کی جائے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے بہت سے حضرات کی ڈیوٹی لگائی جن میں مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر بن قاسم بھی تھے جو حضرت عمرہ بنت عبد الرحمان کے بھتیجے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے انہیں اس بات کی بطور خاص ہدایت کی کہ وہ اپنی پھوپھی کے علوم وروایات کو جمع اور محفوظ کرنے کا خصوصی اہتمام کریں کیونکہ وہ ام المومنین حضرت عائشہ کے علوم کی وارث بلکہ حافظہ ہیں۔ ابن حجر عسقلانی کے نزدیک مدینہ منورہ میں اس کام کے لیے قاضی ابوبکر بن قاسم کو مقرر کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمان کے علوم وروایات کو منضبط کرنے کا کام زیادہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ عمرہ بنت عبد الرحمان صرف احادیث روایت ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ لوگ ان سے مسائل بھی دریافت کرتے تھے۔ وہ اپنے قاضی بھتیجے کے عدالتی فیصلوں کی نگرانی کیا کرتی تھیں اور بسا اوقات ان کو ٹوک بھی دیا کرتی تھیں۔

احادیث نبوی کی روایت میں خواتین کا کیا حصہ رہا ہے؟ اس کے بارے میں ہمارے دوست مولانا محمد اکرم ندوی نے، جو آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک سٹڈیز میں تحقیق اور ریسرچ کا کام کر رہے

ہیں اور امت کی ان محدثات کے حالات جمع کرنے میں مصروف ہیں جنہوں نے احادیث نبوی باقاعدہ طور پر پڑھی اور پھر پڑھائی ہیں، گزشتہ سال شعبان میں مجھے بتایا کہ وہ اب تک چھ ہزار محدثات کے حالات جمع کر چکے ہیں جو ان کے اندازے کے مطابق دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوں گے۔اسی طرح فقہ وافتا میں بھی متعدد خواتین بلند ترین مقامات تک پہنچی ہیں۔اس سلسلے میں بطور مثال چھٹی صدی ہجری کی ایک خاتون فقیہہ اور مفتیہ کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا جو فاطمہ فقیہہ کے نام سے معروف ہیں اور فقہ حنفی کی معروف کتاب ''بدائع الصنائع'' کے مصنف امام ابوبکر کاسانی کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ یہ اپنے والد اور خاوند کے ساتھ افتا کے کام میں شریک ہوتی تھیں اور خود بھی فتویٰ دیا کرتی تھیں حتیٰ کہ اس دور کے اہم مسائل پر جو فتاویٰ جاری ہوتے تھے، ان پر ان تینوں کے دستخط ہوا کرتے تھے۔

بعض روایات کے مطابق فاطمہ فقیہہ کی شادی کا واقعہ بھی دلچسپی کا حامل ہے جس کا مختصر تذکرہ علامہ شامی نے کیا ہے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب نے اپنے ایک خطبہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو ان کے مطبوعہ ''خطباتِ حکیم الاسلام'' میں موجود ہے۔ان کا کہنا ہے کہ فاطمہ فقیہہ خود بھی بڑی عالمہ تھیں اور ان کے والد بھی اپنے دور کے بہت بڑے عالم وفقیہ تھے۔فاطمہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں اس لیے ان کے لیے بڑے بڑے خاندانوں کے رشتے آتے تھے لیکن کسی رشتے پر باپ بیٹی کا اتفاق نہیں ہوتا تھا۔بالآخر فاطمہ فقیہہ نے خود ہی تجویز پیش کی کہ ان سے شادی کے خواہش مند حضرات موجودہ حالات کی روشنی میں فقہ حنفی پر کتاب لکھیں، وہ سب کتابوں کا مطالعہ کریں گی اور جس مصنف کی کتاب انہیں پسند آئے گی، اس سے شادی کر لیں گی۔حضرت مولانا قاری محمد طیب کے ارشاد کے مطابق اس ''مقابلہ'' میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے ''بدائع الصنائع'' کو محترمہ نے پسند کیا اور اس کے مصنف امام ابوبکر کاسانی سے شادی کر لی۔

اس لیے بھارت کے ایک دینی ادارے نے اگر تین عالم خواتین کو افتا کی باقاعدہ تربیت دے کر ان پر مشتمل خاتون مفتیوں کا مستقل پینل بنایا ہے اور خواتین سے اپنے مسائل کے لیے ان سے براہ راست رجوع کرنے کو کہا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ ہی مسلمانوں میں کسی نئی روایت کا اضافہ ہے بلکہ یہ اقدام اپنے شاندار ماضی کی طرف واپس پلٹنے کا عمل ہے جو انتہائی خوش آئند اور

اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے دینی حلقوں نے اپنے ماضی کی تاریخ اوراسلاف کی روایات سے آگاہی حاصل کرنے اوران کی طرف واپس پلٹنے کی ضرورت محسوس کرلی ہے۔اس موقع پرہم یہ گزارش کرنے کی ضرورت بھی محسوس کررہے ہیں کہ ''عورت'' کے حوالے سے ہماری موجودہ اور مروجہ روایات واقدار کا ایک بڑا حصہ ہمارے علاقائی کلچر سے تعلق رکھتا ہے جسے دین قرار دے کر ان کی ہر حالت میں حفاظت کا تکلف روا رکھا جا رہا ہے۔اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم دینی تعلیمات واقداراورعلاقائی کلچروثقافت کی روایات واقدار کے درمیان فرق کومحسوس کریں اوراس حقیقت کاادراک حاصل کریں کہ ہرحالت میں تحفظ صرف دینی تعلیمات واقدار کا حق ہے جبکہ کلچر اورثقافت،حالات اورضروریات کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتی رہنے والی چیزیں ہیں۔ یہ امرواقعہ ہے کہ ہم ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کررہے جس سے علاقائی اورعالمی سطح پر بہت سے غیر ضروری مسائل اورناواجب پیچیدگیاں جنم لے رہی ہیں۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم جامعۃ المومنات حیدرآباد بھارت کے اس اقدام کا خیرمقدم کرتے ہیں اوراس کے منتظمین کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے جنوبی ایشیا کے دیگر دینی اداروں سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس اچھی اورضروری روایت کوآگے بڑھانے میں مثبت اورموثر کردار ادا کریں گے۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... نومبر۲۰۰۳ء)

بھارت میں
غیر سرکاری شرعی عدالتوں کا قیام

روزنامہ جنگ لاہور ۲۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کی رپورٹ کے مطابق بھارتی صوبے گجرات میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے پہلی شرعی عدالت ''دارالقضاء'' کے نام سے قائم کر دی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صوبہ بہار، اڑیسہ، آسام اور اترپردیش میں شرعی عدالتیں پہلے ہی کامیابی سے کام کر رہی ہیں جس کی کامیابی کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے، جو بھارت میں شریعت کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کا سب سے بڑا ادارہ ہے، اب گجرات میں بھی شریعت کورٹ قائم کر دی ہے۔ ''دارالقضاء'' میں مسلمانوں کے روزمرہ معاملات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے گا۔ مفتی عبید اللہ الاسدی کو دارالقضاء کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے جو ممتاز عالم دین اور جامعہ عربیہ اسلامیہ کے سربراہ ہیں۔ اس موقع پر منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسلام کا نظام انصاف مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ انھیں اپنے تنازعات کے لیے شریعت کورٹ سے رجوع کرنا چاہیے اور خدشات کے بغیر عدالت کا فیصلہ تسلیم کرنا چاہیے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بھارت میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے ذمہ دار نمائندوں کا مشترکہ فورم اور اس لحاظ سے مسلمانوں کا سب سے بڑا نمائندہ ادارہ ہے جس میں تمام مذہبی مکاتب فکر شامل ہیں اور اس کا مقصد پرسنل لا یعنی نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو قائم رکھنا اور اس عالمی اور قومی دباؤ کا مقابلہ کرنا ہے جو مسلمانوں پر انھیں نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ کے جداگانہ دینی قوانین واحکام سے دست برداری پر آمادہ

کرنے کے لیے مسلسل بڑھایا جا رہا ہے۔ بھارت میں ''کامن سول کوڈ'' کے نام سے ایک عرصہ سے یہ تحریک جاری ہے کہ جس طرح دوسرے مذاہب کے لوگ باہم شادیاں کر رہے ہیں اور پرسنل لا میں اپنے مذہبی احکام کے بجائے مشترکہ عالمی وملکی قوانین پر عمل پیرا ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی مشترکہ برادری کا حصہ بننا چاہیے اور اپنے لیے الگ مذہبی قوانین پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، مگر مسلمانوں نے متفقہ طور پر اس کو مسترد کر دیا ہے اور ایک عرصہ سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم پر وہ اپنے جداگانہ تشخص اور خاندانی قوانین وروایات کے تحفظ کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس بورڈ کے سربراہ بالترتیب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ اور فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ رہ چکے ہیں، جبکہ ان کے بعد ندوۃ العلماء لکھنو کے سربراہ حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ بورڈ کے سربراہ ہیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوششوں میں یہ بات بھی شامل رہتی ہے کہ مسلمان اپنے نکاح وطلاق کے تنازعات اور دیگر باہمی معاملات شرعی عدالتوں کے ذریعے سے حل کرائیں اور اسی مقصد کے لیے پرائیویٹ سطح پر شرعی عدالتوں کے قیام کا تجربہ کیا جا رہا ہے جہاں تحکیم کی صورت میں دونوں فریق مقدمہ لاتے ہیں اور شرعی عدالتیں 'حکم' کی حیثیت سے ان کا فیصلہ صادر کرتی ہیں۔ صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کے نام سے یہ پرائیویٹ نظام بہت پہلے سے قائم ہے جس میں حضرت مولانا قاضی سجادؒ، حضرت مولانا منت اللہؒ اور حضرت مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ ایک عرصہ تک امیر شریعت اور قاضی کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں اور کم وبیش پون صدی سے یہ نظام وہاں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے جسے مسلم پرسنل لا بورڈ، بھارت کے دوسرے صوبوں تک وسیع کرنے میں مصروف ہے جو ایک خوش آیند امر ہے۔

جن معاملات میں لوگ تحکیم یا ثالثی کی صورت میں باہمی رضامندی کے ساتھ اپنے تنازعات اور مقدمات پرائیویٹ عدالتوں کے پاس لے جا سکتے ہیں، ان میں لوگوں کو شرعی فیصلوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کرنا اور ان کے فیصلوں کے لیے اس طرح کی عدالتوں کا اہتمام ایک انتہائی بہتر اور اچھی جدوجہد ہے جس کا تجربہ کرنے کی ایک بار ہم نے بھی کوشش کی تھی۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا ملک گیر کنونشن جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حافظ

الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی رحمہ اللہ تعالیٰ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں ملک بھر سے ہزاروں علماء کرام اور دینی کارکنوں نے شرکت کی تھی۔ اس کنونشن میں قائد جمعیۃ علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز نے جمعیۃ کی مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق ملک بھر میں آزاد شرعی عدالتیں قائم کرنے کا اعلان کیا تھا جس کے مرکزی بورڈ میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے علاوہ پیر شریف لاڑکانہ کے حضرت مولانا عبد الکریم قریشی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم بھی شامل تھے۔ اس بورڈ نے ملک میں اس نوعیت کی آزاد شرعی عدالتوں کے قیام کے لیے ضروری امور اور طریق کار کا خاکہ طے کیا تھا اور مختلف علاقوں میں قاضیوں کا تقرر بھی کر لیا گیا تھا، لیکن عوامی سطح پر مناسب ذہن سازی نہ ہونے اور جمعیۃ علماء اسلام کی دیگر قومی سیاسی سرگرمیوں میں حد درجہ مصروفیت کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

اب بھارت میں اس تجربہ کی کامیاب پیشرفت کی خبر پڑھ کر اس پروگرام کی یاد ایک بار پھر ذہن میں تازہ ہوگئی ہے اور یہ کسک سی دل میں ہونے لگی ہے کہ یہ کام اگر انڈیا میں ہوسکتا ہے تو پاکستان میں کیوں نہیں ہوسکتا؟ جہاں تک ملکی قوانین کا تعلق ہے، دستور و قانون، دونوں حوالوں سے اس امر کی گنجایش موجود ہے کہ جو معاملات قابل دست اندازی پولیس نہیں ہیں اور جن میں فریقین باہمی رضامندی کے ساتھ کسی کو حکم اور ثالث مان کر اپنا مقدمہ ان کے سپرد کر سکتے ہیں، ان میں اس طرح کی عدالتیں یا ثالثی کونسلیں قائم کی جا سکتی ہیں، بلکہ ان عدالتوں اور ان کے فیصلوں کو قانونی تحفظ بھی مل سکتا ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ کے حوالے سے وہاں کے دوستوں نے ہمیں یہ بتایا کہ امریکی دستور کے مطابق نہ صرف پرسنل لا میں بلکہ بعض مالی معاملات میں بھی تحکیم اور ثالثی کی صورت میں پرائیویٹ عدالتوں کی گنجایش موجود ہے جس کو ایک مخصوص پراسس اور شرائط کے ساتھ سرکاری طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور سپریم کورٹ تک تمام عدالتی فورم ان فیصلوں کا احترام کرتے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق امریکہ میں بسنے والے یہودیوں نے اس دستوری گنجایش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جداگانہ عدالتی ادارے قائم کر رکھے ہیں اور وہ اپنے بہت سے معاملات کے فیصلے ان عدالتوں سے کراتے ہیں۔ ہم نے امریکہ میں وہاں کے بہت سے علماء

کرام اور دانش وروں سے متعدد بار یہ گزارش کی ہے کہ اگر امریکہ کا دستور بعض معاملات میں اس طرح کی عدالتوں کی گنجایش دیتا ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا اور اپنے ہر طرح کے معاملات بالخصوص پرسنل لا کے امور کو غیر مسلم عدالتوں کے پاس لے جانا بہت زیادتی کی بات ہے۔ وہاں بعض حلقوں میں اس کا احساس پایا جاتا ہے، لیکن پیشرفت کے لیے جس سطح کی سوچ، حوصلہ، محنت، ہوم ورک، اور عوامی ذہن سازی کی ضرورت ہے، اس کا فقدان ہے اور کم وبیش یہی صورت حال ہمارے ہاں پاکستان میں بھی ہے جہاں ہم نے شریعت کی ہر بات کے لیے حکومت پر انحصار کر رکھا ہے اور ہر مسئلہ حکومت کے کھاتے میں ڈال کر خود آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ شریعت کے جن احکام پر عمل حکومت اور اقتدار پر موقوف نہیں ہے اور اس کے لیے لوگوں کو تیار کرنے اور اس میں پیشرفت کے لیے مناسب نظم پرائیویٹ سطح پر بنایا جاسکتا ہے، اس کے لیے ہم کیوں تیار نہیں ہوتے؟

ہمارے نزدیک سب سے زیادہ ضرورت عوامی سطح پر دینی شعور کو بیدار کرنے اور اجتماعی معاملات میں دینی راہ نمائی کو قبول کرنے کا احساس پیدا کرنے کی ہے اور اس سے بھی زیادہ ضرورت دینی اخلاقیات کو عملی زندگی میں لانے کی ہمہ گیر جدوجہد کی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اس بات کے لیے تیار کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر معاملہ میں عدالت اور سرکاری دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے جو معاملات وہ کسی سطح پر خود طے کر سکتے ہیں، انھیں عدالت اور سرکار کے دروازے سے باہر ہی نمٹا لیا جائے۔ اس سے جھگڑوں میں بھی کمی آئے گی اور عدالتوں پر کام کا بوجھ بھی کم ہوگا، مگر اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے، مناسب منصوبہ بندی درکار ہے، ٹیم ورک اور مسلسل ورک کا حوصلہ چاہیے جس کے لیے ہم میں سے شاید کوئی بھی تیار نہ ہو اور یہی ہماری قومی زندگی کا سب سے بڑا روگ ہے۔ خدا کرے کہ ہم اپنی سوچ اور ترجیحات پر ایسی نظر ثانی کر سکیں جو ہماری معاشرتی زندگی میں کسی مثبت تبدیلی اور انقلاب کی نوید بن جائے۔ آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ...... جنوری ۲۰۰۵ء)

نجی شرعی عدالتیں:

اہمیت وضرورت اور امکانات

پرائیویٹ سطح پر شرعی عدالتوں کے قیام کی ضرورت اور اس کے لیے اس سے قبل کی جانے والی مساعی کے بارے میں چند معروضات گزشتہ کالموں میں پیش کر چکا ہوں۔ اور آج اس حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کے عالمی اور قومی تناظر میں اس کی اہمیت وضرورت اور امکانات کی کیا صورتحال ہے اور اگر ہم آج کے ماحول میں اس کارِ خیر کی شروعات کرنا چاہیں تو وہ کس طرح کی جاسکتی ہے؟ پہلے ان مساعی پر ایک سرسری نظر پھر سے ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اس سے قبل اس سلسلہ میں سامنے آچکی ہیں:

☆ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں پورے برصغیر میں فرنگی استعمار کے تسلط اور مسلمانوں کے شرعی عدالتی نظام کے خاتمے کے بعد جب نئے دور کے آغاز کے طور پر دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا گیا تو دارالعلوم کے احاطہ میں ہی شرعی عدالت قائم کر کے مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو قاضی مقرر کیا گیا جو اس وقت کے حالات اور امکانات کے دائرے میں مسلمانوں کے مقدمات وتنازعات کا شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کرتے رہے۔

☆ بھارت کے صوبہ بہار میں جمعیۃ علماء ہند کی تحریک پر حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی امارت میں ''امارت شرعیہ'' کے عنوان سے پرائیویٹ شرعی عدالت قائم کی گئی، ان کے بعد مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ بطور ''امیر شریعت'' اس کام کو

چلاتے رہے اور اب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اس منصب پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ صوبہ بہار کی یہ امارت شرعیہ اپنے قیام سے لے کر اب تک نہ صرف قائم و موجود ہے بلکہ بہار کے مسلمانوں کو تمام ممکنہ دائروں میں شرعی فیصلوں کی سہولت مسلسل فراہم کر رہی ہے۔

☆ بھارت کے دیگر صوبوں اور علاقوں میں بھی یہ نظام کام کر رہا ہے جبکہ ۱۹۸۰ء میں مختلف مقامات پر کام کرنے والی ان پرائیویٹ شرعی عدالتوں کو کل ہند سطح پر منظّم کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر مولانا اسعد مدنیؒ کی قیام گاہ پر علماء کے ایک بھرپور اجلاس میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمان اعظمیؒ کو کل ہند سطح پر امیر شریعت اور مولانا سید اسعد مدنیؒ کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا تھا اور بھارت کے مختلف علاقوں میں متفرق طور پر ہونے والے اس کارخیر کو ملکی سطح پر منظّم کرنے کی تحریک کا آغاز کیا گیا تھا۔

☆ پاکستان میں جمعیۃ علماء اسلام نے مولانا مفتی محمودؒ کی تحریک پر انہی کی سربراہی میں ۱۹۷۵ء میں پورے ملک میں پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا اور اس کے لیے قواعد وضوابط اور طریق کار طے کر کے قومی، صوبائی اور اضلاع کی سطح پر قاضیوں کا تقرر بھی کر لیا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر، جن کا ذکر ایک سابقہ کالم میں کر چکا ہوں، یہ کام عملاً آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

☆ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں خاندانی نظام اور مالیاتی معاملات کے حوالے سے مسلمانوں کو قرآن وسنت کی روشنی میں ان کے تنازعات ومقدمات کے تصفیے کی سہولت فراہم کرنے کا نظام موجود ہے جبکہ امریکہ میں ''شریعہ بورڈ'' کے نام سے اور جنوبی افریقہ میں ''مسلم جوڈیشیل کونسل'' کے نام سے کام کرنے والے اس نظام کو وہاں کے ملکی قانون میں بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆ برطانیہ میں مسلمانوں کو ان کے خاندانی اور مالیاتی معاملات میں شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلوں کا حق دلانے کی جدوجہد جاری ہے۔ حتٰی کہ مسیحیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ

کے عالمی سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمز نے بھی اس بات کی حمایت کی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے خاندانی اور مالیاتی معاملات میں ان کی شریعت کے مطابق فیصلوں کا حق فراہم کرنے کے لیے امریکہ کی طرح برطانیہ کے عدالتی نظام میں بھی گنجائش پیدا کی جائے اور تازہ اطلاعات کے مطابق برطانیہ کے چیف جسٹس نے بھی آرچ بشپ آف کنٹربری کے اس موقف کی تائید کردی ہے۔......

(روزنامہ اسلام، لاہور......۱۷جنوری ۲۰۰۹ء)

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کا انتقال

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی کے جانشین اور جمعیۃ علماء ہند کے سربراہ حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی گزشتہ روز انتقال کر گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ گزشتہ تین ماہ سے کومہ میں تھے اور کافی عرصہ بستر علالت پر رہنے کے بعد کم و بیش ۸۰ برس کی عمر میں اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی برصغیر پاک و ہند بنگلہ دیش کی ممتاز شخصیات میں سے تھے جنہیں برطانوی استعمار کے خلاف اس خطہ کے عوام کی تحریک حریت میں علامت کی حیثیت حاصل ہے اور جن کے تذکرہ کے بغیر جدوجہد آزادی کا کوئی باب مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ بیک وقت بلند پایہ محدث اور بلند نسبت روحانی پیشوا ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی متحرک سیاسی راہ نما اور تحریک آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ اور انہیں یہ منفرد اعزاز حاصل تھا کہ انہوں نے کم و بیش سترہ برس حرم نبویؐ میں بلکہ مسجد نبوی میں **"قال اللّٰہ تعالی وقال رسول الله صلی اللّٰہ علیه وسلم"** درس دیا اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے استاذ محترم شیخ الہند حضرت مولا نا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز بڑھاپے میں اپنے وطن کی آزادی اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے سرگرم عمل ہیں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے قافلہ عزیمت میں شامل ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی مالٹا جزیرہ میں محبوس ہو گئے۔

حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے جب متحدہ ہندوستان کے علماء کرام کی اس وقت کی سب سے بڑی جماعت جمعیۃ علماء ہند کی قیادت سنبھالی تو استخلاص وطن اور حریت قومی کے لیے پرامن سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت تحریک آزادی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حضرت مدنی نے اس جرأت و حوصلہ اور عزیمت و استقامت کے ساتھ تحریک آزادی میں علماء

حق کی قیادت کی کہ جمعیۃ علماء ہند نے حریت پسند جماعتوں کی صف اول میں نمایاں مقام حاصل کر لیا بلکہ ہراول دستہ کا کردار ادا کیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے سب سے پہلے ایک سیاسی فورم سے ۱۹۲۶ء سے ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ کر کے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا جبکہ انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں آزادی کامل کو اپنا ہدف بنایا اور آل انڈیا مسلم لیگ کو اس مطالبہ اور مشن تک پہنچتے ہوئے مزید دس سال لگ گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اعزاز بلاشبہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور ان کے رفقاء کی فراست وبصیرت اور عزیمت واستقامت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

برصغیر کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کی قیادت میں جمعیۃ علماء ہند نے عملی سیاست سے کنارہ کشی کر لی اور تعلیمی، سماجی اور رفاہی کاموں میں مسلمانوں کی راہنمائی کو اپنا مشن بنالیا۔ تقسیم کے نتیجے میں بھارت میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کو جن شدید مشکلات اور سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان کے حل اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے حضرت مدنی اور حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ کی سربراہی میں جمعیۃ علماء ہند نے تاریخی کردار ادا کیا جو مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ کی وفات کے بعد بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کے معاشرتی وقار، دینی اقدار کے تحفظ اور ترقی کے لیے شب وروز مصروف عمل یہ محاذ شاید ٹھنڈا پڑ جائے گا اور اب اس سطح کی کوئی شخصیت سامنے نہیں آسکے گی جو ملک گیر سطح پر مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ اور ان کی تعلیمی وسماجی ترقی کے لیے اس جرأت واستقامت کے ساتھ سرگرم عمل ہو۔ مگر حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کچھ اس شان سے اس میدان میں آگے بڑھے کہ امیدوں کی ٹمٹماتی شمعیں پھر سے روشن ہونے لگیں اور دم توڑتے حوصلوں میں ایک بار پھر زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ وہ ایک متحرک سیاسی راہنما تھے اور ہر کام وقت پر کرنے کے عادی تھے۔ سیاسی مذہبی اور مسلکی معاملات پر ان کی نظر یکساں رہتی تھی اور کسی اہم مسئلہ میں صرف نظر سے کام لینا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھارت کے رہنے والے مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس مسئلہ کا سامنا تھا وہ

فرقہ وارانہ فسادات کا تھا۔ کہیں بھی فرقہ وارانہ عصبیت کی چنگاری بھڑکتی تو اس علاقے میں مسلمانوں کے جان و مال خطرے میں پڑ جاتے۔ ایسے میں اس علاقے میں جانا، مسلمانوں کو حوصلہ دینا، ان کی امداد و بحالی کے کاموں کی نگرانی کرنا، فرقہ پرستوں کو لگام دینے کی جدوجہد کرنا اور حکام کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے پر مجبور کرنا، سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ کا یہ کام ہوتا تھا کہ جہاں اس قسم کے فسادات ہوتے وہ تمام تر خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود وہاں پہنچ جاتے اور تمام متعلقہ امور اپنی نگرانی میں طے کراتے۔ پھر یہ جگہ حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی نے سنبھال لی اور خود کو ان کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ بھارت کے کسی بھی حصے میں مسلمانوں پر کوئی گرفت آتی اور کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا، وہاں کے لوگوں کو یہ یقین ہوتا تھا کہ اور کوئی آئے یا نہ آئے، ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی ضرور آئیں گے اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔

میں نے مختلف مواقع پر انہیں دیکھا ہے، دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر میں نے حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی کو خود ان کے دیوبند کے گھر میں دیکھا، پاکستان میں متعدد بار تشریف آوری پر ان کی زیارت و ملاقات شرف حاصل کیا، اور برطانیہ کے بہت سے اجتماعات میں ان کے ساتھ شرکت کی۔ سچی بات ہے کہ اپنے معمولات و اوقات کا ان سے زیادہ پابند میں نے اور کوئی شخص نہیں دیکھا۔ میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ وہ جب تک مصروفیات کے دائرے میں رہے اپنے معمولات و اوقات کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مگر حضرت والد صاحب کی مصروفیات کی جولانگاہ گکھڑ اور گوجرانوالہ تک محدود رہی ہے اور سفر کا موقع کبھی کبھی آتا تھا۔ جبکہ حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی کی جولانگاہ میں بھارت، بنگلہ دیش، برطانیہ، امریکہ، جنوبی افریقہ اور پاکستان سمیت بہت سے دوسرے ممالک شامل تھے۔ اور شاید ہی کوئی سال ایسا ہوتا جب وہ ان ممالک کا دورہ نہ کرتے، ان طویل اسفار میں اپنے نظام الاوقات کی پابندی کرنا اور معمولات کو بلا ناغہ نبھاہنا مولانا اسعدؒ مدنی کا ہی کام تھا۔

میں نے برطانیہ کے اسفار میں دیکھا کہ ان کے سفر کے آغاز سے قبل ہی ان کے سفر کا سارا شیڈول طے ہوجاتا تھا اور طبع ہوکر متعلقہ حضرات تک پہنچ جاتا تھا۔ پروگراموں کی گھنٹوں کے حساب سے تقسیم ہوتی، ایک دن میں درجنوں پروگرام ہوتے اور سارے پروگرام اپنے اپنے وقت پر نمٹ جاتے اور اس معاملہ میں وہ کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ اور ایسا ممکن نہیں ہوتا تھا کہ پروگرام کا وقت حرج ہو رہا ہو اور وہ کسی اور پروگرام میں میزبانوں کے ساتھ مروت کی وجہ سے وقت حرج کر رہے ہوں۔ گھڑی دیکھتے رہتے، وقت پر اٹھ کھڑے ہوتے اور پھر انہیں کسی کام کے لیے روکنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ان کے اس عمل کا میں نے بارہا مشاہدہ کیا اور ہر بار اس حوالہ سے ان کے ساتھ عقیدت اور رشک کے جذبات میں اضافہ ہوا۔ ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسٰی منصوری بسا اوقات حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی کی بعض خصوصیات کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں، ایک بار کہنے لگے کہ میں نے مولانا اسعدؒ مدنی میں دو خوبیاں ایسی دیکھی ہیں جو کسی دوسرے دینی یا سیاسی راہ نما میں مجھے نظر نہیں آئیں۔

ایک یہ کہ ان کی خوراک انتہائی سادہ رہی ہے اور وہ اس معاملہ میں اکثر قناعت پسند رہتے ہیں، میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے ہیں اور پر تکلف ماکولات موجود ہیں مگر مولانا اسعدؒ مدنی اپنے سامنے پڑی ہوئی کوئی ڈش اٹھائیں گے اور اسی سے کھانے لگیں گے، اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔

مولانا منصوری کہتے ہیں کہ دوسری بات جو میں نے مولانا اسعدؒ مدنی میں بطور خاص محسوس کی وہ ان کی مستعدی اور چابک دستی ہے۔ وہ بروقت فیصلہ کرتے ہیں اور اس پر بروقت عمل بھی کر گزرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بسا اوقات اکیلے کئی جماعتوں پر بھاری ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ کسی علاقے میں کوئی مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے، دوسری جماعتیں اس کے بارے میں مشورہ کر رہی ہیں، پروگرام بنا رہی ہیں اور اپنے موقف کے منظم اظہار کی تیاریاں کر رہی ہیں کہ اچانک مولانا اسعدؒ مدنی کسی جانب سے وہاں پہنچ جاتے ہیں، اپنے حلقہ کا اجتماع یا پریس کانفرنس کر کے اپنا موقف اور پروگرام پیش کر کے آگے چل دیتے ہیں اور دوسری جماعتیں دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی ہیں۔

مولانا سید اسعدؒ مدنی نے جمعیۃ علماء ہند کی تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور رفاہی جدوجہد میں جو نئے رنگ بھرے وہ بلاشبہ ان کے صدقات جاریہ ہیں۔ انہوں نے غریب مسلمانوں کو چھوٹے موٹے کاروبار اور شادی بیاہ جیسے معاملات میں ناگزیر ضروریات کے بلاسود قرضے فراہم کرنے کی غرض سے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ایک فنڈ قائم کیا جس کے بعد اسی طرز کے بہت سے دیگر فنڈز بھی قائم ہوئے اور ایک وسیع کار خیر کا آغاز ہوگیا۔ انہوں نے دینی مدارس کے تحفظ و ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمان بچوں کو عصری تعلیم اور فنون سے آراستہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو توجہ دلائی اور بہت سے مقامات پر اس کا عملی اہتمام بھی کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی سماجی بہبود اور فلاح کے لیے متعدد کام شروع کیے اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔

حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی سیاست میں ہمیشہ کانگریس کے ساتھ رہے اور ان کی طرف سے ایوان بالا کے ممبر بھی رہے۔ وہ دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ بھارت کے معروضی حالات میں کانگریس مسلمانوں کے لیے بہتر پلیٹ فارم ہے اور وہ سیاسی معاملات میں کانگریس ہی کے فورم سے ہمیشہ متحرک رہے۔ مولانا اسعدؒ مدنی بھارت کے مسلمانوں کے لیے اپنے عظیم والد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے جانشین تو تھے ہی مگر میرے جیسے تاریخ کے طالب علم کے لیے وہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کے جانشین بھی تھے۔ اب یہ دونوں نسبتیں ہم سے رخصتیں ہوگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ورثاء و متعلقین کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق دیں اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(فروری ۲۰۰۶ء)

دیوبندیت: ایک عالمی فکری تحریک

روزنامہ اسلام لاہور ۱۰ ستمبر ۲۰۱۱ء کی ایک خبر کے مطابق بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ''عالمگیر دیوبندیت اور تبلیغی جماعت'' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا، معروف جرمن اسکالر اور کراس روڈ ایشیا پروجیکٹ (زنیٹرم ماڈرنر اوریئنٹ) کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈائرچ ریٹز نے سیمینار کے موضوع کے حوالہ سے خطاب کیا۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر ممتاز احمد، نائب صدر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی صاحبزادہ ساجد الرحمان سمیت اساتذہ، انتظامی افسران، ملازمین اور طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ڈاکٹر ڈائرچ ریٹز نے سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دارالعلوم دیوبند اب محض بھارت کے ایک شہر میں قائم ایک مدرسے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر تحریک بن چکا ہے جس کے مختلف مظاہر جنوبی ایشیا ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دیوبندیت اب ایک اصلاحی تحریک سے آگے بڑھ کر ایک مذہبی اور سیاسی شناخت بن چکی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ برصغیر کے اندر اور باہر دیوبندیت کے فروغ میں تبلیغی جماعت نے بہت اہم کردار ادا کیا اور اس کا سارا کریڈٹ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کو جاتا ہے۔ دیوبندیت اور بریلویت دونوں عالمی تحریکیں ہیں لیکن ان کے درمیان یہ امتیاز ہے کہ دیوبندیت صرف برصغیر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان ہی محدود نہیں بلکہ تبلیغی جماعت کے ذریعے وہ دوسری نسلی اور قبائلی اکائیوں تک بھی پہنچ گئی ہے جبکہ بریلویت ابھی تک صرف برصغیر سے تعلق رکھنے والے لوگوں تک محدود ہے۔ انہوں نے کہا کہ دیوبندی تحریک کے مدارس پوری دنیا میں تیزی سے پھیل رہے ہیں بالکل اسی طرح جیسے وہ برصغیر میں سب سے زیادہ ہیں۔''

ڈاکٹر ڈائرچ ریٹز معروف جرمن اسکالر اور دانشور ہیں جو ایک عرصہ سے برصغیر پاکستان، انڈیا

اور بنگلہ دیش کے علمی حلقوں اور مذہبی مکاتبِ فکر کے حوالہ سے تحقیقی کام کر رہے ہیں، انہوں نے اپنے مذکورہ بالا خطاب میں موجود عالمی تناظر میں دیوبندی مکتبِ فکر کے کردار کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ ان کی حقیقت پسندی کی علامت ہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے بقول دیوبند کے قصبہ میں ۱۸۶۶ء کے دوران مدرسہ عربیہ کے نام سے جو مدرسہ قائم کیا گیا تھا اس کا بنیادی مقصد ۱۸۵۷ء کے نقصانات کی تلافی تھا۔ یعنی جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تسلط اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد جو صورتحال پیدا ہوگئی تھی اور کم وبیش ایک ہزار سے چلے آنے والے مسلمانوں کے نظام حکمرانی اور معاشرتی ماحول کو اتھل پتھل کر کے برطانوی استعمار نے اپنے تہذیبی غلبہ کے لیے جو یلغار کی تھی، اس سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ دینی درسگاہ وجود میں آئی تھی۔ اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دیوبند نے نہ صرف برصغیر میں اس فکر کی آبیاری کی بلکہ جرمن دانشور کے بقول اب وہ پوری دنیا میں عالمی سطح پر حریت واستقلال اور اسلامی تہذیب وثقافت کی بالادستی کے فکر کی قیادت کر رہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے صرف تعلیمی اور روحانی دنیا میں ہی مسلمانوں کی راہنمائی نہیں کی بلکہ وہ فکر وسیاست اور تہذیب وثقافت کی دنیا میں بھی امت مسلمہ کے ایک بڑے حصے کا بھی راہنما ہے اور اس کے اس کردار کو آج کی دنیا میں کھلے دل سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔

دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ سے ہماری گزارش ہے کہ وہ جرمن دانشور کے اس تجزیہ کو سامنے رکھتے ہوئے دیوبند اور دیوبندیت کے اس ہمہ جہت کردار کا مطالعہ کریں اور امت مسلمہ کی علمی، دینی، روحانی، فکری اور ثقافتی ضروریات کے وسیع تر تناظر میں اکابر علماء دیوبند کی فکری تحریک کا ادراک حاصل کر کے اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کی صورت گری کا اہتمام کریں۔ کیونکہ دنیائے اسلام میں آنے والا دور اسی ولی اللّٰہی اور دیوبندی فکر کی راہنمائی کا دور ہے البتہ ہمارے لیے غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ہم دیوبند سے نسبت رکھنے والے دینی مدارس ومراکز اس ضرورت کے احساس سے بہرہ ور ہیں اور اس کے لیے کسی بھی درجہ میں کوئی تیاری کر رہے ہیں؟

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ...... اکتوبر ۲۰۱۱ء)

آل انڈیا مسلم کمیٹی کا ایک اقدام

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۳ دسمبر ۲۰۱۱ء کی ایک خبر کے مطابق بھارت کی ایک مسلمان تنظیم ’’آل انڈیا مسلم کمیٹی‘‘ نے ایک معروف پاکستانی اداکارہ کی شرمناک حرکات کے باعث اسے مسلم کمیونٹی سے خارج قرار دے کر بھارتی مسلمانوں سے اس کے سماجی بائیکاٹ کی اپیل کی ہے، کمیٹی کے بیان کے مطابق پاکستانی اداکارہ کی قابل اعتراض اور نازیبا تصاویر اور ریئلٹی شو میں نکاح کی توہین کا رویہ اسلامی معاشرے میں منفی رجحانات کو فروغ دے سکتا ہے۔

مذکورہ پاکستانی اداکارہ کی اس قسم کی حرکات وقتاً فوقتاً اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بدنامی کا بھی باعث بنتی رہتی ہیں اور دینی حلقے اس پر مسلسل احتجاج کرتے رہتے ہیں، کچھ عرصہ قبل اس اداکارہ کی بالکل عریاں تصویر ایک جریدہ میں شائع ہونے کے بعد مسلمانوں میں غصہ ونفرت کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی ہے اور مختلف حوالوں سے اخبارات و جرائد میں اس پر ردعمل کا اظہار ہورہا ہے، خاص طور پر بھارتی مسلمان ان حرکات پر بہت ناراض ہیں جس کی ایک ہلکی سی جھلک ’’آل انڈیا مسلم کمیٹی‘‘ نامی تنظیم کے اس اعلان کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اداکارہ کی یہ حرکت تو بے شرمی کی ایک انتہا ہے مگر اس سے ملتی جلتی اور اس انتہا تک لے جانے والی بہت سی حرکات بعض دیگر پاکستانی اداکاروں اور اداکاراؤں کی طرف سے بھی بیرونی ممالک میں وقتاً فوقتاً دیکھنے میں آتی رہتی ہیں جو اسلامی اور مشرقی تہذیب کے منافی اور کسی بھی مسلمان کے لیے باعث شرم ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ:

☆ حکومت پاکستان کی پالیسیاں اور اسلامی اقدار و روایات کے حوالہ سے اس کا تذبذب کا رویہ ہے جو بے حیائی اور بے شرمی کی ان حرکات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، حالانکہ دستور

پاکستان میں اسلامی تہذیب وثقافت اور اسلامی روایات واقدار کے تحفظ کو حکومت کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

☆ جبکہ ہمارے مقتدر دینی حلقوں کی نرم روی اور نظر انداز کر دینے کی پالیسی بھی اس بے حیائی کے فروغ کا باعث ہے، کیونکہ جو دینی جماعتیں مقتدر سیاسی حلقوں میں اثر ورسوخ رکھتی ہیں، وہ اگر اسے ایک ''مسئلہ'' سمجھ کر حکمرانوں کو اپنے رویہ پر نظر ثانی پر مجبور کریں تو بہت سی باتوں کو روکا جا سکتا ہے اور کسی حد تک ان شرمناک حرکات کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے، مگر ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کی کسی حرکت کے سامنے آنے پر دو چار تیز قسم کے بیانات اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اور چند کالم اور مضامین شائع ہو جاتے ہیں پھر اس کے بعد معاملہ ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے، یہ بات قطعی طور پر ناکافی ہے۔ ہم جس طرح دیگر بعض معاملات میں منظّم عوامی احتجاج اور ایوان حکومت میں اثر ورسوخ کے استعمال کا اہتمام کرتے ہیں، اسے بھی اگر ایک مسئلہ سمجھ کر ڈیل کریں تو بے حیائی کی اس تیز رفتار پیشرفت کو کسی حد تک روکا جا سکتا ہے۔

اسی لیے ہم حکومت پاکستان اور پاکستان کے دینی حلقوں سے یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلامی ثقافت و روایات کے تحفظ کے لیے سنجیدگی کے ساتھ کوئی مضبوط لائحہ عمل اختیار کریں۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ......جنوری ۲۰۱۲ء)

بھارتی وزیر داخلہ پی چدمبرم کے خیالات

روزنامہ ’’اردو نیوز‘‘ جدہ میں ۱۴ جولائی ۲۰۱۲ء کو شائع ہونے والی ایک خبر ملاحظہ فرمایئے:

’’بھارتی وزیر داخلہ پی چدمبرم نے کہا ہے کہ جمہوریت میں پنچایت یا فتوے کے ذریعے بندشوں کے نفاذ اور کسی کی نجی آزادی سلب کرنے کے اقدام کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات وزیر داخلہ نے جمعہ کے روز ایک پریس کانفرنس میں کہی، ان سے دہلی سے ملحق باغپت کی ایک پنچایت کے فیصلے کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ باغپت کی ۲۶ برادریوں کی ایک پنچایت نے علاقے کے مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ شام کے وقت ۴۰ سال سے کم عمر کی مسلم عورتیں یا لڑکیاں بازار میں نہ نکلیں اور اگر نکلیں تو ساتھ موبائل نہ رکھیں اور سر ڈھک کر چلیں۔‘‘

پی چدمبرم کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی علاقہ کی پنچایت یا کوئی مفتی صاحب مسلمان خواتین کو کوئی ایسی تلقین کریں جو مغربی جمہوریت یا اس کی پیدا کردہ مادر پدر آزادی کے منافی ہو تو یہ ان کی ’’نجی آزادی سلب‘‘ کرنے کے مترادف ہے جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ آزادیوں اور بندشوں کی حدود طے کرنے اور اس سلسلہ میں کسی طرز عمل سے روکنے میں نہ علاقائی روایات کا کوئی حق باقی رہ گیا ہے اور نہ ہی مذہب کے عمل دخل کو کسی درجہ میں تسلیم کیا جارہا ہے۔

بھارتی مسلمانوں کو درپیش مسائل میں ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی معاشرتی اقدار اور تہذیبی روایات کے تحفظ کے لیے مذہب کا نام لیتے ہیں تو اسے فرقہ پرستی کا طعنہ دے کر دبانے کی

کوشش کی جاتی ہے۔ اور صرف بھارت میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک حتی کہ بہت سے مسلم ممالک میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے کہ جو لوگ دین اور مذہب کی بنیاد پر معاشرتی اقدار و روایات کا تحفظ چاہتے ہیں وہ بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کے الزامات کا نشانہ بنتے ہیں اور نئی تہذیب کے مخالف قرار پاتے ہیں۔ لیکن نئی تہذیب کے علمبرداروں کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ اپنی خودساختہ روایات واقدار کو ہر جگہ وہاں کی علاقائی ثقافت اور لوگوں کے عقیدہ و دین کے علی الرغم مسلط کرنے کی کوششوں میں آزادی پسندی اور ترقی پسندی کے عنوان سے مسلسل سرگرم ہیں۔

مغربی جمہوریت اور سیکولر ثقافت کے علمبردار ایک طرف تو ثقافتوں اور مذاہب کے احترام کی بات کرتے ہیں اور انہیں تحفظ فراہم کرنے کے دعوے کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف لوگوں کو علاقائی دائروں میں بھی اپنی ثقافت اور مذاہب کی پاسداری کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، کیا اسی کا نام آزادی ہے اور کیا یہی حقوق کا تحفظ ہے؟

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... ستمبر ۲۰۱۲ء)

ایمانی اور علمی پختگی سے حالات کا مقابلہ

بھارت کی انتہا پسند ہندو تنظیم ’’آر ایس ایس‘‘ کے لیڈر رام مادھو کی طرف سے انڈیا میں رہنے والے مسلمانوں سے تقاضا کیا گیا ہے کہ

’’وہ غیر مسلموں کو کافر نہ کہیں، خود کو عالمی مسلم اُمہ کا حصہ سمجھنا ترک کر دیں، اور نظریۂ جہاد سے خود کو الگ کر لیں‘‘۔

یہ تقاضا کوئی نیا نہیں ہے اور نہ صرف بھارتی انتہا پسندوں کا یہ مطالبہ ہے، بلکہ آج کے عالمی سیکولر حلقوں کا بھی مسلمانوں سے یہی مطالبہ ہے۔ اس کی بنیاد صرف وطنیت پر نہیں بلکہ انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں آسمانی تعلیمات سے لاتعلقی اور تمام قومی و معاشرتی معاملات کو طے کرنے کے لیے علاقائی معاشرتی مزاج اور خواہشات کو بنیاد بنانے کے اصول سے منسوب ہے، جسے قرآن کریم نے ’’**ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس**‘‘ (وہ محض وہم اور اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔ النجم ۲۳) سے تعبیر کیا ہے اور اس کی نفی کرتے ہوئے ’’**ولقد جائھم من ربھم الھدٰی**‘‘ (حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کے ہاں سے ہدایت آچکی ہے۔ النجم ۲۳) کا فطری قانون سب کے سامنے رکھا ہے۔

انڈیا میں چونکہ وطنیت کو ہی تمام امور کی اساس قرار دینے کے ہندو فلسفہ میں مسلمانوں کی کشمکش عملاً صدیوں سے چلی آرہی ہے، اس لیے یہاں یہ بات زیادہ شدت اور سنگینی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ عالمی سطح پر اس کشمکش کا تناظر یہ ہے کہ مغرب اپنے فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کو پوری انسانیت کے لیے حتمی معیار قرار دیتے ہوئے، دنیا بھر میں اس کے غلبے اور تمام تر مذہبی و علاقائی ثقافتوں کو روندتے چلے جانے کے لیے ہر حربہ اختیار کر رہا ہے۔ مگر جب یہی بات آسمانی تعلیمات

کا فائنل ایڈیشن اسلام کے عنوان سے کہتا ہے کہ انسانی فلاح و بہبود اور نجات و کامیابی کا واحد معیار آسمانی تعلیمات ہیں تو ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس کی پیروکار قوتیں ہر جگہ اسے کسی قسم کے معاشرتی کردار کا موقع دیئے بغیر ہر حال میں روکنے اور کچل دینے پر تلی بیٹھی ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات کو اپنے فائنل ایڈیشن اسلام کی صورت میں دنیا میں کسی جگہ بھی آزادی کے ساتھ معاشرتی کردار ادا کرنے کا موقع مل جائے تو مغربی فلسفہ و نظام کے لیے اس کا سامنا کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اسی خوف سے نہ صرف مغرب بلکہ اپنے محدود تصورات وافکار کو دنیا پر غالب کرنے کا خواہشمند ہر طبقہ اسلام دشمنی کا علمبردار بنا ہوا ہے۔ بھارت میں یہ صورتِ حال قدرے مختلف ہے کہ یہاں اسلامی فلسفہ وثقافت پر یلغار کا پرچم ہندو مذہب کے انتہا پسندوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ مسلمانوں کو اسلام کی آفاقی تعلیمات اور فطری قوانین و احکام پر عمل سے روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

ہمیں اس سلسلے میں بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی اجتماعی سوچ اور اپنے عقیدہ وثقافت کے تحفظ کے لیے ان کی جدوجہد میں ان کا معاون بننا چاہیے۔ معروضی حالات وظروف کا لحاظ رکھتے ہوئے، سنجیدگی کے ساتھ ان کی علمی واخلاقی مدد کرنا چاہیے۔ مسلمانوں پر اسی قسم کی آزمائشیں اور چیلنجز تاریخ کے مختلف ادوار میں سامنے آتے رہے ہیں، جن کا سامنا عقیدہ وایمان پر پختگی، استقامت، حوصلہ اور حکمت وتدبر کے ساتھ کرنے والے ہمیشہ سرخرو رہے ہیں اور اب بھی ان شاء اللہ العزیز ایسا ہی ہوگا۔ اگرچہ بظاہر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید یہ دور زیادہ سنگین اور کہیں زیادہ صبر آزما ہے۔ اللہ تعالیٰ بھارت بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس میں باوقار سرخروئی سے بہرہ ور فرمائے، آمین یارب العالمین!

(ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن، لاہور......اگست ۲۰۲۲ء)

بھارتی عدالتوں کے رجحانات

مسلمان لڑکے اور ہندو لڑکی کی شادی

ہفت روزہ وزارت گوجرانوالہ نے ۲۴ اپریل ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں ’’آن لائن‘‘ کے حوالہ سے یہ خبر دی ہے کہ ممبئی بھائی ہائیکورٹ نے مسلمان لڑکے اور ہندو لڑکی کی شادی کو جائز قرار دے دیا ہے۔ خبر کے مطابق مسلمان لڑکے عمر اور ہندو لڑکی پرانیکا کی شادی کو پرانیکا کے خاندان والوں نے قبول نہیں کیا اور اس شادی کے خلاف ہندو تنظیموں بجرل دل اور آر ایس ایس نے ممبئی ہائیکورٹ میں مقدمہ درج کرا دیا، جس میں ان کا موقف یہ تھا کہ عمر نے پرانیکا کو اغوا کیا ہے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان شادی نکاح کا معاملہ صرف بھارت میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر اس وقت خاندانی نظام کا ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر میں کہا گیا ہے کہ کوئی بھی بالغ مرد اور عورت رنگ، نسل یا مذہب کی کسی بھی تفریق کے بغیر آپس میں شادی کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اسی بنیاد پر اسلام کے خاندانی نظام کے ان قوانین کو غیر انسانی قرار دیا جاتا ہے جن میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان شادی اور رشتوں کی ممانعت کی گئی ہے۔ بھارت میں یہ مسئلہ اس لحاظ سے زیادہ شدت اختیار کیے ہوئے ہے کہ وہاں ہندو، سکھ، پارسی، بدھ اور مسیحی وغیرہ آپس میں شادیاں اور رشتے کر رہے ہیں مگر مسلمان اس کے لیے تیار نہیں ہیں جس کی وجہ سے ان پر الزام ہے کہ وہ بھارت کی سیکولر قومیت کو قبول نہیں کر رہے اور اپنا خاندانی تشخص الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ بحمد اللہ تعالیٰ بھارت کے مسلمانوں کی اکثریت اس سلسلہ میں اپنے دینی تشخص اور موقف پر قائم ہے اور ’’کامن سول کوڈ‘‘ کے نام سے سول سوسائٹی میں ضم ہو جانے کے پروہ آمادہ نہیں ہے جس کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے عنوان سے تمام مذہبی مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر متحد ہو کر جدوجہد کر رہے ہیں۔

اس قسم کی صورتحال پاکستان میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور بہت سی این جی اوز کی طرف سے مذہبی امتیاز کے قوانین ختم کرنے کے جو مطالبات وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہتے ہیں ان کا ایک حصہ یہ مطالبہ بھی ہوتا ہے کہ خاندان اور شادی کے معاملات میں مذہب کی بنیاد پر فرق و امتیاز قائم کرنے والے قوانین ختم کیے جائیں۔ ان حالات میں اسلام کے خاندانی نظام اور شرعی احکام قوانین کو اور زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور خاص طور پر دینی تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ معروضی صورتحال پر گہری نظر رکھتے ہوئے نئی نسل اور عام مسلمانوں کی ذہن سازی اور دینی راہنمائی کا اہتمام کریں۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ...... مئی ۲۰۰۷ء)

عورت کی ملازمت:
فطرت کے اصولوں کوملحوظ رکھا جائے

بھارتی اخبارات میں ان دنوں عورت کے حوالے سے تین موضوعات پر بطور خاص بات ہو رہی ہے اور مختلف اطراف سے ان پر اظہارِ خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

اسقاطِ حمل کا رجحان

ایک عنوان یہ ہے کہ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے یہ معلوم ہونے پر کہ پیدا ہونے والا بچہ صنف نازک سے تعلق رکھتا ہے ہزاروں حمل گرا دیے جاتے ہیں، اور اسقاط حمل کے تناسب میں مسلسل اضافے نے سنجیدہ حضرات کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ گزشتہ دنوں دہلی کے ایک اخبار میں اس سلسلے میں ایک سیمینار کی رپورٹ نظر سے گزری جس میں کہا گیا ہے کہ بچی کی پیدائش کو عام طور پر معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم کر کے اگر حمل بچی کا ہو تو اسے گرا دیا جاتا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں معصوم بچیاں اس ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔

اسلام سے پہلے عرب کے جاہلی معاشرے میں بھی یہ رواج عام تھا جس کا قرآن کریم میں ذکر موجود ہے۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اس وقت لڑکیوں کو ولادت کے بعد زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور ہزاروں لڑکیاں اس ظلم کا شکار ہوتی تھیں جس کی دو وجہیں قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ لڑکی کی پیدائش کو باعثِ عار سمجھا جاتا تھا، اور دوسری وجہ یہ کہ انہیں خاندان پر معاشی بوجھ تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کی مکمل ممانعت کی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے

ساتھ اس مکروہ رواج کو ختم کیا۔ مگر آج کے جدید معاشرے میں بچے کو ولادت کے بعد زندہ دفن کرنے کی جگہ ولادت سے قبل اسقاطِ حمل نے لے لی ہے۔ اور نہ صرف بھارت میں بلکہ مغربی دنیا میں بھی اس کا چلن عام ہے، بلکہ اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں کے ذریعے دنیا بھر کے ملکوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے ہاں اسقاطِ حمل کو قانونی جواز فراہم کریں۔

مغرب میں اسقاطِ حمل کی کثرت کی وجہ سے یہ ہے کہ وہاں زنا عام ہے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کی کفالت سے بچنے کے لیے اسقاطِ حمل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ گویا یہ قرآن کریم کی زبان میں خشیۃ املاق یعنی معاشی بوجھ کی ایک صورت ہے جس کی وجہ سے ہزاروں بلکہ لاکھوں بچے ماں کی کوکھ سے پیدا ہونے سے پہلے ہی موت کی نیند سلا دیے جاتے ہیں اور اس میں لڑکی یا لڑکے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ بھارت میں صرف بچیوں کے حمل گرائے جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بچیوں کی ولادت کو عار یا معاشی بوجھ سمجھا جاتا ہے۔

شادی کے بغیر جنسی تعلق

دوسری بحث بھارتی سپریم کورٹ کے تین جج صاحبان کے ان ریمارکس کے حوالے سے ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ شادی سے قبل لڑکے اور لڑکی کے درمیان جنسی تعلقات میں کوئی حرج نہیں، اور اگر جوڑا شادی کے بندھن کے بغیر جنسی تعلقات کے ساتھ اکٹھا رہنا چاہتا ہے تو اس میں کوئی گناہ یا حرج کی بات نہیں ہے۔

یہ بات بھی عرب جاہلیت کی ان اقدار میں سے ہے جنہیں جناب رسول اللہؐ نے ختم کیا تھا اور باقاعدہ نکاح کے سوا جنسی تعلقات کی باقی تمام صورتوں کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اسلام سے قبل عرب معاشرے میں رضامندی کا زنا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی مرد اور عورت باہمی رضامندی سے اس عمل کا ارتکاب کرتے تھے تو سوسائٹی کی طرف سے انہیں تحفظ فراہم کیا جاتا تھا اور بچہ پیدا ہونے کی صورت میں ان کا نسب بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس جاہلی روایت کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا اور قرار دیا کہ زنا ایک قبیح جرم ہے جس کا مرتکب سنگین سزا کا مستحق ہے اور آئندہ زنا کے عمل سے نسب کا ثبوت قانونی جواز کا درجہ حاصل نہیں کر سکے گا۔

عورت کی ملازمت اور کاروبار

تیسری بحث دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب ایک فتوے کے حوالے سے بھارتی اخبارات میں زوروں پر ہے جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحبان نے فتویٰ صادر کیا ہے کہ عورت ملازمت یا کاروبار نہیں کر سکتی اور اس کی کمائی ہوئی رقم حرام ہے۔ ہم نے جب اس فتوے کی بات سنی تو ذہن نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ تجارت کیا کرتی تھیں اور جناب رسول اکرمؐ کی ازواج مطہرات میں حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت زینبؓ اپنے گھر میں کام کرتی تھیں اور مختلف چیزیں تیار کر کے بازار میں فروخت کیا کرتی تھیں۔ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی ازواج مطہرات بھی تجارت اور حرفت کے کام کرتی تھیں اور کمائی کیا کرتی تھیں۔ اس لیے یہ بات تو کوئی عام سا مولوی بھی نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ دارالعلوم دیوبند جیسے ذمہ دار ادارے کے مفتی صاحبان یہ فتویٰ دیں۔

آج ایک ای میل کے ذریعے بھارت کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا عتیق الرحمان سنبھلی کا ایک وضاحتی بیان موصول ہوا تو معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ بیان قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بات کا بتنگڑ کیسے بنایا جاتا ہے:

> ’’جماعت دیوبند کے بزرگ عالم اور معروف دانشور و مصنف مولانا عتیق الرحمان سنبھلی (مقیم لندن) نے دارالعلوم دیوبند کے فتوؤں کے خلاف میڈیا کی حالیہ مہم کو نہایت غیر ذمہ دارانہ بلکہ معاندانہ قرار دیا ہے۔ مولانا نے اپنے ایک اخباری بیان میں جو آج دہلی سے جاری کیا گیا، کہا کہ دارالعلوم صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک اہم دینی و علمی مرکز ہے۔ میڈیا کے کچھ حلقے اور مسلم دشمن گروہ اس کو مستقل ایک بدنام کن مہم کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ مولانا نے دارالعلوم کے دفتر اہتمام سے فرمائش کر کے متعلقہ فتوؤں کی کاپی منگوا کر خود دیکھی اور صاف محسوس کیا کہ میڈیا نے توڑ موڑ کر بات کو پیش کیا ہے۔

مولانا کا کہنا ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے بعض اخبارات اور ٹی وی چینلز نے بالکل جھوٹ یہ بات نشر کی کہ دارالعلوم کی طرف سے عورت کی کمائی کو حرام کہا گیا ہے۔اس کے برعکس دارالعلوم کے فتوؤں میں صراحت ہے کہ ''کمائی پر حرام ہونے کا حکم نہیں''۔بعض فتوؤں میں یہ بھی صراحت ہے کہ ''عورت کے لیے کمانا ممنوع نہیں''۔ ہاں بجا طور پر شرعی لباس اور حیا کے تقاضوں کی پابندی کی شرط ہے۔

مولانا کا کہنا تھا کہ چونکہ اس زمانے میں دفتروں اور بازاروں کا ماحول نہایت بے حیائی کا ہے اور مغربی تہذیب وتعلیم نے ذہن ناپاک بنا دیے ہیں، دفتروں میں صنف نازک کے ساتھ زیادتیوں کے جس طرح کے واقعات عام ہیں اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے دارالعلوم کے فتوؤں میں خواتین کو بلاضرورت سروس کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ نہایت معقول بات ہے۔مولانا نے بڑا افسوس ظاہر کیا کہ بعض مسلمان بھی حقیقت جانے بغیر میڈیا کے خلافِ حقیقت پروپیگنڈا سے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند ہمارے عقیدے وتہذیب کی آخری دفاعی لائن ہے۔ مولانا نے مزید کہا کہ نہایت حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ ہمارے بعض اردو کے اخبارات بھی بسا اوقات اس مہم کا حصہ بن جاتے ہیں حالانکہ ان سے تو بجا طور پر یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ دارالعلوم سے رابطہ کر کے اصل حقیقت جان لیں اور فتوؤں کو ان کے صحیح تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کریں۔

مولانا نے پوری دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ یہ وقت دارالعلوم کی تائید وحمایت اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں اس کے راہنما کردار کو تقویت پہنچانے کا ہے، نہ کہ اسلام دشمن طاقتوں کے سامنے سپر اندازی کرنے کا۔''

اسلام نے عورت اور مرد کے میل جول کی حدود متعین کی ہیں اور پردے وحجاب کے ضابطے نافذ کیے ہیں جن کی پابندی بہرحال ضروری ہے۔ان حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے عورت

ملازمت بھی کر سکتی ہے، کاروبار بھی کر سکتی ہے اور جائز کمائی کے دیگر ذرائع بھی اختیار کر سکتی ہے جس کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی طبقہ ملازمت اور کاروبار وغیرہ کے جواز کے نام پر مرد اور عورت کے درمیان اس فطری فرق کی نفی کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد پر اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے قوانین میں فرق رکھا ہے تو فطرتِ سلیمہ کے طے کردہ اس فرق کو ختم کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی عملاً اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور......۲۳ مئی ۲۰۱۰ء)

سائنسی ایجادات: نعمت یا مصیبت؟

سہ روزہ ''دعوت'' نئی دہلی نے ۱۳ مئی ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں ''انڈین ایکسپریس'' ۵ مئی ۲۰۱۱ء کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ موبائل فون کا کثرت سے استعمال انڈیا میں طلاق کی شرح میں اضافے کا باعث بن رہا ہے اس لیے اس کے رجحان کو کم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ بھارتی پنجاب میں آئینی طور پر قائم ''خواتین کمیشن'' کی خاتون چیئرپرسن گورودیوکور سنگھ نے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ:

> ''تقریباً نوے فیصد نئے شادی شدہ مرد و عورت صرف اس لیے طلاق کا مطالبہ کرتے ہیں کہ لڑکا یا اس کے گھر والے سمجھتے ہیں کہ دلہن فون پر کسی دوسرے مرد سے بات کر رہی ہے جبکہ بیشتر معاملات میں حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سسرالی معاملات میں اپنے والدین سے مشورہ کر رہی ہوتی ہے۔ اس قسم کی غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ شادی شدہ خواتین خود کو سسرالی ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں اور ان کے ماں باپ ان کے معاملات میں کم از کم مداخلت کریں۔''

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

> ''نئی ازدواجی زندگی کے ایڈجسٹ ہونے میں کم از کم دو سال درکار ہوتے ہیں، اس دوران نئی شادی شدہ دلہنوں کو کچھ ایڈجسٹمنٹ کی کوشش کرنی چاہیے اور اس دوران اپنے والدین سے فون پر کم از کم رابطہ کرنا چاہیے۔''

موبائل فون بلاشبہ ایک بڑی سہولت اور نعمت ہے جس سے زندگی کے بہت سے پہلو آسان ہو

گئے ہیں لیکن اس کا ضرورت کے بغیر اور کثرت سے استعمال ایک عذاب اور مصیبت کی شکل بھی اختیار کرتا جا رہا ہے جس کی ایک جھلک مذکورہ بالا رپورٹ سے ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح الٹرا ساؤنڈ بھی ایک سہولت ہے جس سے عورت کے پیٹ میں بچے کی کیفیات معلوم کی جا سکتی ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ ماں کے رحم میں پرورش پانے والا وجود لڑکا ہے یا لڑکی، لیکن یہ سہولت بھی بھارت میں مصیبت اور عذاب کی شکل اختیار کر چکی ہے کہ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے یہ معلوم ہونے پر کہ لڑکی کی ولادت متوقع ہے اکثر حمل گرا دیے جاتے ہیں۔ سہ روزہ دعوت دہلی کی اسی اشاعت میں شامل ایک اور رپورٹ کے مطابق بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے اس بات کو پوری قوم کے لیے شرمناک قرار دیا ہے کہ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی شرح پیدائش مسلسل کم ہوتی جا رہی جس پر بھارت کے قومی حلقوں میں سخت تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

اسلام نے لڑکی کو قتل کرنے اور اس کی پیدائش پر ناپسندیدگی کے اظہار کو ''جاہلانہ رسم'' قرار دیا ہے اور اس کی سخت مذمت کی ہے۔ ابوداؤد شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے بیٹی دی اور اس نے اس کو قتل نہ کیا، اس کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی لڑکوں کو اس پر پرورش میں ترجیح دی، وہ جنت میں میرا اس طرح ساتھی ہوگا جس طرح ہاتھ کی دو درمیانی انگلیاں ہوتی ہیں۔

الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم ہو جانے کے بعد لڑکی کا حمل گرا دینا قتل کی ہی ایک صورت ہے جس کا سب سے بڑا باعث ''الٹرا ساؤنڈ'' بن رہا ہے۔ اس رپورٹ میں ایک بینر کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس پر ماں کے پیٹ میں ایک بچی حمل گرائے جانے کے خوف سے ڈاکٹر کے کلینک میں اسے کہہ رہی ہے کہ ''انکل ڈاکٹر! مجھے ایک موقع دیں، میں ماں سے زیادہ آپ کو فیس دوں گی''۔ یہ اس مسئلہ کی سنگینی کی انتہا ہے اور آج کے دور میں عورت کی مظلومیت کی ''ترقی یافتہ علامت'' ہے کہ اسے سرے سے زندگی کے حق سے ہی محروم کیا جا رہا ہے۔

یہ باتیں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سائنسی ایجادات بلاشبہ نعمت ہیں اور انسانی زندگی میں ان سے بڑی سہولتیں آئی ہیں، لیکن تصویر کا دوسرا رخ اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہے جس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔ یہ دور دینیات اور اخلاقیات کا نہیں بلکہ مادیات کا سمجھا جاتا ہے اور ہر معاملہ کو

کاروباری نظر سے دیکھا جا رہا ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں معاشرتی خرابیاں اور فساد کے اسباب بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ آج سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ سوسائٹی کو مادہ پرستی اور کاروباری ذہنیت سے نکال کر آسمانی تعلیمات اور انسانی اخلاقیات کی طرف لانے کی سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ جدوجہد کی جائے، اس کے بغیر سوسائٹی کو فساد اور تباہی کے اس طوفان سے بچانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ...... جون ۲۰۱۱ء)

بھارتی سپریم کورٹ اور رقص خانے

سہ روزہ ''دعوت'' نئی دہلی نے ۲۲ جولائی ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں بھارتی سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کے حوالہ سے خبر شائع کی ہے کہ:

''عدالت عظمیٰ نے بمبئی کے ان سینکڑوں رقص خانوں کو کھلوا دیا ہے جنہیں مہاراشٹر سرکار نے ۲۰۰۵ء میں یہ کہہ کر بند کروا دیا تھا کہ ان ''ڈانس بارز'' میں رقص و سرور کے نام پر جنسی ایکٹ (چکلے) چلائے جاتے ہیں، بے ہودہ اور فحش حرکات کی جاتی ہیں، رقاصائیں انتہائی اشتعال انگیز پوشاکوں میں لوگوں کے سامنے آکر بے شرمی کے مظاہرے کرتی ہیں جن سے تماش بینوں کی اخلاقیات پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ رقص خانے عام سوسائٹی میں بھی اخلاقی بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں، ان چیزوں پر جہاں دولت مند افراد اپنی دولت لٹا کر نفسیاتی تسکین کا سامان کرتے ہیں وہیں کم آمدنی والے افراد بھی ان میں ملوث ہو کر اپنے گھر اور خاندان برباد کر رہے ہیں۔ مہاراشٹر حکومت کے اس اقدام کے خلاف رقاصاؤں، ڈانس بارز کے مالکان اور شہری حقوق کے کچھ گروپوں نے بمبے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی تھی، کورٹ نے ۲۰۰۶ء میں ریاستی سرکار کے حکم کو کالعدم قرار دے دیا تھا، ریاستی سرکار نے اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا تھا جس نے ۱۶ جولائی کو اس کی اپیل مسترد کر کے ہائیکورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اس خبر سے بمبئی کے رقص خانوں کے مالکان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں رہا۔''

خبر کے مطابق رقص خانوں پر پابندی کے خلاف کورٹ میں جانے والوں نے جو موقف اختیار کیا اس میں کہا گیا ہے کہ:

''ان رقص خانوں سے ڈیڑھ لاکھ افراد کی روزی روٹی وابستہ تھی، جن میں پچاس ہزار رقاصائیں ہیں، ان میں بہت سی ایسی ہیں جو اپنے پورے خاندان کی کفالت کا واحد ذریعہ ہیں، ان کے بے روزگار ہو جانے سے ان کے گھروں میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی ہے، رقص خانوں کے دیگر کارکنوں اور ملازموں کا بھی یہی حال ہے، ان رقص خانوں کے ذریعے امیروں کی دولت کا کچھ حصہ ان غریبوں تک بھی پہنچ جاتا تھا اور اس طرح ان کی مدد ہو جاتی تھی۔''

جبکہ سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ بھارتی سپریم کورٹ نے بھی اس طرز استدلال کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے فیصلہ کا جواز یہ پیش کیا ہے کہ:

''یہ بدنصیب (عورتیں) محض زندہ رہنے کے لیے اس پیشے میں بحالت مجبوری داخل ہوئی ہیں۔''

یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ سب کچھ کسی مغرب زدہ این جی او کی کسی رپورٹ کا حصہ نہیں بلکہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کہلانے والے بھارت کی سپریم کورٹ کے باقاعدہ فیصلہ میں شامل ہے۔ اسی سے آج کی دنیا کی اخلاقی سطح اور نفسیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مغرب نے فرد کی آزادی کے نام پر آسمانی تعلیمات سے انحراف اور انسانی اخلاقیات سے روگردانی کا جو دروازہ کھولا تھا اس نے انسانی معاشرہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ کے اس فیصلے اور اس کے لیے دیے جانے والے دلائل کا مذہبی تعلیمات کے حوالہ سے جائزہ لیا جائے تو صرف اسلام نہیں بلکہ کوئی بھی آسمانی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا، حتٰی کہ ہندو مذہب اور معاشرت میں بھی اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، لیکن مذہب سے انحراف اور آسمانی تعلیمات سے بغاوت کا یہ ثمرہ ہے کہ بدکاری اور فحاشی کو روزگار اور کمائی کا ایک جائز ذریعہ تسلیم کر لیا گیا ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اسلام سے قبل جاہلیت کے دور میں بھی رقص و سرود اور بدکاری کمائی کا ایک جائز ذریعہ تصور

ہوتی تھی جسے اسلام نے بالکل ختم کر دیا تھا اور ان تمام رسوم و روایات کو جاہلیت قرار دے کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کو ان سے عملاً پاک کیا تھا۔ مگر یہ جاہلیت اب پھر لبرٹی، ثقافت اور حقوق کے نام پر سوسائٹی میں قدم جماتی جا رہی ہے۔ اس لیے اس بات کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات سے انسانیت کو پھر سے روشناس کرایا جائے کیونکہ اس کے سوا انسانی معاشرے کو اخلاق باختگی کی ان شرمناک روایات سے نجات دلانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ البتہ بھارتی سپریم کورٹ سے ہمارا سوال ہے کہ اگر ڈاکوؤں کے چند گروہ اس کے پاس یہ دلیل لے کر آئیں کہ ان کے اس عمل سے لاکھوں افراد کا روزگار وابستہ ہے اور وہ اپنے ڈاکہ کی کمائی سے بہت سے غریب خاندانوں کی مدد بھی کرتے ہیں اس لیے ان کے اس پیشہ کو روزگار کا ایک جائز ذریعہ قرار دیا جائے تو کیا بھارتی سپریم کورٹ وہاں بھی یہ کہہ دے گی کہ:

> ''یہ بدنصیب محض زندہ رہنے کے لیے اس پیشے میں بحالت مجبوری داخل ہوئے ہیں۔''

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ...... ستمبر ۲۰۱۳ء)

بھارتی سپریم کورٹ اور بچے کی ولدیت

ممتاز بھارتی کالم نگار ڈاکٹر وید پرتاب ویدک کے روزنامہ دنیا گوجرانوالہ میں ۲۱ جولائی ۲۰۱۵ء کوشائع ہونے والے کالم کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''بھارت کی سپریم کورٹ نے حال ہی میں ایک انقلابی فیصلہ دیا ہے، اس نے ایک غیر شادی شدہ والدہ کی اس اپیل کو قبول کرلیا ہے کہ اس کا بچہ اپنے والد کی بجائے اپنی والدہ کا نام لکھے، اب ایسے بچوں کو اپنے والد کا نام لکھنا بتانا ضروری نہیں ہوگا۔
>
> عدالت کا یہ فیصلہ پڑھتے ہی میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ہم سب بھارتی ہر جگہ اپنی ماں کا نام لکھیں؟ والد صاحب کا نام جنہیں لکھنا ہے ضرور لکھیں لیکن کسی بھی سرکاری اور غیر سرکاری دستاویز پر ماں کا نام لکھنا لازمی کیوں نہیں ہونا چاہیے؟ کسی بھی اولاد کے لیے والدین کا نام ہونا ضروری ہے لیکن والدہ کی حقیقت تو مستند ہوتی ہے، ہم حقیقت کے بدلے اندازے کو زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں؟''

کسی کی شناخت کے لیے باپ کی بجائے ماں کے نام کو کافی سمجھنا اور باپ کے نام کو غیر ضروری قرار دے دینا آج کی اس تہذیب وثقافت کا منطقی نتیجہ ہے جس کی بنیاد زنا کو قانونی جواز اور سماجی تحفظ فراہم کرنے پر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب معاشرہ میں نکاح کو ایک اضافی تکلف کا درجہ حاصل ہو جائے گا اور زنا کو جواز فراہم کر کے اسے نسب کے ثبوت کے تسلیم شدہ ذرائع میں شامل کرلیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ باپ کا تعین نہ صرف غیر ضروری سمجھا جائے گا بلکہ آج

کی دانش اسے حقیقت کی بجائے ''اندازہ'' قرار دینے میں عافیت محسوس کرنے لگے گی۔ اسلام نے ان دونوں باتوں کو تسلیم نہیں کیا، قرآن کریم کا حکم ہے ادعوہم لآباءہم بچے کو باپ کے نام سے ہی پکارو۔ اور صرف اس صورت میں اسے ماں کے نام سے پکارنے کی اجازت دی گئی ہے کہ جس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے اس کا خاوند اسے اپنا بچہ تسلیم کرنے سے عدالت میں انکار کر دے اور عدالت اس کا نسب اس باپ سے منقطع کرنے کا فیصلہ صادر کر دے، یا غیر شادی شدہ ماں کے بچے کے بارے میں عدالت اس قسم کا کوئی فیصلہ دے دے۔ ورنہ اسے عمومی قانون کے طور پر قبول کرنے کی اسلامی تعلیمات میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسی طرح جناب نبی اکرمؐ نے ''**الولد للفراش و للعاهر الحجر**'' فرما کر زنا کو نسب کا جائز سبب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ تمام تر خرابیوں اور مغربی تہذیب کی ہر طرح کی دخل اندازی کے باوجود مسلمانوں کا خاندانی نظام آج مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہے اور مغرب میں خاندانی نظام کے بکھر جانے پر پریشان مغربی دانش نے مسلمانوں کے خاندانی نظام کو رشک کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔ مغربی تہذیب نے مادر پدر آزادی کا جو ماحول گزشتہ دو صدیوں سے قائم کر رکھا ہے اس کے تلخ ثمرات رفتہ رفتہ سامنے آرہے ہیں اور وہ وقت آ پہنچا ہے کہ اس تہذیب کے نقصانات کو سماجی حقائق کے حوالہ سے واضح کیا جائے، مگر مشرقی دانش ابھی تک مرعوبیت کی فضا میں مبہوت کھڑی ہے اور اسے سماج کی بنیادوں پر کیا جانے والا وار بھی ''انقلابی فیصلہ'' دکھائی دے رہا ہے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ......اگست ۲۰۱۵ء)

بھارتی سپریم کورٹ میں تین طلاقوں کا مسئلہ

بھارتی سپریم کورٹ میں اس وقت ’’تین طلاقوں‘‘ کا مسئلہ زیر بحث ہے اور اس کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ تین طلاقوں کو جرم قرار دے دیا جائے اور انہیں قانونی طور پر تسلیم نہ کیا جائے۔ تمام مسلم مکاتب فکر کی مشترکہ نمائندہ تنظیم ’’آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ‘‘ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے موقف کا دفاع کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ میں دونوں طرف کے موقف کا خلاصہ دو خبروں کی صورت میں ملاحظہ فرمائیں جو چیف جسٹس جے ایس کیہر کی سربراہی میں کیس کی سماعت کرنے والے پانچ رکنی بینچ کے سامنے پیش کیے گئے۔

> ’’سینئر وکیل راج جیٹھ ملانی نے عدالت میں موقف اختیار کیا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا آئینی طور پر بھی مساویانہ حقوق پر حملہ ہے، بیک وقت تین طلاقیں دینے کا حق صرف شوہر کو حاصل ہے جو آئین کے آرٹیکل ۱۴ کی خلاف ورزی ہے۔ جیٹھ ملانی نے کہا کہ اس طرح طلاق دینے کا طریق کار بے رحمانہ اور قرآن کریم کے اصولوں کے بھی خلاف ہے جس کی کسی بھی صورت وکالت نہیں کی جاسکتی۔ تین طلاقوں سے متاثرہ خاتون کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ دنیا کا کوئی بھی قانون شوہر کی خواہش پر بیوی کو سابق بیوی بنانے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ لاقانونیت کی سب سے بڑی قسم ہے۔‘‘ (روزنامہ اوصاف لاہور۔ ۱۳ مئی ۲۰۱۷ء)

دوسری طرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے وکیل کپل سبل نے، جو کانگریس کے سینئر لیڈر بھی ہیں، عدالت میں اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ

''مسلمان گزشتہ چودہ سو برس سے اس قانون پر عمل کر رہے ہیں اور یہ ان کے عقیدے سے وابستہ معاملہ ہے، اسے غیر قانونی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ انہوں نے تین طلاق کو نہ صرف مسلمانوں کے عقیدے اور ایمان سے وابستہ معاملہ بتایا بلکہ اس کا موازنہ بھگوان رام کے ایودھیا میں پیدا ہونے کے سلسلہ میں ہندوؤں کے عقیدہ سے بھی کیا اور کہا کہ اگر بھگوان رام کے ایودھیا میں پیدا ہونے کے سلسلہ میں ہندوؤں کے عقیدے پر سوال نہیں اٹھایا جا سکتا تو تین طلاق پر ایسا کیوں ہے؟'' (روزنامہ انصاف لاہور ۱۷ مئی ۲۰۱۷ء)

اسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھارتی اٹارنی جنرل مکل روھسکی نے عدالت کو بتایا ہے کہ

''اگر سپریم کورٹ تین طلاق کو غیر قانونی قرار دیتا ہے تو حکومت شادی اور طلاق کے ضابطے کیلئے قانون بنانے کو تیار ہے۔''

جبکہ اس صورت حال پر سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بینچ کے یہ ریمارکس بھی روزنامہ اوصاف (۱۳ مئی) میں شائع ہونے والی خبر کا حصہ ہیں کہ

''باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے کچھ مسالک میں بیک وقت تین طلاقیں دینا جائز ہے لیکن پھر بھی بیک وقت تین طلاقیں دے کر مسلمانوں میں نکاح کو ختم کرنے کی یہ سب سے بدترین قسم ہے۔''

نکاح وطلاق کے اسلامی احکام وقوانین اس وقت دنیا بھر میں زیر بحث ہیں اور اس وجہ سے کہ ان کی بنیاد آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی پر ہے، انہیں آج کے مروّجہ اس بین الاقوامی فلسفہ ونظام کے منافی سمجھا جاتا ہے جس میں آسمانی تعلیمات سے دست برداری اختیار کر کے سوسائٹی کی اجتماعی عقل وخواہش کو ہی تمام احکام وقوانین کی بنیاد بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے حوالہ سے مختلف تضادات سامنے آتے ہیں اور باعث نزاع بنتے رہتے ہیں۔ اس کشمکش کا سب سے بڑا میدان بھارت ہے جہاں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان نکاح کے جائز نہ ہونے کے ساتھ ساتھ مرد کو یکطرفہ

طلاق کے حق کا مسئلہ بھی بڑے تنازعات میں شامل ہے۔اس سلسلہ میں بھارت کے تمام مسلم مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کے فورم پر جمع ہیں اور مسلمانوں کے خاندانی نظام وقوانین کے تحفظ کیلئے مصروف جدوجہد ہیں۔

قرآن وسنت کے واضح ارشادات کی روشنی میں مسلمان مرد کا غیر مسلم عورت سے اور غیر مسلم عورت کا مسلمان مرد سے نکاح درست نہیں ہے، اس لیے مسلمان غیر مسلموں میں رشتہ نہ دیتے ہیں نہ لیتے ہیں۔اور صرف ہندوستان کے غیر مسلموں کو نہیں بلکہ دنیا بھر کے غیر مسلموں خصوصاً سیکولر حلقوں کو اعتراض ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسی طرح قرآن کریم نے طلاق کا حق خاوند کو دیا ہے جبکہ بیوی کو براہ راست طلاق کا حق دینے کی بجائے خلع کے عنوان سے مطالبۂ طلاق کا حق دیا ہے اور اس کے لیے ایک پورا نظام پیش کیا ہے تاکہ عورت کے ساتھ ظلم اور اس کی حق تلفی نہ ہو سکے، مگر آج کے مروّجہ عالمی نظام وفلسفہ کا مطالبہ ہے کہ بیوی کو بھی خاوند کی طرح طلاق کا مساویانہ حق دیا جائے تاکہ مرد وعورت کی مساوات قائم ہو سکے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں عائلی قوانین کے تحت بنائے جانے والے نکاح فارم میں ''تفویض طلاق'' کا خانہ اسی خلا کو پُر کرنے کیلئے شامل کیا گیا تھا اور اب بعض قانونی حلقوں کی طرف سے خلع کو عورت کی طرف سے مطالبہ طلاق کی بجائے طلاق کے براہ راست حق سے جو تعبیر کیا جا رہا ہے وہ بھی اسی پس منظر میں ہے۔

تین طلاقوں کے حوالہ سے ایک بحث تو ہمارے ہاں فقہی حلقوں میں ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک جملہ میں تین طلاقیں بیک وقت دینے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے یا تینوں واقع ہو جاتی ہیں مگر انڈیا کی سپریم کورٹ میں اس کی صورت مختلف ہے اور وہاں زیر بحث مسئلہ کی نوعیت یہ نظر آتی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں اکٹھی دینے سے نکاح یکسر ختم ہو جاتا ہے اور رجوع یا نکاح ثانی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔اس طرح نظر ثانی کا موقع دیے بغیر نکاح کا رستہ کلی طور پر یکلخت ختم ہو جانے کو وہاں کے بعض حلقوں میں ناانصافی قرار دیا جا رہا ہے۔اس کا ہمارے ہاں کی تین طلاقوں کی بحث سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کہ اس سے ہٹ کر اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو وقفہ وقفہ کے ساتھ تین الگ الگ طلاقیں دیتا ہے تو تیسری طلاق کے بعد وہاں بھی یہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کے واضح ارشاد کے مطابق رجوع یا نکاح ثانی کا حق تمام مسلم

فقہی مکاتب فکر کے نزدیک متفقہ طور پر تیسری طلاق کے بعد یکلخت اور کلی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے مسئلہ بیک وقت تین طلاقوں کا ہو یا وقفہ وقفہ سے تیسری طلاق کا دونوں صورتوں کا آخری نتیجہ ایک ہی ہے کہ ایسی طلاق جس کے بعد نظر ثانی کی گنجائش نہ رہے۔ اس حوالہ سے زیر بحث ہے کہ مرد کو طلاق کا یکطرفہ حق حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ نظر ثانی کی گنجائش کو ختم کر دینے کا جو حق حاصل ہے وہ سیکولر حلقوں کے خیال میں (نعوذ باللہ) دہری زیادتی ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ زیر بحث کیس میں اس کا جائزہ لے رہی ہے اور اس سے تقاضہ یہ ہے کہ اسے نہ صرف جرم تصور دیا جائے بلکہ اسے قانوناً غیر مؤثر بھی قرار دے دیا جائے۔

جہاں تک ''تین طلاقوں'' کے ناپسندیدہ ہونے کا تعلق ہے اسلام سرے سے طلاق کو ہی ناپسندیدہ ترین عمل (ابغض المباحات) قرار دیتا ہے اور بیک وقت تین طلاقوں کو ''طلاق بدعت'' سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن طلاق ایک ایسی معاشرتی ضرورت بلکہ مجبوری ہے کہ مسیحیت اور ہندوازم میں مذہبی طور پر سرے سے طلاق کا تصور ہی نہیں تھا مگر انہیں اس معاشرتی مجبوری کو بالآخر ضرورت تسلیم کرنا پڑا ہے بلکہ مغربی دنیا نے تو ضرورت سے زیادہ ہی اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔

اس پس منظر میں کیا بیک وقت تین طلاقیں دینے کے عمل کو ''جرم'' قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہمارے ہاں پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کے دور میں ''تحفظ حقوق نسواں بل'' جب اسمبلی میں پیش کیا گیا، اس وقت حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین کے ساتھ مذاکرات کے دوران سرکردہ علماء کرام کی کمیٹی نے یہ تجویز کیا تھا۔ روزنامہ پاکستان لاہور (۱۴ اکتوبر ۲۰۰۶ء) میں شائع شدہ راقم الحروف ہی کی ایک رپورٹ میں اس کا ذکر اس طرح موجود ہے کہ

> ''پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور ان کے رفقاء کو ممتاز علماء کرام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، راقم الحروف ابوعمار زاہد الراشدی، مولانا اخلاق احمد اور حافظ محمد عمار یاسر نے مشورہ دیا ہے کہ اگر حکومت واقعی پاکستان میں خواتین کے

حقوق کے تحفظ کے حوالہ سے عملی پیشرفت کرنا چاہتی ہے تو اسے مندجہ ذیل قانونی اقدامات کرنے چاہئیں:

(۱) خواتین کو عملاً وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے اس کے سدّ باب کیلئے مستقل قانون بنایا جائے۔

(۲) بعض علاقوں میں خواتین کو ان کی مرضی کے خلاف نکاح پر مجبور کیا جاتا ہے اس کی روک تھام کے لیے قانون سازی کی جائے اور اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔

(۳) بیک وقت تین طلاقیں دینے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور ایسی دستاویز لکھنے والے نوٹری پبلک اور وثیقہ نویس کو بھی شریک جرم قرار دیا جائے۔

(۴) قرآن کریم کے ساتھ نکاح کی مذموم رسم کا سدّ باب کیا جائے۔

(۵) جبری وٹہ سٹہ یعنی نکاح شغار کو قانوناً جرم قرار دیا جائے۔

(۶) عورتوں کی خرید وفروخت اور انہیں میراث بنانے کے غیر شرعی رواج اور رسوم کا قانونی سد باب کیا جائے۔‘‘

ہم نے ان تجاویز میں یہ تسلیم کیا تھا کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا معاشرتی طور پر بہت برا عمل ہے اور شرعی طور پر ’’طلاق بدعت‘‘ شمار ہوتا ہے اس لیے اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ دیا جانا چاہئے۔ لیکن تین طلاقیں بیک وقت دینے کی صورت میں طلاق شرعاً واقع ہو جاتی ہے یا نہیں یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اور اس پر جمہور فقہاء اہل سنت کا یہ موقف صدیوں سے چلا آ رہا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے سے خاوند گناہ گار ہوگا اور دنیا میں بھی اسے اس برے عمل پر سزا دی جا سکتی ہے لیکن اس کے ایسا کرنے سے طلاق بہر حال واقع ہو جائے گی اور جیسی اس نے کہی ہے ویسی ہی واقع ہوگی، اسے قانوناً غیر مؤثر کر دینا محل نظر ہے جس کی مسلمہ شرعی اصولوں کی روشنی میں اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص کسی کو بندوق سے ایک، دو یا تین گولیاں مار دے تو وہ سخت گناہ گار ہے اور اس نے قبیح ترین جرم کا ارتکاب کیا ہے جس پر اسے دنیا اور آخرت

دونوں جگہ سزا ہوگی۔لیکن اس عمل کے سخت ترین گناہ اور جرم ہونے کی وجہ سے اس کی گولیاں غیر مؤثر نہیں ہو جائیں گی کیونکہ وہ اپنا کام بہرحال کریں گی اور جتنی گولیاں وہ مارے گا اتنی ہی لگیں گی۔

یہ مسئلہ انڈیا کے سپریم کورٹ میں زیر بحث ہے اور وہاں کے مسلمان اس پر جو اجماعی موقف اختیار کیے ہوئے ہیں ہم ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کیلئے دعاگو بھی ہیں۔ چونکہ اس قسم کی بحثیں ہمارے ہاں بھی ہوتی رہتی ہیں بلکہ اب تو یہ مباحث عالمی مکالمہ کا حصہ بن چکے ہیں، اس لیے اس سلسلہ میں چند گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کر دی ہیں۔اللہ تعالیٰ دنیا بھر کے مسلمانوں کو قرآن وسنت کے احکام وقوانین کے ساتھ وابستہ رہنے اور ان کی حفاظت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ......جون ۲۰۱۷ء)

تین سال قبل بھارت کی سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے حوالے سے ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین سمجھنے، یا ایک قرار دینے کی بحث چھڑ گئی تھی۔ راقم الحروف جب اپنے معمول کے مطابق ۱۹۹۳ء میں تین ماہ کے لیے لندن پہنچا تو وہاں کے اردو اخبارات میں بھی یہی بحث زور وشور کے ساتھ جاری تھی اور طرفین کی جانب سے بیانات، مضامین اور مراسلات شائع ہو رہے تھے۔ حیرانی ہوئی کہ لندن میں اس بحث کا فائدہ یا ضرورت کیا ہے؟ مگر بیان بازی تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس دوران بھارت کے معروف عالم دین حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ہماری دعوت پر ورلڈ اسلامک فورم کے سالانہ تعلیمی سیمینار میں شرکت کے لیے لندن تشریف لائے۔مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صوبہ بہار کے امیر شریعت ہیں، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد ہیں، اور آج کے جدید مسائل پر ''فقہی کونسل'' کے نام سے اہل علم وفن کے اشتراک کے ساتھ جو علمی وفقہی کام کر رہے ہیں، پورے جنوبی ایشیا میں اس کی مثال نہیں ہے۔

وہ لندن تشریف لائے تو تین طلاقوں کے حوالے سے ہونے والے مباحثہ کی صورتحال کو دیکھ کر پریشان ہو گئے، فرمانے لگے کہ بھئی کسی سمجھدار اہل حدیث عالم سے بات کراؤ۔اس وقت جمعیت

اہل حدیث برطانیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الہادی العمری تھے۔ وہ بھی انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے اچھے دوست ہیں، سمجھدار اور معاملہ فہم عالم دین ہیں۔ ہم نے ان سے رابطہ قائم کیا، وہ تشریف لائے، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے ملاقات میں ان سے ایک بات فرمائی جس کا مفہوم یوں ہے کہ

> ''بھئی! بھارت کے سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ احناف اور اہل حدیث کے اختلاف کو طے کرنے کے لیے نہیں کیا، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو اجاگر کر کے اور ان سے فائدہ اٹھا کر نکاح وطلاق کے معاملہ میں مسلمانوں کے امتیازی قوانین کو ختم کیا جائے، اور پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار کی جائے۔ اس لیے کوئی ایسا راستہ نکالیں کہ بیان بازی کا یہ بازار ٹھنڈا ہو اور ہم اپنے مسائل آپس میں مل بیٹھ کر طے کر لیں۔''

مولانا عبد الہادی العمری نے بھی اس سے اتفاق کیا اور پھر دونوں راہنماؤں میں اس سلسلہ میں عملی تجاویز پر بھی صلاح مشورہ ہوا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہو چکی ہے اور بھارتی حکومت نے گزشتہ دنوں پورے ملک کے لیے ''یکساں سول کوڈ'' نافذ کر دیا ہے جس پر بھارت کے دینی ادارے اور جرائد مسلسل چیخ وپکار کر رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں میں نکاح وطلاق اور وراثت کے مقدمات کے تسلسل کے ساتھ سامنے آنے اور اختلافات کو ابھارنے والے فیصلوں کا پس منظر بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ پاکستان پر عالمی طور پر ایک عرصہ سے یہ دباؤ موجود ہے کہ اس ملک کے نکاح و طلاق اور وراثت کے قوانین اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور بین الاقوامی معیار کے مطابق نہیں ہیں، اس لیے انہیں تبدیل کر کے بین الاقوامی معیار کے مطابق بنایا جائے۔ وہ ''بین الاقوامی معیار'' اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی دفعہ ۱۶ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

> ''پوری عمر کے مردوں اور عورتوں کو نسل، قومیت یا مذہب کی کسی تحدید کے بغیر باہم شادی کرنے اور خاندان کی بنیاد رکھنے کا حق حاصل ہے۔ شادی،

دورانِ شادی اور اس کی تنسیخ کے سلسلے میں وہ مساوی حقوق رکھتے ہیں۔''

اس دفعہ کی رو سے

(۱) مسلمان سے شادی کے لیے مسلمان ہونے کی شرط،

(۲) شادی کے دوران مرد کے خاندان کے سربراہ ہونے کا تصور، اور

(۳) مرد کا طلاق کا یکطرفہ حق

تینوں امور بین الاقوامی معیار اور انسانی حقوق کے عالمی تصور کے منافی قرار پاتے ہیں، اور انہیں ختم کرنے کے لیے پاکستان پر مسلسل زور دیا جا رہا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم بحیثیت قوم مذہبی معاملات میں مغرب کے ناجائز دباؤ کو مسترد کرنے کے لیے ابھی تک تیار نہیں ہیں، اور عالمی طاقتوں کو مطمئن رکھنے کے لیے معذرت خواہانہ طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہیں۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ......فروری ۱۹۹۶ء)

بھارت کے دو بڑے مذاہب

۲۰۱۸ء کے دوران الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ میں
معاصر مذاہب کے تعارف کے حوالے سے منعقد ہونے والی
نشستوں سے گفتگو

ہندومت

بعدالحمد والصلوٰۃ۔حضرات علماء کرام! آج اس حوالے سے کچھ بات ہوگی کہ ہندو مذہب کیا ہے،اس کے ساتھ ہمارے معاملات کیا چلے آرہے ہیں،اوراس وقت ہم کس پوزیشن میں ہیں۔

ہندو مذہب کا آغاز کب ہوا، اس کی بنیادیں کیا ہیں، اوران کے بنیادی عقائد کیا ہیں، اس بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ ہندو مذہب کی بنیاد اور بنیادی عقائد کے بارے میں کوئی متفقہ بات نہیں ملتی۔ عام طور پراسے وطنی مذہب سمجھا جاتا ہے۔ایک زمانے میں متحدہ ہندوستان میں رہنے والے لوگ ہندی اور ان کا مذہب ہندو مذہب کہلاتا تھا۔بعض مذاہب نسلی ہیں جیسے یہودیت،اس طرح ہندومت وطنی مذہب ہے کہ ہندوستان کےاندر رہنے والے ہندو ہیں۔

عقائدورسومات

ہندومذہب میں طرح طرح کےعقائداوررسومات ہیں جن کا کوئی طےشدہ دائرہ نہیں ہے۔

ویدوں کی حقیقت

ویدوں کا زمانہ عام طور پراس کی ابتدا کا زمانہ کہا جاتا ہے۔اسے ویدک عہد کہتے ہیں۔ویدوں کوالہامی کتابیں سمجھا جاتاہے،جوکہ چار ہیں۔دورحاضر کے چند مسلم محققین

(۱) مولانا شمس نوید عثمانیؒ انڈیا کے بڑے عالم تھے،

(۲) موجودہ دور کے علماء میں مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی، جومولانا منظوراحمد نعمانیؒ کے بیٹے ہیں،اس محاذ پرسرگرم ہیں اورویدوں کے بھی عالم ہیں۔

(۳) اورمولانا کلیم صدیقی کی بھی ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ اور دعوت کے حوالے سے بڑی

خدمات ہیں، وہ بھی ویدوں کے عالم ہیں۔

مولانا شمس نوید عثمانیؒ اور دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ اصلاً ویدیں کسی پرانے مذہب کی الہامی کتابیں لگتی ہیں۔ مولانا شمس نوید نے ''اگر اب بھی نہ جاگے تو'' نامی کتاب میں ویدوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ اسے حضرت نوح علیہ السلام کے باقی ماندہ افراد کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ویدوں کا لہجہ، تعلیمات اور اسلوب آسمانی کتابوں جیسا ہے۔ ان میں توحید، وضو، نماز، اللہ کی عبادت اور روزہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور ویدوں کا زمانہ بھی کم وبیش ایک ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ اس ویدک عہد سے پہلے ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔

داخلی مذاہب

اس کے بعد ہندو مذہب ہندوستان کے وطنی دائرے میں ہے لیکن ان کے عقائد آپس میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ جنوبی ہند کے اور ہیں، شمالی ہند کے اور ہیں، وسطی ہند کے اور ہیں۔ محاورہ بھی ہے کہ ''گنگا گئے تو گنگا رام، جمنا گئے تو جمنا داس''۔ رام اور داس دو مختلف مذاہب کی علامتیں ہیں، جو ان کے اندرونی مذاہب ہیں۔ ان کی پرانی تعلیمات کی اصطلاحات میں تنتر (ہدایت) اور پران (مذہبی نظمیں) ملتی ہیں۔ جیسے بائبل میں زبور شاعری کی زبان میں ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی شاعری صحابہ کرامؓ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ ان کی کتابوں میں بھگوت، گیتا، دیوتا اور دیوی ہیں۔

حلول کا عقیدہ

جس انسان کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ اس میں رام کی ذات حلول کر گئی ہے اور اس میں دیوتا کی صفت آ گئی ہے، اسے مرد ہو تو دیوتا اور عورت ہو تو دیوی کہتے ہیں۔ برہمن، شیوا جی اور وشنو مہاراج دیوتا ہیں، جبکہ مایہ اور لکشمی وغیرہ دیویاں ہیں۔ ان کا تصور حلول کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان میں حلول کر کے اپنی زیارت کرواتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی حلولی گروہ چلا آ رہا ہے، ہمارے بعض صوفیاء کے ہاں اس طرح کا تصور پایا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ کہ ہمارے قریب کے زمانے کے ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، انہوں نے خود اپنا قصہ سنایا کہ ایک زمانے میں سندھ کے علاقے

میں ایک گاؤں میں گئے تو گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوگئے۔کسی نے ان کو بتا دیا کہ اللہ پاک ایک بزرگ کی شکل میں آئے ہیں۔لوگ آکر کہنے لگے،آپ ہمارا یہ کام کر دیں۔حضرت نے کہا کہ اللہ کے بندو میں تو انسان ہوں اور میرا نام عبداللہ (اللہ کا بندہ) ہے۔وہ کہتے نہیں آپ اللہ ہیں انسانی شکل میں آئے ہیں۔ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کبھی شکلیں بدل کر دنیا میں گھومتے ہیں۔

آج اس جدید دور میں بھی یہ تصور پایا جاتا ہے۔امریکہ میں ''نیشن آف اسلام'' کے نام سے جو مذہب ہے سیاہ فاموں میں، آلیجا محمد نے ۱۹۳۴ء میں نبوت کا دعویٰ کیا۔اس سے پہلے ماسٹر فارد محمد نے ۱۹۳۰ء میں اپنی تبلیغ کا آغاز کیا اور ایک مرکز بنایا۔چار سال کے بعد وہ غائب ہوگئے اور آلیجا محمد اس کا جانشین بنا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ان کے باضابطہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ ماسٹر فارد محمد اصل میں اللہ تھے، چار سال ہماری اصلاح کرتے رہے، پھر آلیجا محمد کو اپنا جانشین بنا کر آسمانوں پر واپس چلے گئے۔یہ تصور ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا رہا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں بھی اوتار اور بھگوان کا تصور پایا جاتا ہے،ان کے ہاں مذہبی پیشوا کو پروہت کہا جاتا ہے۔پروہت، پنڈت اور برہمن ان کی مذہبی پیشوائی کرتے ہیں۔یہ مظاہر کے پجاری ہیں، ان کے کروڑوں دیوتا ہیں۔ان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت کسی بھی چیز میں دکھائی دے تو وہ خدا کی صفت کا مظہر ہے۔کسی بھی چیز میں کوئی امتیازی صفت دیکھتے ہیں تو ان کا تصور یہ ہے کہ اس کے ذریعے جو خدا کی صفت کا اظہار ہے وہ ہمارا معبود ہے۔ہم انہیں بت پرست کہتے ہیں کہ پتھر کی مورتی بنا کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔

دیانندسرسوتی کی ''ستیارتھ پرکاش''

ان کے بڑے پنڈت گزرے ہیں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی، جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے معاصر تھے۔ان کا آپس میں مکالمہ ومناظرہ بھی ہوا،تحریری مکالمہ بھی ہوا اور گفتگو بھی ہوئی، انہوں نے کتاب لکھی ''ستیارتھ پرکاش''۔ ہندو مذہب کو منظّم رنگ میں پیش کیا، جیسے ہمارے ہاں حدیث کی کتاب ہوتی ہے،عقائد کا باب، عبادات کا باب، اخلاقیات کا باب، معاملات کا باب وغیرہ۔اسی طرح اس کتاب میں ہندو نظام، ان کے خاندانی معاملات، نکاح، طلاق،تجارت، اور سیاست کو بیان کیا ہے۔اس کے آخر میں چودھویں باب میں قرآن کریم اور

اسلام پر ایک سو سے زیادہ اعتراضات کیے ہیں۔ اگر ہندو مذہب کا منظّم اور ترقی یافتہ شکل میں مطالعہ کرنا ہو تو ''ستیارتھ پرکاش'' کا مطالعہ کریں۔

اس میں پنڈت دیانند سرسوتی نے ہم پر ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ آپ ہم پر اعتراض کرتے ہو کہ ہم پتھر کی پوجا کرتے ہیں، مسلمان بھی تو پتھر ہی کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم پتھر کی مورتی بنا کر اس کو پوجتے ہیں اور تم نے پتھر کا مکان بنا رکھا ہے خانہ کعبہ، اس کو پوجتے ہو۔ ہم مورتی کے گرد چکر کاٹتے ہیں تم مکان کے گرد چکر کاٹتے ہو۔ یہ بھی پتھر کا بنا ہوا ہے وہ بھی پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اس کے جواب میں مختلف علماء نے لکھا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا رسالہ ہے ''قبلہ نما'' اس میں انہوں نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔

گائے کا تقدس

بہرحال مظاہر فطرت کی پوجا ان کا بنیادی مذہب ہے۔ ان مظاہر فطرت میں ان کے ہاں گائے سب سے مقدس چیز ہے، اسے گاؤ ماتا کہتے ہیں اور گائے کی توہین برداشت نہیں کرتے۔ گائے جہاں سے چاہے کھائے پیئے اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی خصوصیات ''**ولا تمسوھا بسوء**'' (**ھود ٦٤**) وغیرہ کو گائے پر فٹ کیا ہوا ہے کہ یہ اللہ میاں کی گائے ہے، کوئی اسے تنگ نہیں کرے گا۔ گائے کی توہین کو بہت بڑا جرم سمجھتے ہیں۔ ہمارے بہت سے شہروں میں گاؤشالا کے نام سے آپ کو پرانی عمارتیں ملیں گی۔ گوجرانوالہ میں بھی ایک گاؤشالا تھا۔ یہ گائے کی حفاظت کے لیے ایک مستقل مرکز ہوتا تھا۔ ایک بڑی حویلی ہوتی تھی جہاں گائے کی حفاظت، خدمت اور دیکھ بھال کی جاتی۔ انڈیا میں اب بھی گاؤشالا عمارتیں ہیں۔

گائے کے نام پر وہاں فسادات بھی ہوتے ہیں۔ ویسے تو ان کے ہاں کسی بھی جانور کو ذبح کرنا درست نہیں ہے، لیکن گائے کو ذبح کرنا ان کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ صرف حرام نہیں بلکہ توہین ہے، اس پر کٹ مرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ گائے کا پیشاب ان کے ہاں بڑی مقدس چیز ہے۔ گائے مُوت ان کے ہاں واقعتاً اسی طرح ہے کہ اس کو وہ تقدس حاصل ہے جیسے ہمارے ہاں زمزم کو حاصل ہے۔ وہ اسے پیتے ہیں، جسم پر ملتے ہیں، جگہ عبادت کے لیے مخصوص کرنی ہو تو اس جگہ کو گائے کے گوبر اور پیشاب سے لیپ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب یہ

پاک ہوگئی ہے۔

اس پر کچھ عرصہ پہلے لندن میں ایک بحث چلی، وہاں کے اخبارات میں رپورٹ چھپی، میں نے بھی ماہنامہ الشریعہ میں نقل کی، وہ یہ کہ گائے کے پیشاب میں کیمیکلز ملا کر پیک کر کے کوکا کولا کی طرز پر کاؤ کولا شروع کیا جو انڈیا میں بکتا بھی ہے اور اسے بڑے تبرک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک اخبار نے گائے کے پیشاب کے طبی اور روحانی فوائد پر مضمون چھاپا۔ ایک مذاکرے میں بحث ہو رہی تھی کہ کیا پاکستان میں اس کی مارکیٹنگ کی گنجائش ہے۔ یہاں سے لطیفہ کی بات شروع ہوتی ہے، میں نے جواب دیا کہ مارکیٹنگ کی تو گنجائش نہیں ہے لیکن سپلائی کی گنجائش پیدا کر لیں گے، گائے کا پیشاب جتنا کہو مہیا کریں گے۔ اس نے پوچھا، مولوی صاحب! یہ جائز ہے؟ میں نے کہا حضرت امام شافعیؒ کا موقف ہے بول "**ما یؤکل لحمہ طاھر**" بلکہ یہ ہمارے امام محمدؒ کا قول بھی ہے۔ یہ میں نے دل لگی کی بات کی، فتویٰ کی بات نہیں کر رہا۔ بہرحال ان کے ہاں گائے کے پیشاب کو تقدس حاصل ہے۔ اس دور میں ان باتوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن یقین کرنا پڑتا ہے۔ پیشاب سے بڑھ کر پنچ گیّا (گائے کی پانچ چیزیں) بھی ہندو استعمال کرتے ہیں۔ اس میں گائے کا (۱) پیشاب (۲) گوبر (۳) خون (۴) تھوک (۵) اور ناک کی رطوبت، یہ پانچ چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ان کو ملا کر معجون سی بناتے ہیں اور کسی کو ہندو بنانے کے لیے یہ چٹاتے ہیں۔ بچے کو اسی کی گھٹی دیتے ہیں اور یہ بڑی برکت کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ یہ ان کے مذہب کی بڑی بڑی علامتیں ہیں۔

مسئلہ تناسخ اور جنم کا تصور

ان کے ہاں ایک بڑا مسئلہ تناسخ کا ہے۔ ان کے ہاں جزا سزا کا تصور موجود ہے لیکن اس کی عملی شکل یہ ہے کہ روح فنا نہیں ہوتی، روح انسان کے جسم میں ایک جنم گزارتی ہے، جب وہ اس سے نکل جاتی ہے تو اسے ایک نیا جسم دیا جاتا ہے، نئے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہے، جنم بدلتی رہتی ہے۔ اس کو تناسخ کہتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ سم نئے سیٹ میں ڈال دی ہے۔ آپ نے محاورہ سنا ہوگا "جنم جنم کا ساتھ"۔ اسی طرح اگلے جنم میں ملیں گے، رام اگلے جنم میں ملا دے۔ اس کی وجہ یہی عقیدہ ہے یہ ساری باتیں اس تناسخ کے عقیدے پر مبنی ہیں۔ ان کے ہاں نیکی اور بدی کے تصور کے مطابق

اگر زندگی اچھی گزاری ہے تو اگلا جنم بہتر ملتا ہے۔ پہلے جانور کی شکل میں تھا، دوسرے جنم میں انسانی شکل میں آجائے گا۔ پہلے شودر تھا تو اب برہمن کی شکل میں آجائے گا۔ یعنی پہلے سے اچھی صورت مل جاتی ہے۔ اور اگر بری زندگی گزاری ہے اور سزا کا مستحق ہے تو انسان کسی جانور مثلاً سانپ، کتے، گدھے کی شکل میں اگلے جنم میں آجائے گا۔ جنم کا بدلنا اور بہتر یا بری شکل میں آنا سزا جزا کا تصور ہے۔ تناسخ کا عقیدہ ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔

یہ فرق ذہن میں رکھیں کہ جدید ہندو سوسائٹی نے مذہبی پابندیاں ختم کر دی ہیں۔ اب تو ہندوستان میں قوانین سیکولر ہیں، پرانے مذہبی معاشرتی قوانین سے دستبرداری اختیار کر رکھی ہے، ان کے مذہبی رہنما مذہبی ومعاشرتی روایات پر اسٹینڈ نہیں لے رہے۔ یہاں ہم سے بھی تقاضا ہے کہ معاشرتی قوانین میں مذہب سے دستبرداری اختیار کرو، مذہب کو عبادات کے دائرے میں محدود رکھو۔ ہم یہ نہیں کر رہے اور ہم اسٹینڈ لیے ہوئے ہیں۔

خاوند اور بیوی کا تعلق

بہرحال ہندوستان میں بعض مذہبی روایات پر اب بھی عمل ہوتا ہے جن میں مثلاً یہ کہ ان کے ہاں طلاق کا سرے سے کوئی تصور نہیں ہے، نکاح جو ہو گیا تو اب ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ ہو گیا۔ خاوند کے فوت ہونے کے بعد بھی بیوی کو مذہبی طور پر نئے نکاح کی اجازت نہیں ہے، خواہ وہ جوان عورت ہو۔ اگلے جنم میں اسی کی بیوی ہو گی۔ خاوند کے مرنے سے بھی نکاح ختم نہیں ہوتا اور عورت کے لیے دو آپشن ہوتے ہیں:

(۱) باقی ساری زندگی خاوند کے گھر میں ایک خادمہ یا نوکرانی کی شکل میں گزار دے۔ سوگ کی کیفیت میں رہے گی کہ خوشبو نہیں لگائے گی، اچھے کپڑے نہیں پہنے گی، زینت اختیار نہیں کرے گی۔

(۲) دوسرا اُن کے ہاں عزیمت کا مقام یہ ہے کہ خاوند کی لاش جب جل رہی ہو عورت اس آگ میں کود کر جان دے دے۔ اس کو ستی ہونا (قربان ہونا) کہتے ہیں اور اس کو بہت بڑا درجہ دیا جاتا ہے، شہادت ہی کا درجہ سمجھتے ہیں۔ اب آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت نے قانوناً اس پر پابندی لگا رکھی ہے کہ کوئی عورت ایسا نہیں کر سکتی، لیکن اس کے باوجود

دور دراز علاقوں میں ایسے ہو جاتا ہے کہ عورت خاوند کی چتا (جلتی ہوئی لاش) پر ستی ہو جاتی ہے۔ ستی ہو جانے کی ان کے ہاں بڑی معروف روایت ہے۔

ذات پات کا معاملہ

ان کے ہاں جو بڑا مسئلہ ہے وہ ہے ذات پات کا مسئلہ۔ سوسائٹی میں چار درجے ہیں اور چاروں کی درجہ بندی، احکام اور دائرے الگ ہیں:

(۱) سب سے اعلیٰ درجہ کی ذات برہمن کی ہے جو برہما کی طرف منسوب ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاید حضرت ابراہیمؑ کی طرف نسبت ہے اور یہ ابراہیمی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بہرحال یہ قیاس آرائیاں ہیں۔ برہمن کے کام کا بنیادی دائرہ علمی اور مذہبی ہے۔ تعلیم اور مذہب برہمن کے اختیارات اور فرائض میں سے ہے کہ وہ کس حد تک علم حاصل کرتے ہیں اور کتنا دین سکھاتے ہیں۔ پنڈت برہمنوں میں سے ہوتے ہیں۔ ان کا بنیادی کام مذہبی رسومات ادا کرنا اور مذہب کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ سب سے برتر اور مقدس یہ طبقہ سمجھا جاتا ہے۔

(۲) دوسرے نمبر پر کھشتری ہیں۔ ان کا کام حکمرانی، فوج، پولیس، انتظامیہ، اور مملکت کے اجتماعی کام سرانجام دینا ہوتا ہے۔

(۳) تیسرے نمبر پر ویش کی ذات ہے۔ تجارت وزراعت وغیرہ کرتے ہیں۔

(۴) سب سے نچلی اور حقیر ذات شودر کی ہے۔ ان کے ذمے صرف خدمت کے کام ہیں۔ اوپر والے طبقوں کی خدمت کے کام کرنا۔ اور حیثیت ان کی یہ ہے کہ ان کے ساتھ برابر نہیں بیٹھ سکتے ہیں، ان سا لباس نہیں پہن سکتے، ان جیسا طور طرز اختیار نہیں کر سکتے۔ شودر کسی برہمن سے مصافحہ بھی نہیں کر سکتا، اگر ہاتھ ملا لے تو برہمن کے ہاتھ پلید سمجھے جاتے ہیں۔ اس ذات پات کے فرق سے نفرت کرتے ہوئے بابا گرونانک نے ہندو مذہب چھوڑ دیا تھا۔ یہ ذات پات کا فرق اب بھی موجود ہے اگرچہ قانوناً ختم کر دیا گیا ہے۔ معاشرتی فرق تو ہمارے ہاں بھی ہے، چوہدری اور کمّی کا لیکن یہ معاشرتی ہے، مذہبی نہیں ہے۔ تمام تر خرابیوں کے باوجود مذہبی طور پر آج بھی الحمد للہ عید اور جمعے کے موقع پر کوئی فرق نہیں

برتا جاتا۔کوئی کسی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم کمّی ہو پیچھے کھڑے ہو۔ وہ آگے کھڑا ہے تو چوہدری پیچھے ہی کھڑا ہوگا۔ یہ تو تھیں ان کی بطور مذہب کے چند علامات۔

ہندو مسلم کشمکش کا دور

ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ مسلمانوں کے ساتھ ان کی کشمکش کا باقاعدہ آغاز تب ہوا تھا جب محمد بن قاسمؒ سندھ پر حملہ آور ہوئے تھے اور سندھ میں ان کا مقابلہ راجہ داہر سے ہوا تھا۔محمد بن قاسمؒ نے راجہ داہر کو شکست دے کر سندھ اور ملتان تک کا علاقہ فتح کیا۔ پھر ہمارے دوسرے بڑے فاتح سلطان محمود غزنویؒ جب آئے تو ان کی جنگیں بھی ہندوؤں سے ہوئیں اور سومنات مندر تک پہنچتے ہوئے سترہ حملے کیے۔ سترہویں حملے میں غزنوی کو کامیابی ہوئی۔اس کے بعد سلطان شہاب الدین غوریؒ، قطب الدین ایبکؒ، پھر بابرؒ۔ان کے ساتھ ہماری جو آخری بڑی جنگ ہوئی وہ احمد شاہ ابدالیؒ ہوئی مرہٹوں کے ساتھ ہوئی۔

متحدہ ہندوستان میں اسلام تین راستوں سے آیا ہے:

(۱) ایک تو محمد بن قاسمؒ اور محمود غزنویؒ وغیرہ فاتحین کے ذریعے۔

(۲) مشرقی ہند بمبئی وغیرہ میں عرب تاجروں کے ذریعے اسلام آیا۔

(۳) اور وسطی ہند میں اسلام صوفیاء کے ذریعے آیا، خواجہ معین الدین اجمیری، سید علی ہجویری، شاہ محمد غوث وغیرہ صوفیاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہاں آکر ماحول بنایا اور اسلام کا سبب بنے۔

مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان پر تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی ہے، آٹھ سو سال تو مغلوں نے کی ہے، ان سے پہلے قطب الدین ایبکؒ، شیر شاہ سوریؒ نے حکومت کی۔لیکن ہم نے یہاں حکومت کی ہے طاقت کے زور سے۔اس زمانے کا اصول ہی یہی تھا کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ قبضہ کر لیتا۔ ہمارے پاس جب تک طاقت رہی ہم نے حکومت کی۔

جب انگریز آیا تو ہم دونوں مغلوب ہو گئے۔ ہماری پرانی فقہی بحثوں میں ایک بحث چلتی ہے کہ ہندوستان کی کون سی زمین عشری ہے اور کون سی خراجی ہے۔ جو ہم نے غلبے سے قبضہ کیا ہے اس زمین کا حکم الگ ہے، اور جو علاقہ از خود مسلمان ہو کر شامل ہو گیا اس کا حکم الگ ہے۔ یہ ساری بحثیں ہماری تب تک تھیں جب ہم غالب تھے اور ہندو مغلوب تھے۔انگریز کے آنے کے بعد ہم

دونوں مغلوب ہو گئے تھے، ہماری پہلے والی پوزیشن نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد انگریز کے خلاف جو ہم نے آزادی کی جنگ لڑی تو ہم نے مل کر لڑی۔ اب نئے فقہی احکام غالب مغلوب کے پرانے دائرے میں نہیں ہوں گے بلکہ معاہد کے دائرے میں ہوں گے کہ ہم نے مل کر انگریز سے آزادی حاصل کی ہے، اب ان کا حکم ذمی کا نہیں ہوگا، معاہد کا ہوگا۔

مغلوں کے زوال کے بعد ہندو مسلم تعلقات

۱۸۲۰ء، ۱۸۲۱ء میں دہلی پر انگریزوں کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے اقتدار قائم ہو گیا تھا، تب سے صورتحال بدل گئی ہے۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے۔

(۱) ایک حصہ، جس کی قیادت سرسید احمد خان مرحوم کر رہے تھے، نے کہا کہ اب ہم مسلم ہندو ایک پوزیشن میں آ گئے ہیں تو ہمیں اپنا تشخص تسلیم کرانا چاہیے۔ اپنے آپ کو الگ ایک قومیت کا رنگ دینا چاہیے کیونکہ آئندہ فیصلے ووٹ کے ذریعے ہوں گے اور اس میں جس کی اکثریت ہوگی اس کی حکومت ہوگی، اس لیے ہمیں اس میں ضم ہونے سے بچنے کے لیے اپنا تشخص قائم کرنا چاہیے۔ سرسید سے بہت سے معاملات میں اختلاف ہے لیکن دو معاملات میں سرسید نے جو جنگ لڑی ہے:

(۱) ایک مسلمانوں کا الگ تشخص منوانے کے لیے کہ ہم مستقل قوم ہیں،

(۲) اور دوسرا سرسید نے اردو کے لیے جنگ لڑی۔

اردو مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی تھی اور ہندی ہندوؤں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ مدراس میں ہندی یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد سرسید نے محنت کی کہ اردو کو بچانا ضروری ہے، ہمارا تشخص اردو کے تشخص کے ساتھ باقی رہے گا۔ یہ بھی گروہ کا موقف تھا کہ آنے والا دور چونکہ سیاست کا ہے، جمہوریت اور ووٹ کا ہے، اس لیے ہمیں اکثریت کے سامنے سرنڈر ہونے کی بجائے اپنا تشخص الگ منوانا چاہیے۔ جداگانہ قومیت، دوقومی نظریہ جو بالآخر ''نظریہ پاکستان'' پر منتج ہوا، اس کے پیچھے سوچ یہ تھی۔

(۲) جبکہ دوسری سوچ یہ تھی کہ ہم نے ایک ہزار سال حکومت کی ہے، آئندہ بھی حکومت ہم ہی کریں گے اور یہاں حکومت میں ہمارا حصہ برابر ہوگا تو ہمیں الگ نہیں ہونا چاہیے، اس

سے نقصان ہوگا۔

یہ دو الگ الگ نقطہ نظر تھے۔ ہمارے اکابر علماء بھی دو حصوں میں تقسیم تھے:

(۱) حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہم کا موقف یہ تھا کہ ہم ساتھ رہ کر آپس میں معاملات کر کے بہتر طور پر چل سکتے ہیں۔

(۲) جبکہ حضرت تھانویؒ اور ان کے رفقاء کا موقف یہ تھا کہ نہیں، ہم ہندو اکثریت سے مغلوب ہو جائیں گے، اس سے بچنے کے لیے الگ ملک چاہیے۔ اس میں یہ بعد والا موقف غالب آ گیا، اس کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا۔

حضرات علماء کرام! ہندو مذہب کی چند تعارفی باتیں اور ہندو قوم کے ساتھ مسلم معاملات جو چلتے آ رہے ہیں اس کا ایک ہلکا سا خاکہ آج میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایک بات یہ کہ ہندو مذہب دعوتی مذہب نہیں، وطنی مذہب ہے۔ جو ہندوستان کا ہے وہ ہندو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے جو لوگ مسلمان یا عیسائی ہو گئے ہیں انہیں واپس ہندو ہو جانا چاہیے، یہ ان کی شدھی تحریک کہلاتی ہے، ہندوستان سے باہر کے کسی آدمی کو یہ ہندو ہونے کی دعوت نہیں دیتے۔

سکھ مت

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سکھ مذہب کا آغاز کہاں سے ہوا تھا، اس کا پس منظر کیا ہے، اور اب کیا صورتحال ہے؟ آج اس پر بات کریں گے۔ سکھ مذہب پنجاب کا مذہب ہے، ان کی تاریخ زیادہ سے زیادہ پانچ سو سال کی ہے، اکبر بادشاہ کے زمانے میں ان کا آغاز ہوا۔

بابا گرونانک

پہلے ایک بات سمجھنی ضروری ہے کہ سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک پہلے ہندو تھے۔ ''گرو'' مذہبی پیشوا کو کہتے ہیں جبکہ ''نانک'' ان کا نام تھا۔ مغلوں سے پہلے دہلی پر ابراہیم لودھی کی حکومت تھی، پھر بابر نے پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا تھا اور مغل سلطنت کا آغاز ہوا تھا۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں ضلع شیخوپورہ میں تلونڈی گاؤں ہوتا تھا، اب یہ خود ضلع ہے اور اس کا نام بابا نانک کے نام پر ننکانہ صاحب رکھا گیا ہے۔ وہاں ایک ہندو گھرانے میں بابا نانک نے جنم لیا۔ جب جوان ہوئے، صوفی مزاج آدمی تھے، انہیں ہندو مذہب کی دو باتوں سے نفرت ہوگئی تھی:

(۱) ایک بت پرستی سے کہ بابا نانک توحید کے قائل تھے،

(۲) اور دوسرا ذات پات کے فرق سے۔

صوفیاء کرام اور خانقاہی نظام کی طرف رجوع

ان کا رجوع صوفیاء کرام حضرت بابا فریدؒ اور حضرت میاں میرؒ کی طرف ہوگیا۔ یہ زمانہ صوفیاء کرام کے عروج کا زمانہ تھا۔ بابا نانک صوفیاء کرام سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک عرصہ بابا نانک

نے صوفیاء کرام کے ساتھ گزارا، اسلام سے بالخصوص توحید اور مساوات سے متاثر ہوئے اور اس حد تک متاثر ہوئے کہ بابا نانک نے حج کیا، مدینہ منورہ حاضری دی، اور بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی قبر پر چلہ بھی کاٹا، لیکن بعد میں بات گڈ مڈ ہوگئی۔

ہندوؤں میں ذات پات کا فرق ہے، برہمن کا دائرہ اور ہے، شودر کا دائرہ اور ہے، کھشتری کا دائرہ اور ہے، ویش کا دائرہ اور ہے۔ چار ذاتیں ہیں، چاروں کے آداب الگ ہیں، سب برابر نہیں سمجھے جاتے۔ گھٹیا ذات والے کو بہت حقیر سمجھا جاتا ہے، برابر بیٹھ نہیں سکتا، جس برتن میں کھانا کھا لے اس برتن کو پلید سمجھا جاتا ہے۔ ذات پات کا فرق ہندوؤں میں اب بھی ہے۔ بابا گرونانک کو بت پرستی کے علاوہ اس ذات پات کے فرق سے نفرت ہوئی اور اس نفرت میں پیچھے ہٹتے ہٹتے ان کا رجوع صوفیاء کرام کی طرف ہوگیا۔

ہمارے تصوف وسلوک کی بنیاد تو قرآن وسنت ہے لیکن کسی بھی سوسائٹی میں جا کر اثر ونفوذ کے لیے وہاں گھل مل کر سوسائٹی کی کچھ باتیں ہم نے اختیار کی ہیں تاکہ سوسائٹی کو متاثر کرسکیں۔ ہندوستان میں جب ہمارے صوفیاء کرام آئے تو بعض نے ہندو سوسائٹی کے ماحول میں خود کو پیش کرنے کے لیے جوگیوں وغیرہ کے طریقے اختیار کیے، جس کی وجہ سے ہم پر یہ الزام بھی ہوتا ہے کہ تصوف تم نے ہندوؤں سے لیا ہے۔ ایسا نہیں، بلکہ تصوف ہم اپنے ساتھ لائے تھے، تصوف کی بنیاد حضرت علیؓ اور حسن بصریؒ ہیں۔ اب چونکہ خانقاہی نظام اس درجے کا موجود نہیں ہے اس لیے سمجھ نہیں آرہا۔ خانقاہی نظام کیا تھا؟ اس میں تین باتیں ہوا کرتی تھیں:

(۱) ہر وقت اللہ کا ذکر

(۲) ہر وقت لنگر

(۳) اور جو بھی آئے اس سے پیار ومحبت سے بات کی جائے، کسی کی نفی اور کسی سے نفرت نہ کی جائے۔

برصغیر کی خانقاہوں کی یہ تین بنیادیں رہی ہیں۔ اسی ماحول کی وجہ سے ہمارے صوفیاء کرام لاکھوں لوگوں کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ کسی سے تعرض نہیں کیا، کسی سے مقابلہ نہیں کیا، جو بھی آیا اسے کھلایا پلایا، اسے اللہ اللہ کی تلقین کی، اللہ سے جوڑنے کی کوشش کی۔ جب وہ کچھ

مانوس ہوا تو آہستہ آہستہ اس کو کلمہ پر لے آئے۔ بابا گرونانک نے بھی صوفیاء کرام سے متاثر ہو کر ان کے پاس آنا جانا اور ان سے استفادہ شروع کیا۔ بالخصوص حضرت بابا فریدؒ اور حضرت میاں میرؒ سے انہیں بہت عقیدت تھی۔ اور صوفیاء کرام سے بابا نانک اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے حج بھی کیا اور بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی قبر پر چلہ بھی کاٹا، سکون کی تلاش میں۔

سکھ مذہب کا آغاز

بابا گرونانک ہندو مذہب سے نکلے مگر اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ قرآن مجید کی، حضورؐ کی اور اسلام کی باتوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن کلمہ نہیں پڑھا، اسلام قبول نہیں کیا۔ کچھ ہندو تصوف، کچھ مسلم تصوف، کچھ توحید، کچھ رسمیں اور کچھ ذکراذکار، ان سے ایک درمیانہ سا ملغوبہ بنا دیا۔ انہوں نے پیری مریدی شروع کر دی، ابتدا میں اس کی خانقاہی صورت تھی، بڑے صوفیاء کے پاس یہ جاتے، لوگ ان کے پاس آتے۔ انہوں نے گرنتھ کتاب لکھی جسے گروگرنتھ کہا جاتا ہے۔ یہ سکھوں کی مذہبی کتاب ہے، اس میں سنسکرت بھی ہے، پنجابی بھی ہے، قرآن کریم کی آیات بھی ہیں، جناب نبی کریمؐ کی احادیث بھی ہیں، بزرگوں کے اقوال بھی ہیں، اور بابا فرید کی کافیاں بھی ہیں۔

گردوارہ اور خانقاہ کی مناسبت

سکھ توحید پر بڑے پکے ہیں، بت پرستی اور شرک سے سخت نفرت ہے، ذات پات سے شدید نفرت ہے، ذکراذکار اور گرنتھ پڑھنے کا ماحول ہے۔ میں نے امرتسر گولڈن ٹیمپل اور برمنگھم (برطانیہ) میں ان کے بہت بڑے گردوارہ کے علاوہ اور بھی گردوارے دیکھے ہیں۔ ان کی عبادت کا ماحول آپ کو بتا دیتا ہوں۔ برمنگھم گردوارہ میں ہر وقت لنگر چلتا رہتا ہے اور ان کے بقول اوسطاً یومیہ پانچ ہزار آدمی وہاں کھانا کھاتے ہیں۔ جو بھی جائے، مسلمان ہو، عیسائی ہو۔ ایک دن مولانا سلمان ندوی، مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور میں گردوارہ دیکھنے گئے، انہوں نے اجازت دے دی۔ ہم نے کہا ہم آپ کا گردوارہ وزٹ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کے یومیہ معمولات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تشریف لائیں لیکن دو شرطیں ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ آپ کو گردوارے کی حدود میں ننگے پاؤں آنا پڑے گا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جب آپ بڑے ہال میں داخل ہوں گے تو گروگرنتھ کو سجدہ کریں

گے، ماتھا ٹیکیں گے۔ ہم نے کہا ہم یہ نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا اس کے بغیر ہال کے اندر جانا منع ہے۔ ہم نے کہا یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی کو ماتھا ٹیکیں۔

بڑے ہال کے چاروں طرف دروازے تھے، درمیان میں تپائی اور چوکی سی رکھی ہوئی تھی جس پر گرو گرنتھ بہت بڑے سائز کی کتاب پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک گرو بیٹھا ہوتا ہے جو گرنتھ پڑھتا رہتا ہے۔ چوبیس گھنٹے اس کو پڑھنا جاری رہتا ہے۔ دو دو گھنٹے ان کی ڈیوٹی ہوتی ہے گرنتھ پڑھنے کی۔ بتایا گیا کہ پانچ سال سے ایک گھنٹے کا وقفہ بھی نہیں پڑا۔ جو بھی جس دروازے سے داخل ہو وہ پہلے گرنتھ کو ماتھا ٹیکتا ہے۔ ہم نے جب ماتھا ٹیکنے سے انکار کر دیا تو وہ کچھ پریشان بھی ہوئے کہ مہمان ہیں ان کو خالی واپس بھیجیں گے، اور ہماری ضد پر ناراض بھی ہوئے۔ ہر گردوارے کے ساتھ ان کی ایک کمیٹی ہوتی ہے جو پنج پیارے کہلاتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہو تو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ ہمیں انہوں نے کہا کہ پنج پیاروں سے پوچھنا پڑے گا۔ ہم نے کہا پوچھ لیں۔ چنانچہ پنج پیاروں کی میٹنگ ہوئی، ایک گھنٹہ میٹنگ ہوتی رہی۔ اب یہ بھی ان کے لیے مشکل تھا کہ ہمیں واپس کریں کہ ان کے خیال میں ہم محترم مہمان تھے، اور یہ بھی قبول نہیں تھا کہ ہمیں سجدے کے بغیر اندر جانے کی اجازت دیں۔ بہر حال ایک گھنٹے کی میٹنگ کے بعد بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور کہا، اچھا آپ نے ماتھا نہیں ٹیکنا تو نہ ٹیکیں۔

انہوں نے تقریباً خانقاہی نظام کی نقل کی ہوئی ہے۔ ذکر اذکار، اللہ اللہ کرنا، تسبیح پڑھنا، گرنتھ کی تلاوت، اور لنگر جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ ہمارے صوفیاء کرام کے پرانے خانقاہی نظام میں بھی یہی باتیں ہوتی تھیں، مسلسل ذکر اذکار اور مسلسل لنگر کہ جو بھی آئے کھانا کھائے۔

مذہبی علامات

سکھوں کی کچھ علامتیں بھی ہیں۔ پنج ککے یعنی کاف سے شروع ہونے والی پانچ چیزیں:

(۱) کڑا: کڑا ہاتھ میں ضرور پہنتے ہیں۔

(۲) کیس: ان کے ہاں مذہبی طور پر جسم کا کوئی بال کاٹنا جائز نہیں ہے، بڑے بڑے بال ہو جاتے ہیں جنہیں سنبھالنا پڑتا ہے، ان کا جوڑا بناتے ہیں، داڑھی سمیٹی ہوتی ہے،

(۳) کنگھا: کنگھا لازمی ان کے پاس ہوتا ہے۔

(۴) کچھا: کچھا ضرور پہنتے ہیں۔

(۵) کرپان: کرپان ہاتھ میں رکھتے ہیں، جو خنجر سے بڑی اور تلوار سے چھوٹی ہوتی ہے۔

سکھ داڑھی رکھتے ہیں اور پگڑی ضرور باندھتے ہیں، انہوں نے پگڑی کے لیے بڑی لڑائی لڑی ہے کہ یہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ برطانیہ میں بھی انہوں نے اپنا حق منوایا ہے، امریکہ میں بھی منوایا ہے۔ یہ ان کی چند علامات ہیں۔

صوفیاء کرام سے اب بھی بہت محبت کرتے ہیں، آپ کسی سکھ کے سامنے بابا فریدؒ کا نام لے لیں تو وہ آپ کا معتقد ہو جائے گا۔ میں ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں، لندن میں ایک جگہ میں نے بیگ خریدنا تھا، ایک سکھ کی دکان پر چلا گیا کہ پنجابی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے ایک اچھا سا بیگ پسند کیا۔ باتوں باتوں میں بابا فریدؒ کی ایک کافی میں نے پڑھ دی۔ دکان کا مالک کہنے لگا اب آپ سے پیسے کیوں لینے ہیں، آپ تو بابا فریدؒ کے ماننے والے ہیں، چنانچہ اس نے مجھ سے پیسے نہیں لیے۔

امرتسر گولڈن ٹیمپل کا سنگِ بنیاد حضرت میاں میرؒ کے ہاتھوں

امرتسر کا معنی ہے آب حیات۔ امرتسر میں جو گولڈن ٹیمپل ہے، اس میں جانے کے لیے اس کے گرد احاطہ کیے ہوئے پانی کے چشمے میں پاؤں دھو کر ننگے پاؤں جانا پڑتا ہے۔ اس پانی کی ان کے ہاں وہی حیثیت ہے جو ہمارے ہاں زمزم کی ہے۔ گولڈن ٹیمپل کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے انہوں نے حضرت میاں میرؒ سے درخواست کی۔ حضرت میاں میرؒ ہمارے اکابر صوفیاء میں سے ہیں، لاہور میں ان کا مزار ہے۔ ہر سال میلہ لگتا ہے۔ میاں میرؒ یہاں سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیدل امرتسر گئے تھے اور گولڈن ٹیمپل کا سنگ بنیاد رکھا۔

یہ تو سکھوں کا مذہبی پہلو تھا کہ ہندوؤں سے الگ ہو گئے لیکن مسلمانوں میں شامل نہیں ہوئے، اور سکھ مت ایک نیا مذہب بن گیا جو پانچ سو سال سے چل رہا ہے۔

مغلوں کے ساتھ کشمکش

ابراہیم لودھی نے بابا گرونانک کو گرفتار کر لیا تھا، چار پانچ مہینے گرفتار رہے۔ بابر نے جب سلطنت حاصل کی تو انہیں رہا کر دیا اور عزت واکرام سے پیش آیا۔ جب بابا گرونانک فوت ہوئے

تو ان کے بعد ان کے جو جانشین بنے وہ گرو کہلاتے تھے۔ سات پشتوں تک سکھوں کے تعلقات مغلوں کے ساتھ ٹھیک رہے۔ اس وقت تک یہ کچھ ترقی کر گئے تھے، کچھ منظّم ہو گئے تھے، لاکھوں لوگ ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ ان کے آٹھویں گرو رائے تیغ بہادر نے مغلوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ یہ اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔ اس کشمکش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اورنگزیب نے جب حکومت حاصل کی تو باپ شاہجہان کو دہلی کے قلعے میں بند کر دیا تھا۔

اورنگزیب کی اپنے بھائیوں داراشکوہ اور شجاع کے ساتھ جنگیں ہوئی تھیں۔ باپ کی طرف سے داراشکوہ ہی نامزد تھا، وہ بھی صوفی طرز کا آدمی تھا، حضرت سلیم چشتیؒ کا مرید تھا اور ہندو جوگیوں کے ساتھ مل کر ملا جلا تصوف رکھتا تھا۔ جبکہ اورنگزیب بڑا موحد، دیندار اور کٹر سنی تھا۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اورنگزیب تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کا آدمی تھا، اس تحریک نے جو لوگ تیار کیے ان میں سے ایک تھا، اورنگزیب نے اسی مشن کے مطابق کام کیا تھا۔ اورنگزیب کی داراشکوہ اور شجاع سے دہلی کے اقتدار کے لیے لڑائی ہوئی، اس جنگ میں سکھوں نے داراشکوہ کا ساتھ دیا۔ سکھ پوری جماعت کی حیثیت سے داراشکوہ کے ساتھ تھے، بڑی شدید جنگ ہوئی تھی۔ اورنگزیب نے داراشکوہ اور شجاع کو شکست دے کر قتل کر دیا تھا اور دہلی کا اقتدار سنبھال لیا تھا۔ اس کشمکش میں چونکہ سکھ اورنگزیب کے خلاف تھے اس لیے ظاہر بات ہے اورنگزیب نے ان کو برداشت نہیں کرنا تھا۔ ان کے آٹھویں گرو رائے تیغ بہادر کو اورنگزیب نے گرفتار کر کے قتل کر دیا تھا۔ پھر نویں گرو کے بعد انہوں نے کسی شخص کو گرو نہیں بنایا، بلکہ کہا کہ گرنتھ ہمارا گرو ہے، اسے کون قتل کرے گا؟ گرنتھ کو گرو بنا لیا اور اب تک گرنتھ ہی ان کا گرو ہے، اس لیے اسے گرو گرنتھ کہتے ہیں۔ اورنگزیب نے چونکہ ان کو خاصا پریشان کیا تھا اس لیے اورنگزیب کو رنگا کہتے ہیں۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ لندن میں ساؤتھال کے علاقے میں میرا جانا رہتا تھا۔ وہاں سکھ اکثریت ہے، ان سے میل ملاقات بھی رہتی تھی۔ وہاں ایک پروفیسر تھے، ایک دن میں نے ان سے کہا سردار جی! آپ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جو کچھ ہمارے ساتھ کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جنرل بخت خان نے دہلی پر قبضہ کر لیا تھا، وہاں سے انگریزوں کو نکال دیا تھا۔ پنجاب سے سکھوں کی پندرہ ہزار تازہ دم فوج گئی، انہوں نے قبضہ چھڑوا کر انگریزوں کو بحال کیا تھا، یہ

تاریخی واقعہ ہے۔ اور پھر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں مشرقی پاکستان میں جو سلوک ہمارے ساتھ کیا ہمیں قیامت تک نہیں بھولے گا، یہ زخم ہمیشہ تازہ رہیں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا، ٹھیک ہے یہ ہم نے کیا، لیکن جو ہمارے ساتھ رنگے (اورنگزیب) نے کیا تھا وہ بھی ہمیں قیامت تک نہیں بھولے گا۔ ان کی بات بھی ٹھیک تھی، اورنگزیب نے ان کے ساتھ اچھا خاصا کیا تھا وہاں سے کشمکش شروع ہوئی۔

سکھ ریاست

ان کا سیاسی پہلو یہ ہے کہ جب اورنگزیب کے بعد مغلوں کی حکومت کمزور ہوئی اور مسلسل زوال کا شکار ہوئی تو سکھ پنجاب کے علاقے میں خاصے پھیل چکے تھے۔ انہوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ جس طرح ہندوستان کے باقی لوگ خود مختار ہونے لگے، یہ بھی خود مختار ہونے لگے۔ سیاست میں مقابلے پر تو یہ گرو تیغ بہادر کے زمانے میں ہی آ گئے تھے، اورنگزیب کے بعد ان کو موقع ملا تو انہوں نے سکھ ریاست کا آغاز کیا۔ مذہب کا آغاز ننکانہ صاحب سے، اور سکھ ریاست کا آغاز گوجرانوالہ سے ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ شیرانوالہ باغ میں مہان سنگھ، جو کہ رنجیت سنگھ کا باپ تھا، کی مڑھی بھی ہے۔ ہمارے ہاں تو مردے کو دفن کیا جاتا ہے، ہندوؤں کے ہاں روایت چلی آ رہی ہے کہ مردے کو جلایا جاتا ہے، جلا کر اس کی راکھ کو کسی مٹی کے برتن میں محفوظ کیا جاتا ہے، اس کو کہیں دفن کیا جاتا ہے وہ مڑھی کہلاتی ہے۔ اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے گاؤں ہوتے تھے جو مسل کہلاتے تھے، رنجیت سنگھ ایک مسل کا حکمران تھا، ایسے ہی سمجھ لیں جیسے پہلے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نواب ہوتے تھے۔

جب انگریز برصغیر سے گیا تو یہاں اس طرح کی پانچ سو ریاستیں تھیں۔ رنجیت سنگھ کی بارہ دری شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں ہے۔ گوجرانوالہ ان کا دارالحکومت رہا ہے، پھر ایمن آباد شہر دارالحکومت رہا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ سکھوں نے حکومت قائم کرنا شروع کی۔ پھر لاہور ان کے قبضے میں آیا، آگے ملتان تک گئے، انبالہ لدھیانہ تک، شمال کی طرف ہزارہ، ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، مردان، بنوں، گلگت بلتستان، پشاور، کشمیر اس پورے علاقے پر سکھوں نے قبضہ کیا۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت عروج پر تھی تو ملتان سے لے کر کابل تک حکومت تھی۔

۱۸۵۷ء سے دس سال پہلے تک یہ علاقہ سکھوں کا ملک رہا ہے۔ ۱۸۴۵ء یا ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے ان کو شکست دی اور ان علاقوں پر قبضہ کیا۔ مسلمانوں کے ساتھ سکھوں کے تعلقات کا ایک وہ دور تھا جب مغلوں سے علاقے چھین کر انہوں نے اپنی ریاست بنائی، مغل کمزور پڑ گئے تھے، انہوں نے یہ سارے علاقے مغلوں سے ہی چھینے تھے۔

معرکہ بالاکوٹ کا پس منظر

اس کے بعد ہمارا اور سکھوں کا جو بڑا معرکہ ہوا وہ ہے بالاکوٹ کا معرکہ۔ اس میں انگریز پیچھے بیٹھ کر ان کو سپورٹ کر رہا تھا اور تماشا دیکھ رہا تھا۔ ہوا یوں کہ جب شاہ عالم ثانی کے زمانے میں دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا اعلان ہوا تو شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے اس ملک کو دار الحرب قرار دے دیا۔ آزادی کی جنگ کی فرضیت کا حکم دے دیا تو شاہ اسماعیل شہیدؒ جو آپؒ کے شاگرد اور بھتیجے تھے، سید احمد شہیدؒ ان کے شاگرد تھے، انہوں نے ٹونک ریاست کی فوج میں شامل ہو کر ٹریننگ حاصل کی۔ یہ ۱۹۳۰ء سے پہلے کا زمانہ تھا۔ اس دور کا منظر یہ تھا کہ پنجاب سکھوں کی آزاد ریاست تھی جبکہ سندھ، راجھستان اور افغانستان مسلمانوں کی آزاد ریاست تھی۔ انہوں نے منصوبہ بنایا کہ آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے پہلے بیس کیمپ بنائیں گے، اس کے لیے پشاور کا انتخاب کیا، اس لیے کہ پیچھے افغانستان کی آزاد ریاست ہے، بیس کیمپ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خود مختار علاقہ ہو اور اس کے ساتھ کسی آزاد ملک کی سرحد ہو، یعنی پشت پر قوت بھی ہو، ویسے ہی درمیان میں بیٹھ جانا حماقت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حکمت عملی یہ اختیار کی، اور ابتدا کی اصلاح معاشرہ کے نام سے۔

شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کے ابتدائی ایک دو سال میں جہاد کا لفظ نہیں ملے گا۔ پنجاب کی کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ سکھوں کے مسلسل اقتدار کی وجہ سے دیہات کی مسجدیں ویران ہوگئی تھیں۔ بادشاہی مسجد گھوڑوں کا اصطبل تھی۔ تو انہوں اذان اور نماز بحال کرنے، مسجدیں آباد کرنے، اصلاح رسوم اور اصلاح معاشرہ کے عنوان سے سلسلہ شروع کیا۔ پورے علاقے کا دورہ کیا اور جماعت بنائی۔ پھر پورا قافلہ حج پر گیا۔ اس کے بعد دہلی سے راجھستان اور سندھ وغیرہ سے ہو کر پشاور پہنچے۔ سندھ میں تالپوروں کی حکومت تھی، ابھی انگریزوں نے قبضہ نہیں کیا تھا اور حضرت شاہ

محمد راشد قادری، جن سے سلسلہ عالیہ قادریہ راشدیہ منسوب ہے، کے زمانے میں ان کے ہاں پیر جوگوٹھ کی خانقاہ میں مہمان رہے، شاہ محمد راشدؒ کے مریدین بھی اس وقت سے جہاد سے جڑے، حروں کا سارا گروہ اور پیر پگارا سب وہی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ بگاڑ آتا گیا۔ میں نے پیر جوگوٹھ میں وہ علاقہ دیکھا ہے جہاں ان کا ٹھکانہ ہوتا تھا، اور مجھے بتایا گیا کہ جب ہجرت اور جہاد کی نیت سے وہ آگے نکل رہے تھے تو ان کے خاندان بھی ساتھ تھے۔ پیر صاحب آف پگارا شاہ محمد راشدؒ نے ان سے کہا کہ آپ خاندان ساتھ نہ لے جائیں، یہاں چھوڑ جائیں ہم حفاظت کریں گے۔ وہ محلّہ میں نے دیکھا جہاں وہ خاندان چھوڑ کر آگے نکلے تھے۔ پشاور میں ۱۸۳۰ء میں ان کی جنگ ہوئی، انہوں نے پشاور فتح کیا، پنجتار کا علاقہ صوابی کے ساتھ ان کا سالہا سال تک مرکز رہا ہے۔ میں نے وہ تربیتی مرکز بھی دیکھا ہے۔ ۱۸۳۰ء میں ان کی حکومت قائم ہوئی، انہوں نے یہ علاقہ سکھوں سے چھینا تھا۔ مگر ان کی حکومت چھ ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی، ان کو نظر آگیا تھا کہ یہاں ہمارا چلنا مشکل ہے، تو پھر متبادل پناہ گاہ اور بیس کیمپ کی تلاش میں تھے۔

مظفر آباد کشمیر کے علاقے کے لوگوں نے ان سے رابطہ قائم کیا کہ آپ ہمارے پاس آجائیں، یہاں مرکز بنائیں گے۔ چنانچہ یہ پورا قافلہ اوپر کے راستے سے، کیونکہ شیر سنگھ رنجیت سنگھ کا بیٹا ان کے تعاقب میں تھا، مظفر آباد جاتے ہوئے بالاکوٹ تک پہنچے، وہاں ان کا ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مقابلہ ہوا جس میں انہیں شکست ہوئی اور وہاں شہید ہوئے۔ پلاننگ ان کی یہ تھی کہ علاقے پر قبضہ کر کے اپنی حکومت بنائیں گے۔

’’مکاتیب سید احمد شہیدؒ‘‘ مولانا سید نفیس الحسینیؒ نے بڑی محنت کر کے چھپوائے ہیں، اس وقت کے معاصرین سے ان کی خط و کتابت اس میں مذکور ہے، اس سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس پر اگر آپ پڑھنا چاہیں تو غلام رسول مہر مرحوم کی ’’سرگذشت مجاہدین‘‘ اور مولانا علی میاںؒ کی ’’تاریخ دعوت وعزیمت‘‘ میں آپ کو تفصیلات ملیں گی۔ پھر ۱۸۵۷ء کا معرکہ پورے ملک میں ہوا۔ دہلی وغیرہ میں جنرل بخت خان اور شاملی کے محاذ پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہ سبھی بزرگ، کوئی انبالہ میں، کوئی میرٹھ میں، کوئی دہلی میں، مختلف بغاوتیں ہوئیں۔ دہلی پر جنرل بخت خان نے قبضہ کر لیا۔ پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، سکھوں کے ساتھ ان کے

معاہدات ہو گئے، اس معاہدہ کے تحت انگریزوں نے سکھوں کی مدد کی تھی اور دہلی پر انگریزوں نے قبضہ واپس لے لیا۔

۱۸۵۷ء تک کی داستان یہ تھی، جس سے پہلے ہماری ہندو، سکھ، مسلم کی آپس میں لڑائیاں چلتی رہی ہیں۔ احمد شاہ ابدالیؒ کی پانی پت میں لڑائی ہندوؤں سے ہوئی تھی۔ سکھ ہندو اور مسلمان آپس میں متحارب طاقتیں تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صورتحال بالکل بدل گئی، پورے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہندو، سکھ اور مسلمان سبھی محکوم ہو گئے۔ اس سے آزادی کی تحریک کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

تحریک آزادی میں کردار اور پنجاب کی تقسیم

آزادی کی مسلح تحریکوں اور سیاسی تحریکوں میں سکھ بھی شامل تھے۔ پاکستان بننے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پاکستان کے قیام کے موقع پر ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی اکثریت تھی، مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس زمانے میں بہت سے دانشوروں نے کوشش کی کہ پنجاب تقسیم نہ ہو، سکھ اور مسلمان اکٹھے رہیں، لیکن سکھوں نے انکار کر دیا۔ اگر سکھ پاکستان کی تحریک کا ساتھ دیتے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب دو صوبے الگ بن جاتے، خون ریزی نہ ہوتی، اور کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ ماسٹر تارا سنگھ ان کے بڑے لیڈر تھے، پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے باہر تلوار لہرا کر کہا تھا کہ ہم اس تلوار کے ساتھ پاکستان کو روکیں گے، پھر وہ تلوار جو چلی اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا، الامان الحفیظ۔

تقسیمِ ہند کے بعد سکھوں کی صورتحال

اس کے بعد سکھ ہندوستان کا حصہ چلے آ رہے ہیں لیکن مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک دور میں خالصتان کی تحریک شروع کی اور مطالبہ کر دیا کہ انہیں الگ کر دیا جائے۔ ''خالصہ'' ان کی اصطلاح ہے، بہادر آدمی اور جنگجو خالصہ کہلاتے ہیں، اور سنگھ بھی شیر کو کہتے ہیں۔ ایک اور بات دلچسپی کی یہ ہے کہ سکھوں نے ایک دور میں قادیانیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی

نے بابا گرونانک کو پیغمبروں کی فہرست میں لکھا ہے۔ لندن میں قادیانی بھی خاصے ہیں اور سکھ تو بہت زیادہ ہیں۔ انہوں نے وہاں تحریک یہ چلائی تھی کہ خالصتان کو الگ کیا جائے۔ اس کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان سے بین الاقوامی مطالبہ کیا گیا کہ ننکانہ صاحب اور قادیان کو اوپن سٹی قرار دیا جائے۔ اوپن سٹی کا معنی اندرونی خودمختاری کہ ان کی اپنی حکومت ہو۔ اس کے لیے بڑی کمپین ہوئی لیکن ان کو جلدی سمجھ آ گیا کہ قادیانیوں کو ساتھ ملانا فائدہ مند نہیں ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ سکھ اپنی آزاد ریاست چاہتے ہیں، ضیاء الحق مرحوم نے ان کو سپورٹ بھی کیا تھا۔ اگر ضیاء الحق مرحوم زندہ ہوتے تو وہ تحریک کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہوتی لیکن ان کی تحریک ناکام رہی۔ کشمیر والے تو لڑ رہے ہیں، سکھ لڑ نہیں رہے لیکن ان کی خواہش ہے کہ ہم آزاد ہوں۔

سکھوں کی زیادہ تر آبادی مشرقی پنجاب میں ہے، برطانیہ میں بھی سکھوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ مشرقی پنجاب کے بعد ان کا سب سے بڑا مرکز کینیڈا ہے۔ وہاں کی سیاست میں بھی ان کا عمل دخل ہے اور ابھی دو سال پہلے کینیڈا نے پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔ سکھ بولتے پنجابی ہیں، لکھتے گرمکھی میں ہیں۔

ایک واقعہ سناتا ہوں، جس زمانے میں طالبان کی حکومت تھی، مجھے ایک وفد کے ساتھ کابل جانے کا اتفاق ہوا۔ کابل میں سکھ خاصے آباد تھے، وہاں بازار میں سکھوں کی کپڑے کی چند دکانیں نظر آئیں، میں ایک دکان میں داخل ہوا اور پنجابی میں کہا سردار جی کیا حال ہے؟ وہ بڑے خوش ہوئے، چائے وغیرہ منگوائی۔ ہماری گفتگو چل پڑی۔ زبان کا انس بڑا انس ہوتا ہے اور میں ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے سوال کیا سردار جی! یہ مولویوں کی (طالبان کی) حکومت آئی ہے تو آپ نے کیا محسوس کیا، کیا فرق پڑا ہے؟ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا، گیانی جی! (مولوی کو گیانی جی کہتے ہیں) جب سے مولوی آئے ہیں ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔ میں نے پوچھا، کیا مطلب؟ کہنے لگا پہلے بہت افراتفری تھی، کوئی امن نہیں تھا، ہم تین باپ بیٹے ہیں، آٹھ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دیتے تھے، ایک جاگتا تھا دو سوتے تھے۔ اب مولوی پہرا دیتے ہیں اور ہم سوتے ہیں۔ میں نے اس پر ایک کالم میں پوری تفصیل لکھی تھی۔

آج میں نے سکھوں کا کچھ اجمالی تعارف کروایا ہے کہ یہ ہماری معاصر قوم ہے اور پڑوسی قوم

ہے۔ ہمارے ساتھ ان کے جھگڑے بھی ہیں، کئی معاملات میں صلح بھی ہے، لیکن یہ ایک مذہب چل رہا ہے جو کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود ہے۔

بھارت کے اسفار

دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات

گزشتہ شمارہ میں دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ایک مختصر اور سرسری رپورٹ پیش کر چکا ہوں۔ مجھے چونکہ تقریبات کے آخری دن دیوبند پہنچنے کا موقع ملا تھا اس لیے زیادہ تفصیلات قلمبند نہ ہو سکیں۔ غالباً دارالعلوم کا دفتر اہتمام تقریبات کی تفصیلی رپورٹ باضابطہ طور پر جلد جاری کر رہا ہے جس سے قارئین تقریبات کی تفصیلات سے آگاہ ہو سکیں گے۔ آج کی معروضات میں دیوبند، دہلی، سہارنپور اور بھارت کے دیگر شہروں میں حاضری کے سلسلہ میں اپنے ذہنی تاثرات قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

صد سالہ تقریبات کی اہمیت

دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات جہاں اس لحاظ سے اہمیت کی حامل تھیں کہ ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی اپنی ایک صدی کی جدوجہد پر نظر ڈالتے ہوئے اگلی صدی کے سفر کا آغاز کر رہی ہے اور اس نے تقریبات کے عنوان سے اپنے تمام رفقاء وانصار کو جمع کر کے نئی صف بندی کا اہتمام کیا ہے، وہاں ان تقریبات کی اہمیت اس لحاظ سے بھی کم نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد یہ بھارت میں مسلمانوں کا غالباً پہلا سب سے بڑا اجتماع تھا جس سے مسلمانوں نے بھارتی سیاست میں توازن کی قوت حاصل کرنے کے بعد اپنی اجتماعیت کا شاندار مظاہرہ کیا ہے۔ اور ان تقریبات میں بیس لاکھ کے قریب مسلمانوں کے اجتماع کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے مسلمانوں کے مؤقر وفود کی شرکت سے بھارتی مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور ان کے ساتھ عالم اسلام کی برادرانہ وابستگی کا پرجوش اظہار ہوا ہے۔

دیگر اداروں کا تعاون

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے سلسلہ میں دیگر مسلم اداروں نے بھی دارالعلوم سے بھرپور تعاون کیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا سید اسعد مدنی نے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے اجلاس کے اخراجات کے لیے کم وبیش دس لاکھ روپے جمع کر کے دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ روزنامہ الجمعیۃ دہلی نے اس موقع پر اچھا خاصا دارالعلوم نمبر شائع کیا۔ اس کے علاوہ بھارت کے ایک درجن سے زائد ہفتہ وار اور ماہوار جرائد نے خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا جن مین تجلی دیوبند، عوام دہلی، ہجوم دہلی اور ندائے ملت لکھنو بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند نے دیوبند میں بیرونی وفود کے اعزاز میں کھانے کی پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا اور دہلی میں بھی بیرونی مندوبین کو ایک پرہجوم عصرانہ دیا۔ دیوبند میں مولانا سید اسعد مدنی کی قیام گاہ پر مہمانوں کا مستقل ہجوم رہا اور ان مہمانوں کے قیام وطعام کے علاوہ ان کے دیگر مسائل مثلاً پاسپورٹ ویزا وغیرہ کے سلسلہ میں بھی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے جانشین مولانا سید اسعد مدنی اور ان کے برادران مولانا ارشد مدنی ومولانا اسجد مدنی ہمہ تن مصروف ومتحرک رہے۔ دہلی میں جمعیۃ کا مرکز مہمانوں کے قیام وطعام اور راہنمائی کا مرکز بنا رہا۔ جمعیۃ علماء ہند نے جلسہ گاہ میں بھی سستے کھانے کے ہوٹلوں کا انتظام کیا اور مولانا سید اسعد مدنی کی سربراہی میں قائم مالیاتی ادارہ ''مسلم فنڈ'' نے جابجا اسٹال لگائے جہاں مندوبین کی راہنمائی کے علاوہ دارالعلوم کے لیے عطیات وصول کرنے کا بھی اہتمام تھا۔ ''مسلم فنڈ'' مسلمانوں کو بلاسود قرضے فراہم کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے اور ایک رپورٹ کے مطابق پونے تین کروڑ روپے کے مالیت کے قرضے مسلمانوں کو مہیا کر چکا ہے۔ دیوبند میں مسلم فنڈ کی اپنی عمارت ہے جہاں مسلم فنڈ کا مرکزی دفتر ہے اور پورے نظام کو وہاں سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔

صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں طبی ادارہ ''ہمدرد'' کے طبی امداد کے کیمپ بھی دیکھے اور انڈین یونین مسلم لیگ نے بھی جلسہ گاہ میں طبی کیمپوں کا اہتمام کیا۔ ان کے علاوہ بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے فرزند مسٹر سنجے گاندھی کی طرف سے مندوبین کے لیے کھانے کا اسٹال تین دن تک

لگا رہا جہاں سے ہزاروں مندوبین نے ہر روز بلا معاوضہ کھانا تناول کیا۔

اجلاس میں مسز اندرا گاندھی کی شرکت

پاکستان واپسی پر معلوم ہوا کہ یہاں یار لوگوں کو دارالعلوم کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں طعن واعتراض کی اور کوئی بات نہیں ملی تو اجلاس میں مسز اندرا گاندھی کی شمولیت اور ۲۳ مارچ کے دن اجلاس کے انعقاد کو ہدف تنقید بنالیا اور اس سلسلہ میں کافی لے دے ہو رہی ہے۔ جہاں تک ۲۳ مارچ کے روز صد سالہ تقریبات کے انعقاد اور اعتراض کا تعلق ہے یہ اعتراض اس قدر مہمل ہے کہ معترضین کی عقل کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ اس سے ۲۳ مارچ کی اہمیت میں کمی نہیں اضافہ ہوا ہے۔ ۲۳ مارچ کو قرار دادِ پاکستان منظور کر کے پاکستان کے باقاعدہ مطالبہ کا آغاز کیا گیا تھا اس لحاظ سے یہ دن ہمارے لیے قومی اہمیت کا حامل ہے اور اسی روز بھارتی مسلمانوں نے آزادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی قوت کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔ اگر قرار داد پاکستان والے ۲۳ مارچ اور بھارتی مسلمانوں کے دیوبند میں عظیم اجتماع والے ۲۳ مارچ کے درمیان مثبت تعلق تلاش کیا جائے تو یہ اس منفی جوڑ سے زیادہ روشن نظر آئے گا جسے کرید نے کی معترضین نے بیجا کوشش کی ہے۔

اسی طرح مسز اندرا گاندھی کی شرکت کو اگر ہم اپنے نقطہ نظر اور مصلحتوں کی بجائے بھارت میں بسنے والے سولہ کروڑ مسلمانوں کی مصلحت اور نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہمارا اعتراض ایثار اور برادرانہ مصلحت سے خالی نظر آتا ہے۔ بھارتی مسلمان جس حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انہوں نے گزشتہ انتخابات میں مجموعی حیثیت سے مسز اندرا گاندھی کی کانگریس کا ساتھ دیا ہے اور مسز گاندھی سے کچھ توقعات وابستہ کی ہیں۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کا یہ اجلاس اس کی صد سالہ خدمات کے تذکرہ کے لیے منعقد ہوا ہے اور اس کی صد سالہ جدوجہد کا سب سے روشن پہلو آزادی کی جنگ میں اس کا قائدانہ کردار ہے، اس لیے آزادی کی جنگ میں اس کے شرکاء کی شرکت واعتراف کے بغیر دارالعلوم کی صد سالہ جدوجہد کا تذکرہ مکمل ہی نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس میں مسز اندرا گاندھی، بابو جگجیون رام اور راج نرائن کی شرکت کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور اس کا صحیح عمل بھی یہی ہے۔

بھارتی مسلمانوں کی حالت

بھارت میں مسلمانوں کی مجموعی صورتحال سیاسی طور پر پہلے سے بہتر ہے۔ اس وقت سیاسی طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے، پارلیمنٹ میں مسلمانوں کو ساٹھ کے قریب نشستیں حاصل ہیں، کم وبیش ہر جماعت میں مسلمان موجود ہیں مگر زیادہ تر مسلمان اندرا کانگریس کے ساتھ ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند جو مسلمانوں کی سب سے قدیم اور مؤثر جماعت ہے، عملی سیاست سے کنارہ کش ہے لیکن اس کا زیادہ تر تعاون اندرا کانگریس کو حاصل رہتا ہے۔ بریلوی مکتب فکر کے علماء نے بھی آل انڈیا سنی جمعیۃ العلماء کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے جس کے سیکرٹری جنرل مولانا مظفر حسین کچھوچھوی اندرا کانگریس کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد کے امام سید عبداللہ بخاری نے بھی انتخابات میں اندرا گاندھی کی حمایت کی ہے۔

معاشی طور پر مسلمان کمزور نظر آتے ہیں، زیادہ تر مزدور پیشہ ہیں، ملازمتوں میں ان کا تناسب کم ہے جس کی بڑی وجہ مسلم راہنماؤں کے نزدیک مسلمانوں میں جدید تعلیم کے رجحان کی کمی ہے، تجارت میں بھی مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہے۔ البتہ اخلاقی و دینی لحاظ سے ان کی حالت بہت بلند ہے، دین کے ساتھ والہانہ عقیدت کے ساتھ ساتھ عمل کا جذبہ اور رجحان بھی موجود ہے۔ دہلی، میرٹھ، دیوبند اور سہارنپور میں مساجد کی آبادی دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا۔ مشرقی پنجاب میں بھی جہاں ۱۹۴۷ء کی دہشت خیزی کے بعد مسلمانوں کا وجود کم وبیش مٹ ہی گیا تھا، مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ اور مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کی مساعی سے ۱۹۵۶ء کے بعد مسلمانوں کی آبادی اور مساجد کی واگزاری کا عمل شروع ہوا جس کے نتیجہ میں اس وقت تک مشرقی پنجاب میں ساڑھے تین سو مساجد واگزار اور آباد ہو چکی ہیں۔ صرف لدھیانہ میں کم وبیش تیس ہزار مسلمان آباد ہیں اور پانچ مقامات پر جمعہ کی نماز ادا ہوتی ہے۔ الغرض دینی وسیاسی طور پر مسلمانوں کی مجموعی صورتحال اور پیشرفت حوصلہ افزا ہے۔

ملکی وسائل پر انحصار

بھارت میں چھ روزہ قیام کے دوران جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بھارتی باشندوں

کا ملکی وسائل پر انحصار کا اجتماعی رجحان ہے۔ وہاں میں نے سہل پسندی، نمائش اور بیرونی اشیاء کے فخر کے ساتھ استعمال کی وہ کیفیت نہیں دیکھی جو ہمارے ہاں پورے عروج پر ہے۔ چھ روز کے سفر میں دو غیر ملکی موٹریں نظر سے گزریں، ایک دیوبند میں جو لاہور کے ایک بزرگ لے کر گئے تھے، ایک لدھیانہ میں جس کے بارے میں تحقیق نہ کی جا سکی۔ وہاں خود انڈیا کی تیار کردہ گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں اور وہ بھی بہت کم، سڑکوں پر کاروں کا ہجوم نظر نہیں آتا، شہروں میں سائیکل رکشا زیادہ چلتا ہے۔ تھوڑا بہت آٹو رکشا بھی دکھائی دیتا ہے اور وہ بھی انڈیا کا بنا ہوا۔ جن بسوں پر سفر کیا وہ انجن اور باڈی کے لحاظ سے مضبوط تھیں، ہماری طرح کے سجے سجائے کاغذی بادام سڑکوں پر دوڑتے نہیں دیکھے۔ لباس اور وضع قطع میں بھی یورپ کی نقالی کا رجحان ہماری بہ نسبت کم ہے بالخصوص سکھوں میں اپنی مذہبی وضع قطع پر سختی کے ساتھ کاربند رہنے کا رجحان نمایاں ہے۔ ہماری بھارت میں موجودگی کے دوران ایک سکھ لیڈر کا اکالی دل سے یہ مطالبہ اخبارات میں شائع ہوا کہ آئندہ انتخابات میں کسی ایسے سکھ کو اکالی دل کا ٹکٹ نہ دیا جائے جو داڑھی کترواتا ہو یا رنگتا ہو۔

افغانستان اور کمیونزم

افغانستان کے مسئلہ پر اندرا حکومت روسی مداخلت کی اصولی مخالفت کے باوجود روس کے خلاف کوئی واضح موقف اختیار کرنے کو تیار نظر نہیں آتی لیکن بھارتی رائے عامہ کا رجحان اس سے مختلف ہے۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھارتی باشندوں نے افغانستان میں روسی مداخلت کی مذمت کرتے ہوئے روسی افواج کی واپسی کا مطالبہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد کنونشن اور جلسے منعقد ہوئے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے ایک جلسہ میں اسی موقف کا اظہار کیا اور دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر بھی اسی نوعیت کی قرارداد منظور کی گئی۔

کمیونزم کی پیشرفت پر بھارتی رائے عامہ کا ردعمل مثبت نہیں ہے۔ بھارتی معاشرہ بنیادی طور پر مذہبی ہے، مختلف مذاہب سے وابستہ لوگ اپنے اپنے مذاہب سے اس قدر والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں کہ آپس میں بھی سر پھٹول سے باز نہیں آتے۔ آئے دن فرقہ وارانہ فسادات اس پر واضح ثبوت ہیں۔ ان حالات میں بھارتی معاشرہ کے بارے میں یہ قیاس درست نہیں ہے کہ وہاں کمیونزم قدم جما سکتا ہے یا بھارتی باشندوں کے دل میں کمیونزم کے بارے میں کوئی نرم گوشہ موجود ہے۔ مسلم،

ہندو، سکھ، عیسائی اور بدھ مت آپس میں انتہائی اختلاف رکھنے کے باوجود نفس مذہب کے تحفظ کے لیے ایک ہی جیسا جذبہ رکھتے ہیں اور افغانستان کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں اس کا کھلم کھلا اظہار ہوا ہے۔ اس لیے یہ بات اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بھارتی معاشرہ کمیونزم کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوگا۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور --- ۱۸ مارچ ۱۹۸۰ء)

دیوبند کا سفر

جنوبی افریقہ جاتے ہوئے آخری وقت مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ دیوبند اور دہلی میں ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ دسمبر کو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز کے حوالہ سے کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں جن میں شرکت کے لیے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا ایک بھرپور وفد جا رہا ہے، اور مولانا فضل الرحمان نے اس وفد میں میرا نام بھی شامل کر رکھا ہے۔ میں نے اس کرم فرمائی پر ان کا شکریہ ادا کیا، لیکن اس وقت میں ویزے کے لیے پاسپورٹ ان کے سپرد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، اس لیے واپسی پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور جنوبی افریقہ جانے والے علماء کرام کے وفد سے پہلے پاکستان واپس پہنچ گیا۔ مولانا فضل الرحمان نے بطور خاص میرے لیے دوبارہ کوشش فرمائی اور میرا ویزا بھی لگ گیا، بحمد اللہ تعالیٰ۔ چنانچہ آج بدھ کے روز جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے وفد کے ساتھ دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ ہفتہ کے لگ بھگ تو لگ ہی جائے گا اور کوشش کروں گا کہ اس سفر میں بھی حسب عادت قارئین کو ساتھ ساتھ رکھوں، ورنہ واپسی پر داستان سرائی کا شوق پورا کر لوں گا۔

دیوبند اس سے قبل صد سالہ اجلاس کے موقع پر جانے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔ اس وقت حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی قیادت میں علماء کرام اور دینی کارکنوں کا ایک قافلہ دیوبند گیا تھا، والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی قافلہ میں شامل تھے۔ گوجرانوالہ کے دیگر علماء کرام کے ہمراہ ہم تینوں کا قیام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ کے مکان پر ہوا تھا اور اس موقع پر حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمیؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ، حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ، حضرت مولانا ازہر شاہ قیصرؒ اور کچھ دیگر بزرگوں کی زیارت کا

شرف میسر آیا تھا۔

والد محترمؒ اور عم مکرمؒ نے مجھے ایک دن بطور خاص دیوبند کے مختلف علاقوں کی سیر کرائی اور اپنے طالب علمی کے دور کی یادیں تازہ کرتے رہے۔ اب دوبارہ عازم دیوبند ہوتے ہوئے یہ ساری یادیں ایک ایک کر کے ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں۔ اس بات کو تین عشروں سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے مگر ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ میں نے سفر دیوبند کی یادداشتیں ایک مجلس میں آڈیو ریکارڈ کرائی تھیں مگر وہ کیسٹ دوبارہ دستیاب نہ ہو سکی۔ ہمارے بزرگ تو قافلہ کے ساتھ واپس آ گئے مگر میں کچھ دن کے لیے رک گیا۔ فیصل آباد کے مولانا محمد عابد نعیمؒ اور میں دہلی میں دو روز اکٹھے رہے۔ اس کے بعد میں نے لدھیانہ کا رُخ کر لیا تھا، جوانی کا زمانہ تھا، خطرات و خدشات عام طور پر ارادوں میں حائل نہیں ہوا کرتے تھے، اس لیے بے تکلف لدھیانہ جا پہنچا۔ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے فرزندان گرامی حضرت مولانا محمد احمد لدھیانویؒ اور حضرت مولانا سعید الرحمان لدھیانویؒ کے ہاں دو تین دن قیام رہا اور ان کی میزبانی کا لطف اٹھایا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز بچپن سے ہی میرے آئیڈیل شخصیت ہیں اور میں نے خود کو ہمیشہ ان کی فکری و سیاسی جدوجہد کا کارکن تصور کیا ہے۔ اس لیے دیوبند کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کی نسبت بھی اس سفر میں میرے لیے باعث کشش ہے۔ میں شعوری طور پر سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں نہ صرف عالم اسلام کی سطح پر بلکہ اقوام عالم کے ماحول میں بھی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے فکر و فلسفہ اور طرز و اسلوب کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ دیوبند اور دہلی میں منعقد ہونے والی یہ کانفرنسیں اس کارِ خیر کو آگے بڑھانے میں سنگ میل ثابت ہوں گی۔ ان کانفرنسوں اور مختلف شہروں کے سفر کے حوالہ سے قارئین کو آگاہ رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ سرِ دست یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس اچانک پروگرام کی وجہ سے ہفتہ دس دن (اگلے جمعہ تک) میں نے جن دوستوں سے مختلف پروگراموں کے لیے حاضری کا وعدہ کر رکھا ہے ان کے پاس حاضری نہ دے سکوں گا، اس کے لیے سب دوستوں سے معذرت خواہ ہوں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور ــــ ۱۲ دسمبر ۲۰۱۳ء)

لدھیانہ اور چندی گڑھ میں

دیوبند اور دہلی میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریبات میں شرکت کے لیے ۱۱ دسمبر کو مولانا فضل الرحمٰن کی قیادت میں ہم واہگہ بارڈر کراس کر کے بارہ بجے کے لگ بھگ انڈیا میں داخل ہوئے تو پروگرام یہ بنا کہ ظہر کی نماز امرتسر کی مسجد خیر دین میں ادا کریں گے۔ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی راہ نماؤں نے جو دہلی اور دیوبند سے تشریف لائے ہوئے تھے اور امرتسر کے بس ٹرمینل پر پاکستان کے قافلہ کا انتظار کر رہے تھے، استقبال اور خیر مقدم کے مرحلہ سے فارغ ہوتے ہی تقاضہ کیا کہ لدھیانہ میں دوپہر کا کھانا ہے، جبکہ رات کا قیام چندی گڑھ میں ہے، اس لیے جلد روانہ ہونا چاہیے۔ مگر مولانا فضل الرحمٰن نے اصرار کیا کہ ہم مسجد خیر دین میں نماز ظہر ادا کرنا چاہتے ہیں، اس لیے قافلے کا رخ لدھیانہ کی بجائے امرتسر کے اندرون شہر کی طرف مڑ گیا۔ مسجد خیر دین امرتسر کی تاریخی مسجد ہے، کہا جاتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا تأسیسی اجلاس اسی مسجد میں ہوا تھا اور آزادیٔ وطن تک یہ مسجد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت اور ان کے رفقاء کی تحریکی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے۔

میں اس سے قبل ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر یہاں آچکا ہوں مگر اس وقت مسجد پرانی تھی، اب یہ مسجد نئی اور وسیع تعمیر ہو چکی ہے۔ مولانا حامد حسن قاسمی مسجد کے امام وخطیب ہیں جو ۱۹۸۶ء سے یہ خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور یہاں ایک مدرسہ بھی ہے جس کے بچوں نے مہمانوں کا عقیدت واحترام کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ مسجد میں پہنچے تو نماز ظہر ادا ہو چکی تھی، قافلہ کے شرکاء نے مولانا فضل الرحمٰن کی امامت میں نماز ادا کی، ہمارا قافلہ کم وبیش تیس افراد پر مشتمل ہے جن کی مکمل فہرست تو اگلے کسی کالم میں ذکر کر سکوں گا، البتہ اس میں مولانا محمد خان

شیرانی، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا قمرالدین، مولانا اللہ وسایا، مولانا ڈاکٹر خالد محمود سومرو، مولانا عطاء الرحمٰن، مولانا عبدالغفور حیدری، مولانا گل نصیب خان، مولانا محمد امجد خان، جناب نور احمد کاکڑ، مولانا سید محمود میاں، مولانا حافظ عبدالقیوم، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا سعید یوسف خان اور مولانا محمد شریف ہزاروی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ شہر میں خاصا رش تھا اس لیے کافی وقت لگ گیا، عصر اور مغرب کی نمازیں راستہ میں ادا کرنا پڑیں اور جب ہم لدھیانہ کی مرکزی جامع مسجد میں پہنچے تو وہ لوگ نماز عشاء ادا کر چکے تھے۔

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پوتے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ثانی نے اپنے رفقاء سمیت قافلہ کا خیر مقدم کیا اور کھانے کا اہتمام کیا۔ نماز عشاء ادا کرنے کے بعد قافلہ کے شرکاء مولانا حبیب الرحمٰن ثانی کی ضیافت سے شام کام ہوئے۔ مولانا موصوف اپنے خاندان کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں، کل ہند مجلس احرار اسلام کے صدر ہیں اور انہوں نے نہ صرف تحریک آزادی کے اس عظیم عنوان کو زندہ رکھا ہوا ہے بلکہ قادیانیت کے تعاقب میں بھی وہ اپنے بزرگوں کے مشن کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ امیر احرار ہند مولانا حبیب لدھیانوی ثانی نے مولانا فضل الرحمٰن کو نشان اعزاز کے طور پر تلوار پیش کی۔ یاد رہے کہ حبیب ثانی انڈیا میں تلوار والے مولانا لدھیانوی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

تحریک آزادی میں علماء لدھیانہ کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جہاد کے فتوے کے ساتھ شرکت کے علاوہ مرزا غلام احمد قادیانی کے کفر والحاد کو بروقت بھانپتے ہوئے اس کی تکفیر کا فتویٰ سب سے پہلے صادر کرنے کا اعزاز بھی اس خاندان کو حاصل ہے۔ تحریک خلافت اور پھر اس کے بعد مجلس احرار اسلام میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا کردار تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ لدھیانہ سے تعلق رکھنے والے علماء کرام کا کردار پاکستان کی دینی جدوجہد میں بھی اپنا الگ امتیاز رکھتا ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ، حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانویؒ کے بعد اب عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی کا قائدانہ رول علماء لدھیانہ کی تاریخ میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے، جبکہ سپاہ صحابہؓ کی قیادت بھی مولانا محمد احمد لدھیانوی کر رہے

ہیں۔

پاکستان کی دینی وسیاسی جدوجہد میں میری طویل رفاقت جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر مولانا محمد عمر لدھیانوی اور علامہ محمد احمد لدھیانوی رحمہ اللہ تعالیٰ آف گوجرانوالہ کے علاوہ محترم جناب حمزہ صاحب کے ساتھ بھی رہی ہے جو لدھیانہ سے تعلق رکھتے ہیں، ایک بزرگ عالم دین کے فرزند ہیں، مغربی پاکستان اسمبلی، قومی اسمبلی اور سینٹ کے سرگرم ارکان میں ان کا شمار ہوتا آرہا ہے، اور ملک کے بااصول اور حوصلہ مند سیاست دانوں میں ان کا نام بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے۔

لدھیانہ سے روانہ ہو کر تقریباً رات ساڑھے گیارہ بجے ہم چندی گڑھ میں داخل ہوئے، یہ پنجاب اور ہریانہ دو صوبوں کا مشترکہ طور پر دارالحکومت ہے، جبکہ خود اس شہر کا نظم ونسق مرکزی حکومت نے سنبھال رکھا ہے۔ راستہ میں جالندھر، کرتار پور، پھگواڑہ اور دوسرے متعدد شہروں سے گزرتے ہوئے چندی گڑھ پہنچے ہیں اور جمعیۃ علماء ہند کی میزبانی میں ایک پرفضا پہاڑی ماحول میں واقع گولڈن ٹیولپ ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کے فرزند مولانا مودود مدنی اور حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ کے فرزند مولانا مفتی انوار الرحمٰن کے علاوہ مولانا وہاب الدین قاسمی اور مولانا حکیم الدین قاسمی نے امرتسر میں قافلے کا خیر مقدم کیا تھا اور میزبان کے طور پر قافلے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ میں نے جب سفر کا ارادہ کیا تو خواہش تھی کہ خدا کرے دارالعلوم دیوبند کے علاوہ جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور اور لدھیانہ کے علاوہ سرہند شریف کی حاضری کی کوئی صورت نکل آئے۔ رات کو سونے سے قبل جب اپنے میزبانوں سے دریافت کیا تو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آج (جمعرات) کا پروگرام یہی ہے کہ پہلے سرہند شریف جائیں گے اور سید الطائفہ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ العزیز کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد سہارنپور جانا ہوگا جہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند و جانشین حضرت مولانا محمد طلحہ مدظلہ کی زیارت وملاقات ہوگی اور اس کے بعد رات دیوبند پہنچ جائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، لاہور.....۱۴ دسمبر ۲۰۱۳ء)

سہارنپور، کاندھلہ اور تھانہ بھون میں

بدھ کو امرتسر اور لدھیانہ سے ہوتے ہوئے ہم رات چندی گڑھ پہنچے تھے، جمعرات کو صبح وہاں سے سرہند شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی قبر پر حاضری کا پروگرام تھا مگر اس سے قبل چندی گڑھ سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر مغلیہ دور سے چلے آنے والے ایک باغ میں جانا ہوا۔ پنجور گارڈن کے نام سے یہ باغ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے اور دور دراز سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ نے یہ باغ بنوایا تھا، قریب میں پنجور نامی بستی ہے جس کے حوالے سے یہ معروف تھا مگر اب اس کا نام ''یادونندر گارڈن'' رکھ دیا گیا ہے۔ چار صدیاں گزر جانے کے باوجود وسیع باغ اور اس کی عمارتوں کی رونقیں قائم ہیں، عام طور پر کہا جاتا ہے کہ

کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عجیب تھی

مگر یہ تو ابھی کھنڈر بھی نہیں ہوا اور اپنے بنانے والوں کی شان وشوکت کی گواہی دینے کے ساتھ ساتھ ''رہے نام اللہ کا'' کی صدا بھی لگا رہا ہے۔ ہم نے کچھ دیر باغ کے مختلف حصوں میں گھومنے پھرنے کے بعد سرہند شریف کا رُخ کیا اور ظہر کی نماز وہاں پڑھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے خاندان وسلسلہ کے دیگر بزرگوں کی قبروں کے ساتھ ایک مسجد اور خانقاہ ہے، جہاں معتقدین نماز ادا کرتے ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ کے معمولات جاری رہتے ہیں۔ قریب میں سکھ حضرات کا ایک بڑا گوردوارہ ہے جس کے بارے میں مختلف قسم کی روایات سننے میں آئیں اور اس کے اردگرد بھی خاصی رونق دکھائی دی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار کے منتظمین نے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر عصر کی نماز ادا کی اور سہارنپور کی طرف روانہ

ہوگئے۔ عظیم دینی، تعلیمی اور روحانی مرکز جامعہ مظاہر العلوم میں حاضری ہوئی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند و جانشین حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب دامت برکاتہم کے ہاں عشائیہ تھا۔ کچھ دیر ان کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ جامعہ مظاہر العلوم میں عشاء کی نماز ادا کی اور مولانا فضل الرحمٰن نے اساتذہ وطلبہ کے اجتماع سے خطاب کیا۔

سہارنپور سے روانہ ہوکر نصف شب کے بعد کم وبیش ایک بجے کے لگ بھگ ہم دیوبند میں داخل ہوئے تو دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ وطلبہ کا ایک ہجوم استقبال کے لیے کھڑا تھا، پرجوش نعرے لگاتے ہوئے طلبہ کی خواہش اپنے مہمانوں سے مصافحہ کرنے کی تھی۔ ایک گاڑی میں مولانا مفتی غلام الرحمٰن اور راقم الحروف تھے اور جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی راہ نما مولانا طاہر مظاہری ہمارے رہبر تھے۔ گاڑی رینگتے رینگتے مہمان خانے کی طرف بڑھ رہی تھی اور دونوں طرف سے طلبہ شیشوں کی طرف لپک رہے تھے۔ میں نے گاڑی کا شیشہ کھولنا چاہا تو مولانا طاہر مظاہری نے منع کر دیا اور کہا کہ شیشے کھول دیے تو رات مصافحوں میں ہی گزر جائے گی۔ اس لیے اندر ہی سے اشاروں کے ساتھ سلام کا جواب دیتے رہیے۔

مہمان خانے تک پہنچے تو دیگر اساتذہ کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی، جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا قاری محمد عثمان منصوری اور سیکرٹری جنرل مولانا سید محمود مدنی کو منتظر پایا جو رات گئے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ حضرت مہتمم صاحب کے ساتھ چند روز قبل میری ملاقات جنوبی افریقہ میں ہو چکی تھی اس لیے وہ جس بے تکلفی سے ملے اس سے ہمارے بعض دوستوں کو تعجب سا ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ ہماری ملاقات صرف ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ ہو رہی ہے اس لیے اس شفقت اور محبت سے فیض یاب ہوا ہوں۔ پروگرام یہ بنا کہ نماز فجر کے بعد جمعہ کی نماز تک تمام حضرات آرام کریں گے۔ نماز جمعہ مسجد الرشید میں ادا ہوگی، اس کے بعد مولانا سید محمود اسعد مدنی کے ہاں کھانا ہوگا اور پھر کانفرنس کے پروگرام کے لیے ہال میں چلے جائیں گے۔

اس موقع پر لطیفہ یہ ہوا کہ میزبانوں نے مہمان خانے کے مختلف کمرے مہمانوں میں تقسیم کر دیے اور سب مہمان اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہوگئے مگر میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔ مولانا فضل

الرحمٰن نے جاتے ہوئے صورت حال کو بھانپ لیا اور میز بانوں سے کہا کہ آپ حضرات فہرست میں مولانا زاہد الراشدی کو تلاش کر رہے ہوں گے، یہ صاحب جو بیٹھے ہیں وہی ہیں مگر فہرست میں ان کا نام محمد عبد المتین خان درج ہے، اس پر مجھے بھی کمرہ الاٹ ہو گیا اور میں اپنے کمرے میں آرام سے پہنچ گیا۔ صبح نماز فجر کے لیے بیدار ہوئے تو مہمان خانے کے خادمین کی مستعدی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے وضو کرتے ہی چائے آ گئی، میرے ساتھ کمرے میں بلوچستان کے مولانا مفتی عبد الستار صاحب تھے، ہم دونوں چائے پی کر نماز فجر کے لیے مہمان خانے کی مسجد میں حاضر ہوئے۔

ایک نوجوان مولانا صاحب نے نماز پڑھائی، مدتوں بعد جمعہ کی نماز فجر میں سورۃ السجدہ اور سورۃ الدھر سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ واشنگٹن ڈی سی کے ہمارے مشفق دوست مولانا عبد الحمید اصغر کا یہ ذوق ہے کہ وہ جمعہ کے روز فجر کی نماز میں سورۃ السجدہ پڑھنے کی فرمائش کیا کرتے ہیں۔ ایک بار مجھ سے فرمائش کی تو میں نے کہا کہ مجھے پوری طرح مستحضر نہیں ہے، اس لیے شاید صحیح نہ پڑھ سکوں، اس پر انہوں نے کہا کہ پھر آج کی نماز وہ قاری صاحب پڑھائیں گے جو ہمیں سورۃ السجدہ سنا سکیں۔ چنانچہ بنگلہ دیش کے ایک نوجوان قاری صاحب نے اس فرمائش کی تکمیل کے ساتھ نماز فجر پڑھائی۔ دار العلوم دیوبند کی اس مسجد میں اس روز قاری صاحب سے نماز فجر کی پہلی رکعت میں سورۃ السجدہ سن کر برسوں پہلے کا یہ واقعہ تازہ ہو گیا۔ نماز فجر کے بعد باقی حضرات اپنے اپنے کمروں میں آرام کے لیے چلے گئے جبکہ مولانا اللہ وسایا نے چپکے سے میرے کان میں کچھ پھونکا اور ہم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر جا پہنچے جو مولانا شاہ عالم گورکھ پوری کی نگرانی میں پورے ہندوستان میں قادیانیت کے تعاقب کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہے اور دار العلوم دیوبند کے ایک مستقل شعبہ کے طور پر کام کر رہا ہے۔

مولانا شاہ عالم گورکھپوری کے ساتھ ہم نے چند مقامات پر حاضری کا پروگرام بنایا اور خاموشی کے ساتھ نکل پڑے۔ ہماری پہلی منزل کاندھلہ تھی، مولانا نور الحسن راشد ہمارے فاضل دوست ہیں، حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش رحمہ اللہ تعالیٰ کی امانتوں اور روایتوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور مکتوبات و مخطوطات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ انہوں نے نہ صرف جمع کر رکھا ہے بلکہ اسے اہل علم کے سامنے لانے کے لیے بھی سلیقہ اور ذوق کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی،

انہوں نے قلمی مخطوطات کی ایک فائل کی زیارت کرائی جو علوم و معارف اور تبرکات و آثار کا ایک عظیم خزینہ ہے۔ اس میں حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کا وہ قلمی فتویٰ بھی شامل ہے جو انہوں نے انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں صادر فرمایا تھا۔ فتویٰ تفصیلی تھا، پڑھنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا، البتہ زیارت سے ہم ضرور شاد کام ہوئے۔

کاندھلہ سے نکل کر ہم نے تھانہ بھون کا رخ کیا اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خانقاہ اور درسگاہ میں حاضری دی۔ جمعہ تک وہاں نہ پہنچ سکے اس لیے مسافر ہونے کی وجہ سے اس وقف باغ میں نماز ظہر ادا کی جہاں حضرت تھانویؒ اپنی علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ تھانہ بھون سے چل کر ہم نے عصر کی نماز گنگوہ شریف میں پڑھی۔ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مسجد و خانقاہ میں حاضری دی۔ پھر نانوتہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد مغرب کی نماز وہیں ایک مسجد میں ادا کی اور عشاء کی نماز سے قبل دیوبند واپس پہنچ گئے۔ ہمارا یہ سفر خاموشی سے تھا اور ایک دو بڑے میزبان بزرگوں کے سوا ہم نے کسی کو نہیں بتایا تھا اس لیے سارا دن ہماری تلاش ہوتی رہی اور بعض دوستوں کی ناراضگی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ سارا دن پرانے بزرگوں کے مزارات پر حاضری میں گزارا جن میں سے بہت سے بزرگوں کا میں تذکرہ نہ کر سکا۔ دیوبند پہنچتے ہی ہم سیدھے کانفرنس ہال میں حاضر ہو گئے۔

انڈیا کی سرزمین پر ایک ہفتہ گزارنے کے بعد بدھ کی شام مولانا عبد الغفور حیدری، مولانا محمد خان شیرانی اور دیگر حضرات کے ہمراہ لاہور واپس پہنچ گیا ہوں، سفر کی ضروری تفصیلات اور شیخ الہند عالمی امن کانفرنس کے احوال و تاثرات چند دن تک ان شاء اللہ تعالیٰ چلتے رہیں گے۔ نیز کل جمعہ کے روز مغرب کی نماز کے بعد گکھڑ میں حضرت والد محترم قدس اللہ سرہ العزیز کی مسجد میں اور نماز عشاء کے بعد سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ میں مولانا حافظ گلزار احمد آزاد کی مسجد میں تاثرات بیان کروں گا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور ...... ۲۰ دسمبر ۲۰۱۳ء)

شیخ الہند عالمی امن کانفرنس دہلی کا متفقہ اعلامیہ

جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام شیخ الہند ایجوکیشنل ٹرسٹ کے عنوان سے ۱۳ تا ۱۵ دسمبر ۲۰۱۳ء کو دیوبند اور دہلی میں ''شیخ الہند عالمی امن کانفرنس'' کا انعقاد کیا گیا۔ یہ کانفرنس شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی زیر قیادت برطانوی استعمار کے خلاف منظّم کی جانے والی عظیم جدوجہد ''تحریک ریشمی رومال'' کو ایک صدی مکمل ہو جانے پر صد سالہ تقریبات کے حوالہ سے منعقد کی گئی اور اس میں بھارت کے طول وعرض سے شریک ہونے والے سرکردہ علماء کرام اور عوامی قافلوں کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش، برما، نیپال، مالدیپ، ماریشیس، سری لنکا، برطانیہ اور دیگر ممالک سے بھی سینکڑوں علماء کرام نے شرکت کی۔ پاکستان سے جمعیۃ علماء اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمان کی سربراہی میں جمعیۃ علماء اسلام کے تیس رکنی بھرپور وفد کانفرنس کی مختلف تقریبات میں شریک ہوا۔

۱۳ و ۱۴ دسمبر کو ''شیخ الہند عالمی امن کانفرنس'' کی چار نشستیں دیوبند میں ہوئیں جن میں پہلی تین نشستیں مندوبین کے اظہار خیال کے لیے مخصوص تھیں جبکہ چوتھی نشست عیدگاہ میدان میں جلسہ عام کی صورت میں منعقد ہوئی۔ ان میں خطاب کرنے والوں میں دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا ابوالقاسم نعمانی، جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا قاری محمد عثمان، جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان اور جمعیۃ علماء ہند کے سیکرٹری جنرل مولانا سید محمود اسعد مدنی کے علاوہ پاکستان سے مولانا عبدالغفور حیدری، مولانا محمد خان شیرانی، ڈاکٹر خالد محمود سومرو، مولانا رشید احمد لدھیانوی، مولانا سید محمود میاں، مولانا سعید یوسف خان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا اللہ وسایا، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا گل نصیب خان، بنگلہ دیش سے مولانا مفتی عبدالرحمٰن، برما سے مولانا

مفتی نور محمد، سری لنکا سے مولانا مفتی محمد رضوی، برطانیہ سے مولانا حافظ محمد اکرام اور بھارت سے مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی، مفتی محمد سلمان منصور پوری اور مولانا سلمان بجنوری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

راقم الحروف نے تیسری اور چوتھی نشست میں کچھ معروضات پیش کیں اور چند تجاویز تحریری صورت میں مولانا سید محمود اسعد مدنی کے حوالہ کیں جن کی تفصیلات مقررین کے خطابات کے اہم اقتباسات کے ساتھ اس کالم میں الگ پیش کی جائیں گی۔

۱۵ دسمبر کو دہلی کے رام لیلا میدان میں ''شیخ الہند عالمی امن کانفرنس'' کی کھلی نشست منعقد ہوئی جس میں شرکت کے لیے بھارت کے طول وعرض سے سینکڑوں قافلے رات ہی کو میدان میں پہنچ چکے تھے اور لاکھوں کا اجتماع صبح نو بجے تک اپنے راہ نماؤں کے ارشادات سننے کے لیے جمع تھا۔ رام لیلا میدان اور اس کے اردگرد ہر طرف لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے اور ساڑھے نو بجے سے اڑھائی بجے تک عوام اور علماء نے جس طرح سکون اور نظم وضبط کے ساتھ مقررین کے خطابات کو سنا وہ قابل رشک تھا۔

اس عظیم الشان کانفرنس میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا قاری سید محمد عثمان کا خطبہ صدارت اور جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان کے خطابات کلیدی حیثیت کے حامل تھے جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے افکار وتعلیمات اور ملی ودینی جدوجہد کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا اور موجودہ عالمی اور علاقائی تناظر میں شیخ الہندؒ کے افکار اور جدوجہد سے راہ نمائی حاصل کرنے پر زور دیتے ہوئے اس کے مختلف خطوط اور پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا۔

اس موقع پر ''امن عالم کانفرنس'' کی طرف سے ایک متفقہ اعلامیہ کی منظوری دی گئی جس کی ترتیب وتدوین میں دیگر حضرات کے ساتھ مجھے بھی شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جمعیۃ علماء ہند کے سیکرٹری جنرل مولانا سید محمود اسعد مدنی نے یہ اعلامیہ پڑھ کر سنایا جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ اعلامیہ درج ذیل ہے:

''ہندو بیرون ہند کے ممتاز علمائے کرام، دانشوران اور رہنمایانِ ملک وملت کا یہ عالمی اجلاس برصغیر ہند کی آزادی میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ،

ان کے رفقاء اور تمام مجاہدین آزادی کی سنہری خدمات و بے مثال قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے اور حضرت شیخ الہند کے عطا کردہ رہنما خطوط کی روشنی میں اپنے اس عہد کا اعلان کرتا ہے کہ:

(۱) ہم انسانیت کی فلاح و بہبود اور عالمی امن کے قیام کے لیے ہر سطح پر دوستانہ تعلقات اور صلح و آشتی کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے رہیں گے۔

(۲) اپنے اپنے ملک کی سالمیت اور وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی خوشحالی اور خیرسگالی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

(۳) ہر قسم کے تنازعات کا پرامن ذرائع سے حل تلاش کرنے کے لیے ذہن سازی اور کوشش کریں گے۔

(۴) اسلام کی نظر میں ہر طرح کا فتنہ وفساد، بدامنی وخوں ریزی اور بے قصوروں کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنانا، بدترین انسانیت سوز جرم ہے، اس لیے ہم ہر قسم کی دہشت گردی کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ اور اس بارے میں دارالعلوم دیوبند کے فتوے کی بھرپور تائید کرتے ہیں۔ اور تمام انصاف پسندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف دہشت گردی سے برأت کریں، بلکہ ان اسباب ومحرکات کو بھی ختم کرنے کی فکر کریں، جن کی وجہ سے دنیا میں دہشت گردی پنپتی ہے۔

(۵) اقلیتوں، ناداروں، کمزور طبقات اور خواتین کے حقوق کی پاسداری کے بغیر خوشحالی، ترقی اور امن کا تصور ناممکن ہے۔ اس لیے ہم انہیں ان کے حقوق دلانے اور سماجی انصاف کی فراہمی کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں گے۔

(۶) اخلاق سوز رسم و رواج، فضول خرچی اور جرائم سے پاک معاشرہ کی تشکیل; خاص کر شراب نوشی، منشیات، عیش پرستی، فحاشی، عریانیت اور

جنین کشی کے خلاف تحریک چلانے کے لیے ہم تمام مذاہب کے رہنماؤں اور مصلحانہ تنظیموں کو اشتراک اور تعاون کی دعوت دیتے ہیں۔

(۷) ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ مسلکی تنازعات میں تشدد اور خوں ریزی اسلامی تعلیمات کے قطعاً خلاف ہیں۔ ہم اس معاملے میں تشدد کی سخت مذمت کرتے ہوئے عہد کرتے ہیں کہ مسلکی تشدد کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔

(۸) حضرت شیخ الہندؒ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے موقع پر جو وقیع خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس کی روشنی میں ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملت سے دینی و دنیوی جہالت دور کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں گے؛ خاص طور پر اسلامی ماحول میں عصری تعلیم کے ادارے قائم کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کریں گے، جیسا کہ جمعیۃ علماء ہند کے سابق صدر محترم امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی نور اللہ مرقدہ اس موضوع کو مشن بنا کر پورے عالم میں پھیلاتے رہے۔

(۹) ہم یہ بھی عہد کرتے ہیں کہ اہل حق کے تمام دینی اداروں اور تحریکات میں ایک دوسرے کے معاون بن کر رہیں گے۔''

کانفرنس میں اس اعلامیہ پر عملدر آمد اور اس کے مطابق مختلف ممالک میں شیخ الہندؒ کے افکار کے مطابق کام کو منظّم کرنے کے لیے ''شیخ الہند عالمی امن فورم'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور مولانا سید محمود اسعد مدنی کی پیش کردہ یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کر لی گئی:

''تحریک شیخ الہند صد سالہ تقریبات کے موقع پر منعقدہ عظیم الشان امن عالم کانفرنس ضرورت محسوس کرتی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے افکار و نظریات کے حوالہ سے منعقد اس کانفرنس کے اعلامیہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شیخ الہند عالمی امن فورم قائم کیا جائے۔''

(روزنامہ اسلام، لاہور---۲۱ دسمبر ۲۰۱۳ء)

دہلی میں تین روزہ قیام کا احوال

دہلی میں تین روز تک ہمارا قافلہ اکٹھا رہا۔ شیخ الہند امن عالم کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا فضل الرحمان کی قیادت میں ہم تیس افراد دیوبند اور دہلی گئے تھے۔ دو روز دیوبند میں قیام اور کانفرنس کی چار نشستوں میں شرکت کے بعد ہفتہ کی شام کو ہم دہلی پہنچے، جمعیۃ علماء ہند ہماری میزبان اور داعی تھی، کچھ حضرات کا قیام جمعیۃ کے دفتر میں رہا اور باقی دوستوں کو ترکمان گیٹ کے قریب دو ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ ۱۵ دسمبر کا دن رام لیلا میدان میں ''شیخ الہند امن عالم کانفرنس'' کی عمومی نشست میں گزر گیا جو صبح ساڑھے نو بجے سے اڑھائی بجے تک مسلسل جاری رہی اور بھارت کے طول و عرض سے ہزاروں علماء کرام اور کارکنوں نے اس میں شرکت کی جبکہ شام کو جمعیۃ کے سیکرٹری جنرل مولانا سید محمود مدنی نے مہمانوں کو عشائیہ دیا۔

۱۶ دسمبر کا دن دہلی کے تاریخی مقامات میں حاضری کے لیے مخصوص کیا گیا تھا جس کے لیے ہمارے میزبان نے ایک بس کا اہتمام کر رکھا تھا۔ قافلہ کی صورت میں ان مراکز میں حاضر ہوئے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت خواجہ غلام علیؒ، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دیگر بہت سے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کی، قطب مینار دیکھا، بستی نظام الدینؒ کے تبلیغی مرکز میں نماز ظہر ادا کی اور قریب ہی حضرت خواجہ ابوسعیدؒ اور خواجہ غلام علیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ خانقاہ کے سجادہ نشین مولانا محمد انس مدظلہ موجود تھے۔ ان سے ملاقات اور مختصر سی مجلس ہوئی، میں نے عرض کیا کہ موسیٰ زئی کی وساطت سے ہماری نسبت اس خانقاہ کے ساتھ ہے، اس پر وہ خوش ہوئے اور تفصیل دریافت کی۔ میں نے عرض کیا کہ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ رئیس

الموحدین حضرت مولانا حسین علی نقشبندیؒ کے خلیفہ مجاز تھے اور ان کا بیعت و اجازت کا تعلق خانقاہ موسیٰ زئی شریف سے تھا۔ جبکہ حضرت والد محترمؒ نے مجھے اپنے خلفاء مجازین میں شمار کیا ہوا ہے۔ اسی طرح کندیاں شریف کی وساطت سے بھی ہمارا تعلق اس عظیم خانقاہ سے ہے، مولانا محمد انس مدظلہ نے ہمیں دعاؤں سے نوازا۔

وہاں قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میری نظر مرزا غالب مرحوم کے مزار پر پڑی تو قدم خود بخود رک گئے۔ طالب علمی کے دور میں مجھ پر بھی ایک دور ایسا گزرا ہے کہ مرزا غالب مرحوم اور حافظ شیرازیؒ کے دیوان ہر وقت میرے سرہانے کے نیچے پڑے رہتے تھے۔ وہاں رک کر فاتحہ خوانی کی، ساتھ ہی فروغ اردو کے ایک ادارے کا دفتر ہے، وہاں جانے اور کچھ وقت گزارنے کو بہت جی چاہا مگر وقت کی کمی نے اجازت نہ دی۔ قریب زمانہ کے بزرگوں میں سے مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا احمد سعید دہلویؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کا موقع بھی مل گیا۔

بہادر شاہ ظفرؒ کا محل دیکھا جو کھنڈرات کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے اور ہمارے میزبانوں نے ہمیں وہ قدیم عمارت بھی دکھائی جہاں ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؒ کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا اور دوسرے دن ناشتہ کی ٹرے میں ان کے بیٹوں کے سر ان کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔

عصر کی نماز شاہی مسجد میں ادا کی اور بہت سے ساتھی قریب ہی چاندنی چوک میں گھومنے پھرنے اور شاپنگ کے لیے نکل گئے۔ مجھے بیرونی اسفار میں شاپنگ کا شوق کبھی نہیں رہا، ضرورت کی کوئی چیز ہو تو لے لیتا ہوں ورنہ شاپنگ میرے کسی پروگرام کا باقاعدہ حصہ نہیں ہوتی۔ پھر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بار بار اترنا چڑھنا بھی مسئلہ ہے، اس لیے میں نے نماز عصر ادا کرنے کے بعد مغرب تک مسجد میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ مگر مغرب ادا کرنے کے بعد مسجد سے نکلنا چاہا تو جوتے غائب تھے، خدا جانے میں جگہ بھول گیا تھا یا کوئی مغالطہ میں لے گیا۔ بہرحال مجھے جوتے تلاش کے باوجود نہ مل سکے، میں نے چمڑے کے موزے پہن رکھے تھے، اس لیے کچھ سہولت رہی اور کافی دور تک انہی کے ساتھ چل کر ایک جگہ سے کپڑے کے بوٹ خریدے اور انہی میں گھر واپسی تک کا

سفر کیا۔

قبرستان مہندیاں دہلی ہماری عقیدتوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اوران کے والد گرامی حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے ساتھ اس عظیم خاندان کے دیگر بزرگوں خاص طور پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ عبدالغنیؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ کی قبریں ہیں۔ مگر میری دلچسپی ان سے زیادہ اس درسگاہ کے کھنڈرات سے تھی جو کئی نسلوں تک اس خاندان کی تعلیمی اور روحانی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر حاضری ہوئی تو اس وقت اس جگہ میں دوبارہ آبادی کے آثار نہیں تھے۔ مگر اب کچھ سالوں سے مدرسہ رحیمیہ کے نام سے درسگاہ کا آغاز ہوگیا ہے۔ کچھ عمارت کی تعمیر ومرمت کے ساتھ مدرسہ کا سلسلہ چل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی اور دل سے اس کی آبادی اور دن بدن ترقی کے لیے دعائیں نکلتی رہیں، اللّٰھم ربنا آمین۔

۷ ادسمبر کو قافلہ کے اٹھارہ افراد کی واپسی کا پروگرام تھا جن میں مولانا عبدالغفور حیدری، مولانا محمد خان شیرانی، مولانا گل نصیب خان، مولانا محمد امجد خان، مولانا محمد شریف ہزاروی، مولانا مفتی غلام الرحمان اور دیگر حضرات کے ساتھ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر نے دہلی سے امرتسر تک جیٹ ایئرویز کی پرواز سے ہماری سیٹیں بک کرا رکھی تھیں۔ پونے نو بجے فلائیٹ کا ٹائم تھا اس لیے فجر کی نماز کے فوراً بعد ہم ہوٹلوں سے روانہ ہوئے اور مولانا سید محمود اسعد مدنی نے علی الصبح وہاں آکر ہمیں رخصت کیا، مگر ایئرپورٹ پر بورڈنگ وغیرہ کے مراحل سے گزر کر خاصا وقت گزر گیا تو معلوم ہوا کہ شدید دھند کی وجہ سے فلائیٹ کینسل ہوگئی ہے۔ ہمارے میزبانوں نے دوبارہ محنت کر کے ساڑھے بارہ بجے والی فلائیٹ پر سیٹیں حاصل کیں اور اس کے بورڈنگ وغیرہ کے مراحل سے ہم فارغ ہوئے تھے کہ اس کے کینسل ہونے کا بھی اعلان ہوگیا۔ اس طرح تقریباً سارا دن دہلی ایئرپورٹ پر گزر گیا۔ ہم بھارت میں کوئی ہوائی سفر تو نہ کر سکے لیکن دہلی ایئرپورٹ کو اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھنے کا خوب موقع مل گیا۔

وہاں سے واپس جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں آئے، اب ہمارے میزبانوں نے رات کو ایک سلیپر بس بک کرا لی جس کے ذریعہ ہم نے واہگہ بارڈر تک سفر کیا۔ اس قسم کی سلیپر بس میں نے

زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے، ایک بڑی بس کے اندر چوبیس کیبن تھے اور ہر کیبن ایک سنگل بیڈ کے برابر تھا جو چاروں طرف سے بند ہو کر باقاعدہ کمرے کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس میں گدے اور تکیے وغیرہ رکھ کر اسے باقاعدہ بستر کی شکل دے دی گئی تھی۔ آدمی آسانی کے ساتھ اس میں لیٹ اور بیٹھ سکتا ہے گویا اپنے بیڈ پر ہی وہ سفر کر رہا ہوتا ہے۔ اس طرح کی بسیں انڈیا میں عام بتائی جاتی ہیں اور لمبے روٹوں پر لوگ زیادہ تر ایسی بسوں میں ہی سفر کرتے ہیں۔ مجھے یہ بس بہت اچھی لگی ہے اس لیے پاکستان کے ٹرانسپورٹر حضرات سے گزارش کروں گا کہ وہ بھی لمبے سفر میں مسافروں کو یہ سہولت فراہم کرنے کا کوئی راستہ نکالیں، اس سے لمبا سفر بہت آسان ہو جائے گا۔

دہلی سے اٹاری تک مسلسل دھند تھی جس کی وجہ سے ہم نے یہ سفر کم و بیش پندرہ گھنٹوں میں طے کیا اور ۱۸ دسمبر کو بارڈر بند ہونے سے بمشکل نصف گھنٹہ پہلے وہاں پہنچ پائے ورنہ شاید وہ رات ہمیں امرتسر میں گزارنا پڑتی۔

اس موقع پر جمعیۃ علماء ہند کی میزبانی کا تذکرہ اور میزبانوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ جمعیۃ کے متعدد راہ نما بالخصوص مولانا سید مودود مدنی، مولانا حکیم الدین قاسمی، مولانا طاہر مظاہری اور مولانا اسرائیل سہارنپوری قدم قدم پر ہمارے ساتھ رہے اور واہگہ بارڈر کراس کرانے تک ان کی رفاقت ہمیں مسلسل حاصل رہی۔ جبکہ ہمارے قافلہ میں انتظامات اور سہولتوں کی فراہمی میں مولانا عبدالغفور حیدری کے سیکرٹری جناب نور احمد کاکڑ، مفتی سید محمد زاہد شاہ اور مولانا محمد طیب پیش پیش رہے۔ واپسی پر بعض دوستوں نے اس حوالہ سے بات کی تو میں نے عرض کیا کہ اس سارے سفر کے دوران بہترین انتظامات اور ساتھیوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرانے میں ہماری طرف سے نور احمد کاکڑ اور میزبانوں کی طرف سے مولانا حکیم الدین قاسمی میرے نزدیک ''مین آف دی میچ'' قرار پانے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازیں اور اس سفر کو ہمارے لیے سعادت دارین کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۷ دسمبر ۲۰۱۳ء)

دیوبند کے حالیہ سفر کی مختصر روداد

شیخ الہندؒ ایجوکیشنل چیریٹی ٹرسٹ دیوبند کی دعوت پر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے وفد کے ہمراہ دیوبند دہلی اور بھارت کے بعض دیگر شہروں میں حاضری اور متعدد بزرگوں سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال کو ایک صدی مکمل ہونے پر صد سالہ تقریبات کا اہتمام کیا گیا تھا اور اسی کے تحت ۱۳ و ۱۴ دسمبر ۲۰۱۳ء کو دیوبند میں اور ۱۵ دسمبر کو دہلی میں ''شیخ الہند امن عالم کانفرنس'' منعقد ہوئی۔ جس میں بھارت کے طول و عرض سے آنے والے ہزاروں افراد اور سرکردہ علماء کرام کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش، برما، سری لنکا، نیپال اور برطانیہ سے بھی علماء کرام کے وفود شریک ہوئے۔ پاکستان سے جمعیۃ علماء اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمان کی سربراہی میں تیس کے لگ بھگ علماء کرام کا بھرپور وفد کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچا جس میں مولانا عبد الغفور حیدری، مولانا محمد خان شیرانی، مولانا اللہ وسایا، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ڈاکٹر خالد محمود سومرو، مولانا محمد امجد خان، مولانا سید محمود میاں، مولانا رشید احمد لدھیانوی، مولانا مفتی عبد الستار، مولانا قمر الدین، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا محمد شریف ہزاروی، مولانا حافظ عبد القیوم نعمانی، مولانا گل نصیب خان اور نور احمد کاکڑ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ہم ۱۱ دسمبر کو ''لاہور امرتسر دوستی بس'' کے ذریعے واہگہ بارڈر کراس کر کے ظہر کے وقت امرتسر پہنچے اور مسجد خیر دین میں نماز ظہر ادا کی۔ یہ مسجد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور تحریک آزادی کے دیگر سرکردہ راہنماؤں کی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے سلسلہ میں تاسیسی اجلاس اسی مسجد میں ہوا تھا۔

یہاں سے روانہ ہو کر ہم عشاء تک لدھیانہ مرکزی جامع مسجد میں پہنچ گئے جہاں مجلس احرار

اسلام ہند کے صدر مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی ثانی نے، جو رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے پوتے ہیں، وفد کے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ عشاء کی نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر قافلہ چندی گڑھ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں رات ایک ہوٹل میں گزاری۔ جمعیۃ علماء ہند اس سفر میں ہماری میزبان تھی، مرکزی جمعیۃ کی طرف سے مولانا سید مودود مدنی، مولانا حکیم الدین قاسمی، مولانا طاہر مظاہری اور مولانا محمد اسرائیل سہارنپوری نے امرتسر میں قافلہ کا استقبال کیا اور دیوبند پہنچنے تک ہمارے ساتھ رہے۔ چندی گڑھ میں ایک پر فضا مقام پر واقع ہوٹل میں قافلہ کا قیام انہی کی میزبانی میں تھا۔

جمعرات کو صبح چندی گڑھ سے ہمارا پروگرام سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خانقاہ میں جانے کا تھا، ظہر تک وہاں حاضر ہوئے اور خاندان مجددی کے قبرستان میں فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کی۔ دوپہر کا کھانا خانقاہ کے منتظمین کی طرف سے تھا، ظہر اور عصر کی نمازیں ہم نے وہیں ادا کیں اور پھر سہارنپور کی طرف چل پڑے جہاں جامعہ مظاہر العلوم میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے فرزند و جانشین حضرت مولانا محمد طلحہ دامت برکاتہم کے ہاں وفد کا عشائیہ تھا۔ حضرت مدظلہ کی زیارت و دعا سے شادکام ہوئے، کھانا تناول کیا، عشاء کی نماز جامعہ مظاہر العلوم کی جدید مسجد میں ادا کی اور پھر دیوبند کا قصد کیا۔ اس علمی و روحانی مرکز میں ہم رات ایک بجے کے لگ بھگ پہنچے، دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ سراپا انتظار تھے اور پر جوش نعروں کے ساتھ اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم بھی سینئر اساتذہ کے ہمراہ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں منتظر تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا قاری محمد عثمان اور سیکرٹری جنرل مولانا سید محمود اسعد مدنی نے اپنے رفقاء کے ہمراہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور دارالعلوم کے وسیع مہمان خانے کے کمرے مہمانوں کے لیے کھول دیے گئے۔

صبح نماز فجر کے بعد وفد کے لیے دیوبند میں شام تک کی تفصیلات طے تھیں مگر راقم الحروف اور مولانا اللہ وسایا وہاں سے آنکھ بچا کر نکلے اور مجلس تحفظ ختم نبوت ہند کے راہنما مولانا شاہ عالم گورکھپوری کے ہمراہ کاندھلہ، تھانہ بھون، شاملی، گنگوہ اور نانوتہ کا رُخ کر لیا۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر

رائے پوریؒ کے خلیفہ حضرت مولانا سید افتخار الحسن مدظلہ کی کاندھلہ میں زیارت کی اوران کے فرزند مولانا سید نورالحسن راشد کے ہاں بعض نادر مخطوطات کی زیارت کی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خانقاہ اوراستاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی قبر پر حاضری دی اوران بزرگوں کے مراکز کی زیارت سے شادکام ہوکر عشاء تک دیوبند واپس پہنچ گئے۔

جمعہ اور ہفتہ کو دیوبند کے ایک ہال میں ’’شیخ الہند امن عالم کانفرنس‘‘ کی تین نشستیں ہوئیں جبکہ عیدگاہ کے میدان میں ہفتہ کے روز ظہر سے قبل کانفرنس کی کھلی نشست ہوئی۔ راقم الحروف نے ہال کی ایک نشست کے علاوہ کھلے جلسہ میں بھی کچھ معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ہفتہ کی شام تک ہم سب دہلی پہنچ گئے، مہمانوں میں سے کچھ کا قیام جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر میں اور باقی حضرات کا قیام ترکمان گیٹ کے ساتھ دو ہوٹلوں میں ہوا۔ جبکہ دو روز تک ہم دفتر جمعیۃ میں مولانا سید محمود اسعد مدنی کی دعوتوں کا لطف اٹھاتے رہے۔

۱۵ دسمبر کو صبح ساڑھے نو بجے سے اڑھائی بجے تک رام لیلا کے وسیع میدان میں ’’شیخ الہند امن عالم کانفرنس‘‘ کی آخری نشست بہت بڑے جلسہ عام کی صورت میں منعقد ہوئی جس میں شرکت کے لیے بھارت کے طول وعرض سے سینکڑوں قافلے رات ہی پہنچ چکے تھے اور کم وبیش پانچ گھنٹے تک عوام پورے اطمینان کے ساتھ راہنماؤں کے خطابات سنتے رہے۔

۱۶ دسمبر کو جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے مہمانوں کو دہلی کے اہم مقامات میں لے جانے کا پروگرام بنایا گیا تھا جس کے تحت ہم نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ، حضرت شاہ غلام علیؒ، اور دوسرے بزرگوں کی زیارات کے ساتھ ساتھ شاہی جامع مسجد اور شاہی قلعہ بھی دیکھا اور قطب مینار دیکھنے کے لیے گئے۔ بستی نظام الدین میں تبلیغی مرکز میں سب نے ظہر کی نماز ادا کی، قریب ہی مرزا غالب مرحوم کی قبر تھی وہاں فاتحہ پڑھی اور حضرت شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ کے مسند نشین مولانا محمد انس مدظلہ سے ملاقات کی، وہ بہت خوش ہوئے اور دعاؤں سے نوازا۔

اس روز ہماری آخری حاضری حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مدرسہ رحیمیہ میں تھی، اس عظیم خاندان کی قبروں پر فاتحہ خوانی کا شرف حاصل کیا اور مدرسہ رحیمیہ کی نئی تعمیر ہونے والی عمارت

دیکھی۔ یہ مدرسہ ایک عرصہ ویران رہنے کے بعد اب دوبارہ آباد ہونا شروع ہوا، آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا محل دیکھا جو اَب کھنڈر کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس کے پڑوس میں حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا احمد سعید دہلوی کی قبروں پر فاتحہ اور دعا کا موقع حاصل کیا۔

منگل کو وفد کے اٹھارہ افراد نے واپس آنا تھا جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، میزبانوں نے صبح نو بجے جیٹ ایئرویز کے ذریعے دہلی سے امرتسر تک ہوائی جہاز سے ہماری سیٹیں بک کرا رکھی تھیں مگر سارے مراحل سے گزر کر پتہ چلا کہ شدید دھند کی وجہ سے فلائیٹ کینسل ہوگئی ہے دوبارہ ساڑھے بارہ بجے کی فلائیٹ سے سیٹیں حاصل کیں مگر وہ بھی عین وقت پر کینسل ہوگئی۔ سارا دن ہمارا دہلی ائیر پورٹ پر گزر گیا جبکہ شام کو میزبانوں نے ہمارے لیے سلیپر بس کا انتظام کیا جس میں چوبیس کیبن بالکل بیڈ کے سائز کے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم اپنے بیڈ پر ہی سفر کر رہے ہیں۔ دہلی سے اٹاری بارڈر تک کا سفر دھند کی وجہ سے پندرہ گھنٹے میں طے ہوا، بارڈر بند ہونے سے صرف پندرہ منٹ پہلے ہم گیٹ تک پہنچ پائے اور اس طرح بدھ کو عصر کے وقت ہم پاکستان کی حدود میں داخل ہوگئے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ---جنوری ۲۰۱۴ء)

متفرق

بنگلہ دیش کی مصنفہ تسلیمہ نسرین کا انکشاف

تسلیمہ نسرین بنگلہ دیش کی ایک صاحبِ قلم خاتون ہے جس نے متعدد تصانیف میں اسلامی احکام کا مذاق اڑایا اور قرآن کریم کو آج کے دور میں ناقابلِ عمل قرار دیتے ہوئے اس پر نظرثانی کی تجویز پیش کی۔ اس پر ڈھاکہ کی ایک عدالت میں توہینِ مذہب کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور یہ بات مغربی ممالک میں اس کی مقبولیت کی وجہ بن گئی۔ یورپی ممالک کے وزرائے خارجہ نے بون میں اجلاس کر کے اسے ڈھاکہ سے یورپ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا، ڈھاکہ میں یورپی سفارتخانوں نے اسے ڈھاکہ سے نکالنے کی پلاننگ کی، وہ سویڈن پہنچی تو وزیرخارجہ نے اس کا استقبال کیا، اور یورپی ممالک نے اسے پیشکش کی کہ وہ جس یورپی ملک میں رہنا چاہے اسے مکمل پروٹوکول اور تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ مگر وہ ایک سال تک یورپی حکومتوں کی مہمانی کے مزے اڑانے کے بعد اب اس سے بھی تنگ آ گئی ہے اور دولت اور پروٹوکول کے باوجود اس کا جرم ایک آسیب کی طرح اس کے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۵ دسمبر ۱۹۹۵ء میں شائع شدہ ایک رپورٹ کیمطابق:

> ''بنگلہ دیش کی گستاخِ رسولؐ ناول نگار تسلیمہ نسرین نے اعتراف کیا ہے کہ اس کے بھارت کی رسوائے زمانہ خفیہ ایجنسی ''را'' کے ساتھ روابط تھے اور اسی کے ورغلانے پر اس نے توہینِ رسالت اور اسلام دشمنی پر مبنی مواد تحریر کیا تھا۔ یہ بات اس نے سویڈن کے شہر اسٹاک ہوم میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہی جہاں وہ ان دنوں خودساختہ جلاوطنی کے دن گزار رہی ہے۔ ''ہندوستان ٹائمز'' نے ''یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا'' کے حوالے سے بتایا ہے کہ

تسلیمہ نسرین نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ سویڈن میں اس کی ذہنی اور معاشی حالت انتہائی ابتر ہے اور اس کو اس حال تک پہنچانے کی تمام تر ذمہ داری ''را'' پر عائد ہوتی ہے جس نے اس کو مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل کرنے کے لیے استعمال کرنے کے بعد اب آنکھیں بدل لی ہیں۔ تسلیمہ کا کہنا ہے کہ اس نے متعدد بار سویڈن کی آزاد زندگی سے تنگ آ کر بھارت جانے کے لیے ویزہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو ہر بار انکار کر دیا گیا۔''

اس میں جہاں اس حقیقت کا ایک بار پھر اظہار ہوتا ہے کہ دینِ اسلام اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنے والے کو دنیا میں کہیں بھی سکون نہیں مل سکتا، وہاں یہ واقعہ ان لوگوں کے لیے بھی عبرت کا سبق ہے جو دنیا کے مفادات کی خاطر غیر مسلم لابیوں اور ایجنسیوں کا آلہ کار بن کر مسلمانوں میں فکری انتشار اور سیاسی خلفشار پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۶ء)

”پاکستان بنانے کا گناہ“
اور مولانا مفتی محمودؒ

گزشتہ ایک کالم میں قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے منسوب کیے جانے والے اس جملے کے بارے میں اصل صورتحال کی وضاحت کروں گا کہ:

”ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔“

یہ بات میرے سامنے ہوئی تھی اس لیے اس سلسلہ میں اصل قصہ کو تاریخ کے ریکارڈ پر لانا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ لیکن پہلے اس پس منظر کا ذکر ضروری ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق اصلاً جمعیۃ علماء ہند سے تھا جس نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ مجلس احرار اسلام نے بھی تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور ہندوستان کی تقسیم سے اختلاف کیا تھا اور روایتی جوش و خروش کے ساتھ کیا تھا۔ جبکہ علماء دیوبند کی ایک بڑی تعداد نے جمعیۃ علماء ہند سے الگ ہو کر جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے تحریک پاکستان میں سرگرم کردار ادا کیا تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس انکار کی ضرورت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام دونوں قیامِ پاکستان کے خلاف تھیں اور انہوں نے اس کی مخالفت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ ان جماعتوں کا موقف یہ تھا کہ:

☆ مسلم لیگی قیادت نفاذ اسلام میں سنجیدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی اہلیت رکھتی ہے۔

☆ قیامِ پاکستان سے برصغیر کے مسلمان تقسیم ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کے کسی کام نہیں آسکیں گے۔

☆ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھارت میں ہندوؤں کے رحم وکرم پر رہ جائے گی۔

جہاں تک نتائج کا تعلق ہے نصف صدی بعد ہمیں انہی نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کا اظہار ان جماعتوں کے قائدین تحریک پاکستان کی مخالفت میں خدشات کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگی قیادت کئی بار اقتدار ملنے کے باوجود نفاذ اسلام کی طرف نصف صدی میں کوئی پیشرفت نہیں کرسکی۔اور برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قوت کے تقسیم ہو جانے کے بعد مسلم لیگی راہنما چودھری خلیق الزمان مرحوم کے اس اعتراف کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی جو انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد ''اخبار جہاں'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا۔انہوں نے کہا تھا کہ

''ہمارے طرز عمل کے باعث برصغیر کے مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں جو ایک دوسرے کی کسی مشکل میں کام نہیں آسکتے۔''

تاہم اس سب کچھ کے باوجود قیامِ پاکستان کی مخالفت ایک سیاسی رائے تھی جسے جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے راہنماؤں نے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ بلکہ جب دیکھا کہ مسلمانان ہند نے ان کی رائے کی حمایت نہیں کی اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا ہے تو انہوں نے خوش دلی کے ساتھ اس فیصلہ کو قبول کر لیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کچھ حقائق قارئین کے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔تحریک پاکستان کی مخالفت میں علماء کرام میں سب سے نمایاں تین نام ہیں:

(۱) مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

(۲) امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

(۳) مولانا ابوالکلام آزادؒ

بلاشبہ ان تینوں حضرات نے قیامِ پاکستان کے خلاف اپنی رائے کو پورے شدومد کے ساتھ پیش کیا مگر پاکستان بن جانے کے بعد ان کا طرز عمل کیا تھا اسے بھی سامنے رکھ لیجیے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ان کے پاکستان میں رہنے والے عقیدت مندوں نے آئندہ کے بارے میں راہنمائی طلب کی تو انہوں نے واضح طور پر ہدایت کی کہ پاکستان کی سالمیت واستحکام کے لیے کام کریں اور ماضی کو بھول جائیں۔مولانا مدنیؒ نے اس سلسلہ میں بڑی

خوبصورت مثال دی جوان کے مکتوب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسجد بننے سے پہلے اہل محلّہ کا اختلاف ہوسکتا ہے کہ مسجد یہاں بنے وہاں نہ بنے، اتنی جگہ میں بنے اور اتنی میں نہ بنے۔ لیکن جب ایک فریق کی رائے غالب آ گئی اور انہوں نے دوسرے فریق کی رائے کے خلاف مسجد بنالی تو اب یہ مسجد سب کے لیے مسجد ہی ہے۔ اور اس کا احترام اور اس کے تقدس کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لاہور میں جلسہ عام منعقد کر کے اعلان کیا کہ قوم نے ان کی رائے کو قبول نہیں کیا اس لیے وہ قوم کا فیصلہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے حق میں دستبردار ہوتے ہیں، اور اب وہ پاکستان کی سالمیت و استحکام کے لیے بھرپور کردار ادا کریں گے۔ چنانچہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کی پہلی جنگ میں مسلم لیگ کے ساتھ جس جماعت نے جہاد کشمیر کی حمایت میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے سب سے زیادہ کام کیا وہ مجلس احرار اسلام تھی۔

اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں بھی یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر آ چکی ہے کہ تقسیم ہند کے موقع پر جب ریاستوں کو اس بات کا اختیار ملا کہ وہ اپنی مرضی سے پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تو بلوچستان کی ریاست قلات کے نواب میر احمد یار خان مرحوم نے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ مگر اس کے اعلان سے قبل کانگریسی راہنماؤں سے رابطہ کے لیے اپنے وزیر دربار میر غوث بخش بزنجو مرحوم کو بھیجا تاکہ بھارتی حکومت سے گفت و شنید کے بعد بھارت کے ساتھ قلات کے الحاق کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔ میر غوث بخش بزنجو مرحوم دہلی پہنچے تو اس خیال سے پہلے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ملے کہ اس طرح کانگریس کی ہائی کمان کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی رہے گی۔ مولانا آزادؒ نے نواب قلات کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے میر غوث بزنجو کو دوسرے کانگرسی راہنماؤں کے ساتھ ملنے سے روک دیا اور یہ تلقین کر کے واپس بھیج دیا کہ پاکستان بن چکا ہے اس لیے آپ لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق کریں اور اسے مضبوط بنائیں۔

مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق اسی قافلہ سے تھا اور اپنے ان اکابر کے اسی طرز عمل کے مطابق انہوں نے خود کو پاکستان کی سالمیت و استحکام میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے لیے وقف کر رکھا

تھا۔اس سلسلہ میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد جب صدر یحیٰی خان نے پارلیمنٹ کا طلب کردہ اجلاس ملتوی کر دیا اور شیخ مجیب الرحمان نے اس کے ردعمل میں ہڑتال کا اعلان کر کے مشرقی پاکستان کا پورا نظام جام کر دیا تو پاکستان کی تقسیم کا خطرہ حقیقی طور پر بالکل سامنے نظر آنے لگا۔اس موقع پر معاملات کو سلجھانے کے لیے قومی اسمبلی کی چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں نے لاہور میں اجلاس منعقد کر کے فریقین سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا۔ان کے وفد میں مولانا مفتی محمودؒ بھی مذاکرات میں شرکت کے لیے ڈھاکہ گئے اور شیخ مجیب الرحمان سے ملے۔

مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ میں ان مذاکرات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اور خان عبدالولی خان دونوں شیخ مجیب سے ملے اور ان سے دیگر بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ:

> ’’شیخ صاحب! یہ بات یاد رکھیں کہ آپ مسلم لیگی ہیں اور ہم کانگرسی۔کل آپ پاکستان بنا رہے تھے تو ہم نے کہا تھا کہ نہ بنائیں اس سے مسلمانوں کا نقصان ہوگا۔اور آج آپ پاکستان توڑ رہے ہیں تو ہم آپ سے یہ کہنے آئے ہیں کہ اسے نہ توڑیں مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔‘‘

اس پس منظر میں بعض مجالس میں اس وقت کے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ایک بیان کا جواب دیتے ہوئے، جس میں بھٹو مرحوم نے اپوزیشن پر پاکستان کی تقسیم کی ذمہ داری کا الزام عائد کیا تھا اور مفتی صاحبؒ اس وقت اپوزیشن لیڈر تھے، مولانا مفتی محمودؒ نے کہا تھا کہ:

> ’’ہم پاکستان کی تقسیم کے ذمہ دار نہیں ہیں، اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ہم تو ہندوستان کی تقسیم کے حق میں بھی نہیں تھے پاکستان کی تقسیم کے کس طرح حق میں ہو سکتے ہیں؟ یہ تقسیم کرنا تمہارا ہی کام ہے، کل بھی ملک تم نے تقسیم کیا اور آج بھی تم نے ملک کو دولخت کیا ہے۔اگر یہ تقسیم گناہ ہے تو اس گناہ میں ہم نہ کل شریک تھے اور نہ آج اس گناہ میں ہم حصہ دار ہیں۔‘‘

الفاظ اور جملوں کی ترتیب میں کمی بیشی ہوسکتی ہے لیکن میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مولانا

مفتی محمودؒ نے جو کچھ کہا اس کا پورا مفہوم بیان ہو جائے۔ یہ بات انہوں نے اکتوبر ۱۹۷۵ء کے دوران جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے ملک گیر کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ کی تھی، اور میں اس کنونشن کا اسٹیج سیکرٹری تھا۔ جبکہ بعض دیگر مجالس میں بھی انہوں نے یہ بات کہی جسے یار دوستوں نے اس جملے میں تبدیل کر دیا کہ ''ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔'' اور اس کے بعد سے اس بات کو مسلسل دہرایا جا رہا ہے۔

بہرحال علماء کا وہ حلقہ جس نے ایک سیاسی رائے اور موقف کے طور پر پاکستان کے قیام کی مخالفت کی تھی اور اسے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مجموعی مفاد میں مفید نہیں سمجھا تھا، انہوں نے پاکستان بن جانے کے بعد نہ صرف اسے خوش دلی کے ساتھ تسلیم کیا بلکہ آج وہی علماء پاکستان کے استحکام و سالمیت اور اسے ایک اسلامی نظریاتی ریاست بنانے کے لیے سب سے زیادہ سرگرم عمل ہیں، اور غالباً تحریک پاکستان کی اصل منزل بھی یہی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد...... ۲۳ مئی ۱۹۹۹ء)

پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی

مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے اور اس کی پیچیدگی اور سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر حافظ سعید کا تعلق اہل حدیث مکتب فکر سے ہے، انہوں نے ''لشکر طیبہ'' کے نام سے مجاہدین کی جماعت بنائی جس نے بہت جلد مجاہدین کی تنظیموں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مجاہدین کی حمایت کے لیے شروع سے سرگرم عمل رہے جبکہ افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت اور امریکی عزائم کی مذمت ومخالفت میں پروفیسر حافظ محمد سعید ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی جماعت کو نہ صرف امریکہ کی طرف سے دہشت گرد قرار دیا گیا بلکہ پاکستان میں بھی اس پر پابندی لگا دی گئی جس پر انہوں نے ''جماعۃ الدعوۃ'' کے نام سے ایک نئی دینی وسیاسی جماعت کی تشکیل کا اعلان کر دیا اور ''لشکر طیبہ'' کو کشمیر کے دائرہ میں محدود کر کے پاکستان میں اس کی سرگرمیاں ختم کر دیں۔ تب سے وہ جماعت الدعوۃ کے امیر ہیں اور ملک کی دینی سیاست میں سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔

حافظ محمد سعید کو افغانستان پر امریکی حملہ کے موقع پر ''دفاع پاکستان وافغانستان کونسل'' کے مشترکہ فورم سے احتجاجی مہم میں متحرک کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا۔ کئی ماہ کے بعد وہ رہا ہوئے لیکن کچھ دنوں کے بعد دوبارہ گرفتار کر لیے گئے، ان کی گرفتاری کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں اور حکومتی حلقوں کی طرف سے ان خبروں پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی۔ لیکن جب گزشتہ دنوں ان کی اہلیہ محترمہ نے لاہور ہائی کورٹ میں ان کی گرفتاری یا نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کی تو صوبائی حکومت نے عدالت عالیہ کے سامنے یہ موقف اختیار کر کے سب کو حیرت زدہ کر دیا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو حکومت نے گرفتار نہیں کیا اور وہ حکومت کی تحویل میں نہیں ہیں اور نہ ہی ان

کے بارے میں صوبائی حکومت کو علم ہے کہ وہ کہاں ہیں؟ اس کے بعد جب وفاقی حکومت سے دریافت کیا گیا تو حکومت پاکستان کے وکیل نے بھی لاہور ہائیکورٹ میں وہی موقف دہرایا جو صوبائی حکومت اس سے قبل پیش کر چکی تھی۔

اس طرح اب صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید غائب ہیں، ان کے گھر والوں کو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں اور وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہیں۔ دوسری طرف حکومت نے واضح طور پر ان کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے کہ نہ انہیں گرفتار کیا گیا ہے اور نہ ہی حکومت ان کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔

ہمارے خیال میں حکومت کا یہ کہنا قرین قیاس نہیں ہے اور پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں اس درجہ کی لاعلمی کا اظہار کر کے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ورنہ اگر حکومت کا یہ موقف درست ہے تو اس کا اظہار اس وقت ہونا چاہیے تھا جب حافظ سعید کی دوبارہ گرفتاری کی خبریں قومی اخبارات میں شائع ہوئیں اور مسلسل کئی روز تک اس گرفتاری پر احتجاج بھی ہوتا رہا۔ اگر حکومت نے انہیں گرفتار نہیں کیا تھا تو اس کا فرض بنتا تھا کہ اسی وقت حکومت کی طرف سے ان خبروں کی تردید جاری کی جاتی اور واضح طور پر قوم کو بتا دیا جاتا کہ یہ خبریں غلط ہیں اور حکومت نے انہیں حراست میں نہیں لیا۔ حافظ صاحب ملک کی معروف دینی شخصیت ہیں اور ایک دینی سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں۔ ان کی گرفتاری کی خبروں پر حکومت کا خاموش رہنا اور کئی ماہ گزر جانے کے بعد ہائیکورٹ میں اس سے بے خبری کا اظہار کرنا نہ تو قانون وضابطہ کی زبان میں درست طرز عمل ہے اور نہ ہی اخلاقی طور پر اس کا کوئی جواز بنتا ہے۔

دوسری طرف ایک خبر کے مطابق حافظ محمد سعید کی اہلیہ نے اپنے شوہر کی گمشدگی یا گرفتاری کے کیس میں صوبائی وزیر مذہبی امور مفتی غلام سرور قادری کو فریق بنانے کی درخواست دے دی ہے جنہوں نے مبینہ طور پر ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ حافظ محمد سعید حکومت کی حراست میں ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کیس کی سنگینی میں اس بات سے کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید ان حضرات میں سے ہیں جن کے بارے میں امریکہ اور بھارت دونوں ملکوں کی حکومتیں اس بات میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اس کا کھلم کھلا مطالبہ کر چکی ہیں کہ انہیں آزاد نہ چھوڑا جائے، ان کی

سرگرمیوں کو ختم کرایا جائے بلکہ انہیں ایک ’’دہشت گرد‘‘ کے طور پر امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا جائے۔ اس لیے ان کی گرفتاری کی واضح خبروں کے کافی عرصہ بعد حکومت کی طرف سے ان کے بارے میں بے خبری کا اعلان ذہنوں میں یہ شک پیدا کرتا ہے کہ کہیں انہیں کسی ’’خفیہ ڈیل‘‘ کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے تو نہیں کر دیا گیا؟ اور صدر جنرل پرویز مشرف نے امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی آمد کے موقع پر جو یہ اعلان فرمایا ہے کہ ہم نے کشمیر میں ’’دہشت گردی‘‘ کو ختم کرنے کے لیے بہت کچھ کر دیا ہے۔ کہیں اس بہت کچھ میں پروفیسر حافظ محمد سعید کی ’’گمشدگی‘‘ بھی تو شامل نہیں ہے؟

ہمارے ہاں اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں اور ہضم بھی ہو جایا کرتی ہیں اس لیے ہمارا یہ خدشہ بے جا نہیں ہے۔ ہم نے ملا عبدالسلام ضعیف کو افغانستان کا سفیر تسلیم کر رکھا تھا اور ان کے کاغذات سفارت باقاعدہ ایوان صدر میں قبول کیے گئے تھے لیکن افغانستان میں ان کو سفیر مقرر کرنے والی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب وہ سفیر نہ رہے تو ان کے ساتھ ڈیلنگ کے سفارتی تقاضے، ضوابط اور اخلاق کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے موجود تھا، جبکہ انہوں نے سیاسی پناہ کی درخواست بھی دے رکھی تھی، جو ہمارے ہاں زیر غور تھی۔ دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ کسی سفارت کار کی سیاسی پناہ کی درخواست زیر غور ہو اور اس کا فیصلہ کیے بغیر اسے اس کے دشمن کے حوالے کر دیا جائے جبکہ واضح طور پر اس کو جان کا خطرہ بھی نظر آ رہا ہو۔ مگر ہم نے ایسا کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ نہ سفارتی آداب نے ہمارا دامن پکڑا اور نہ ہی قانون و ضابطہ کی کوئی دفعہ ہمارا ہاتھ روک سکی۔ چنانچہ ایک مسلمہ سفارت کار ہمارے ہاتھوں جنگی مجرم کا درجہ پا کر دشمن کی حراست میں ہے جس کے بارے میں وحشیانہ تشدد کی خبریں بار بار عالمی پریس میں آ رہی ہیں اور چند روز سے اسی تشدد کی وجہ سے ان کی موت اور شہادت کی خبریں بھی منظر عام پر آنا شروع ہو گئی ہیں۔

اس پس منظر میں جماعت الدعوۃ پاکستان کے امیر اور ملک کے معروف سیاسی و دینی رہنما پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی ملک بھر کے دینی حلقوں اور محبِّ وطن عناصر کے لیے سخت پریشانی اور اضطراب کا باعث بن گئی ہے اور پروفیسر صاحب محترم کی زندگی کے حوالے سے سنگین اور شدید خدشات ذہنوں میں ابھر رہے ہیں۔ اس لیے حکومت پاکستان یا پنجاب حکومت عدالت عالیہ میں

یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو جاتی کہ اسے پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے اور اس نے انہیں حراست میں نہیں لیا۔ بلکہ یہ حکومت کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن عوام کے سامنے واضح کرے اور ان کی رہائی یا بصورت دیگر بازیابی کے لیے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے فوری اور ٹھوس اقدامات کرے۔ ورنہ اگر حکومت نے اس حوالے سے سنجیدگی کا مظاہرہ نہ کیا تو عوم کے ذہنوں سے اس شبہ کو نکالنا مشکل ہو جائے گا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو ''خفیہ ڈیل'' کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اب بے خبری کے اظہار کے ذریعے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور---۶ اگست ۲۰۰۲ء)

مولانا محمد مسعود اظہر کی دوبارہ گرفتاری

کالعدم جیش محمدؐ کے سربراہ مولانا مسعود اظہر کے خلاف حکومت عدالت عالیہ میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی اور لاہور ہائیکورٹ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا ہے لیکن امریکی دباؤ اور بھارت کا واویلا عدالت عالیہ کے فیصلے پر غالب آ گیا اور حکومت نے انہیں رہا کرنے کی بجائے ان کی دوبارہ گرفتاری کے احکام جاری کر دیے ہیں۔ مولانا مسعود اظہر کو افغانستان پر امریکی حملے کے دوران پاکستان میں اس کے خلاف ردعمل کی عوامی تحریک میں سرگرم کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا اور اس وقت سے وہ مسلسل زیر حراست ہیں۔ اس ''جرم'' میں ان کے علاوہ مولانا فضل الرحمٰن، قاضی حسین احمد، مولانا اعظم طارق اور پروفیسر حافظ محمد سعید بھی گرفتار ہوئے تھے لیکن وہ سب باری باری رہا ہو چکے ہیں مگر مولانا مسعود اظہر کی رہائی کے لیے حکومت خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں پا رہی یا امریکہ اور بھارت کا دباؤ اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے سامنے عدالت عالیہ کے حکم کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔

بہرحال جو صورت بھی ہو مولانا مسعود اظہر کی دوبارہ گرفتاری قابل مذمت ہے، حکومت سے ہماری گزارش ہے کہ وہ قومی خودمختاری، ملی حمیت اور عوامی جذبات کے حوالہ سے اپنے طرز عمل کا از سر نو جائزہ لے اور امریکہ اور بھارت کی تابعداری میں اس حد تک آگے نہ جائے کہ ملی حمیت اور قومی غیرت کا ہر دائرہ امریکی عزائم اور بھارتی دھمکیوں کے ہاتھوں پامال ہوتا چلا جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ دیگر راہنماؤں کی طرح مولانا محمد مسعود اظہر کو بھی رہا کر دے اور بھارتی دھمکیوں کے آگے سیر انداز ہونے کی بجائے قومی حمیت کا مظاہرہ کرے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ......جنوری ۲۰۰۳ء)

دورۂ بھارت:
مولانا قاضی حمید اللہ خان کے تاثرات

۱۲ اگست ۲۰۰۳ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں عصر کی نماز کے بعد پاکستان شریعت کونسل کی طرف سے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی ایک نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں مولانا قاضی حمید اللہ خان ایم این اے نے اپنے حالیہ دورۂ بھارت کے تاثرات بیان کیے۔ نشست کی صدارت جمعیۃ علماء اسلام کے رہنما مولانا سید عبد المالک شاہ نے کی اور اس میں علماء کرام، طلبہ اور دینی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

راقم الحروف نے تقریب کے آغاز میں گزارش کی کہ مولانا فضل الرحمان کی قیادت میں حافظ حسین احمد، مولانا حمید اللہ خان اور مولانا گل نصیب خان پر مشتمل جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے پارلیمانی وفد نے بھارت کا دس روزہ دورہ کیا تو ان کی واپسی پر ہم پاکستان میں اس بات کے منتظر تھے کہ ان رہنماؤں کی زبانی وہاں کے مسلمانوں کے حالات سنیں گے، دینی اداروں اور مدارس کی صورتحال سے آگاہی حاصل کریں گے اور بھارت میں مسلمانوں کے معاملات اور حالات کے حوالہ سے ان بزرگوں کے تاثرات وخیالات معلوم کریں گے۔ لیکن مولانا فضل الرحمان کے ایک دو مبینہ طور پر متنازعہ بیانات کے شوروغل اور وضاحت کرنے یا نہ کرنے کے چکر میں سارا معاملہ گول ہو گیا اور ہم ان حضرات سے جو کچھ سننا چاہ رہے تھے اس کا ابھی تک کوئی اہتمام دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے مقامی سطح پر پاکستان شریعت کونسل نے اس نشست کا اہتمام کیا اور حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خان سے ہم نے گزارش کی ہے کہ وہ اپنے دورہ کی کچھ تفصیلات

اور تاثرات سے ہمیں آگاہ کریں۔

مولانا قاضی حمید اللہ خان نے نشست سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارا یہ دورہ سرکاری سطح پر نہیں تھا بلکہ جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے وفد کا دورہ تھا اور جمعیۃ علماء ہند ہی اس سفر میں ہماری میزبان تھی۔ ہم جب واہگہ بارڈر کراس کر کے بھارت کی حدود میں داخل ہوئے تو جمعیۃ علماء ہند کے رہنما اور کارکن ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے جنہوں نے ہمیں پھولوں سے لاد دیا اور بے حد محبت و شفقت کا اظہار کیا۔ وہاں سے ہم امرتسر پہنچے جہاں جمعیۃ علماء ہند نے ہمارے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا لیکن جب سکھ رہنماؤں سے ملاقات کے لیے دربار صاحب پہنچے تو انہوں نے تقاضہ کیا کہ دوپہر کا کھانا آپ حضرات بہرصورت ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ چنانچہ ان کے اصرار پر ہم نے اس شرط پر ان کی دعوت قبول کی کہ سادہ دال اور روٹی کی صورت میں ہم ان کے ہاں دوپہر کا کھانا کھالیں گے اور پھر یہی ہوا۔ اس موقع پر وفد کے ارکان کو دربار کا ماڈل تحفہ کے طور پر دیا گیا اور اعزاز کے طور پر ان کی دستار بندی بھی کی گئی۔

امرتسر سے یہ وفد جمعیۃ علماء ہند کے قائدین کے ہمراہ جالندھر پہنچا تو وہاں بڑی تعداد میں لوگ شہر سے باہر استقبال کے لیے موجود تھے جن میں غیر مسلم بھی شامل تھے۔ تھوڑی دیر وہاں گزار کر وفد لدھیانہ روانہ ہو گیا وہاں بھی شہر سے باہر ان کا استقبال کیا گیا۔ جبکہ اس کے بعد رات وفد نے سرہند شریف حاضری دی جہاں ملت اسلامیہ کے عظیم رہنما حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی قبر ہے۔ قبر پر حاضری دی اور دعا و سلام کی سنت ادا کی، قاضی صاحب نے بتایا کہ حضرت مجدد صاحبؒ کی قبر کا ماحول دیکھ کر ہم بہت متاثر ہوئے۔

سرہند شریف سے یہ وفد رات ہی رات سہارنپور پہنچا اور دیکھا کہ مظاہر العلوم کے علماء و اساتذہ رات کے پچھلے پہر وفد کے استقبال کے لیے شہر سے باہر موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ ساری رات وہ گھروں میں نہیں گئے، انہوں نے سحری کے وقت وفد کی مہمان نوازی کی اور پھر وفد دیوبند روانہ ہو گیا وہاں بھی علماء و طلبہ کی ایک بڑی تعداد دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھی۔ دیوبند میں دو دن قیام ہوا، دارالعلوم دیوبند کا دورہ کیا، اساتذہ و طلبہ سے مختلف معاملات پر تبادلۂ خیالات ہوا، دارالعلوم کے شعبے دیکھے اور یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں چار ہزار

کے لگ بھگ طلبہ مختلف شعبوں میں دینی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمان اور دیگر اکابر سے ملاقات ہوئی۔ وفد دارالعلوم (وقف) میں بھی گیا جو دیوبند میں ہی حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کے زیر اہتمام کام کررہا ہے اور وہاں اڑھائی ہزار کے لگ بھگ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ دیوبند میں مسجد چھتہ دیکھی جہاں ۱۸۶۶ء میں مدرسہ عربیہ کے نام سے دارالعلوم کا آغاز ہوا تھا اور دوسرے مراکز اور اہم مقامات میں بھی وفد کے ارکان گئے۔

دیوبند میں دو روز قیام کے بعد جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے قائدین دہلی روانہ ہوئے جہاں ان کا قیام جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں تھا۔ جمعیۃ کا وسیع وعریض دفتر جو کسی حکومت کا سیکرٹریٹ معلوم ہوتا ہے ایک تاریخی مسجد کے ساتھ ہے جو اکبر بادشاہ کے استاذ مولوی عبد النبیؒ کے نام سے موسوم ہے اور کم وبیش پانچ سو برس قبل تعمیر ہوئی تھی۔ جمعیۃ کا دفتر دیکھ کر ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی کہ اتنا وسیع اور مربوط نظام ہے کہ مختلف شعبے بیک وقت کام کر رہے ہیں، دنیا بھر سے رابطے ہو رہے ہیں، مہمانوں کو سنبھالا جا رہا ہے، ہسپتال کام کر رہا ہے اور ہندوستان بھر کے مظلوم اور بے سہارا مسلمانوں کی امداد وتعاون کا وسیع نیٹ ورک موجود ہے۔ جمعیۃ کے صدر دفتر کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ اس میں بیک وقت دس ہزار افراد سما سکتے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے تحت ملک کے مختلف حصوں میں ڈیڑھ سو کے قریب اسکول چل رہے ہیں، ڈیڑھ درجن سے زائد ہسپتال مصروف عمل ہیں اور صوبہ گجرات کے حالیہ فسادات کا شکار ہونے والے مسلمانوں کے لیے جمعیۃ علماء ہند نے پانچ ہزار کے قریب مکانات تعمیر کر کے انہیں دیے ہیں۔

مولانا قاضی حمید اللہ خان کا کہنا ہے کہ ہم تو یہ ماحول دیکھ کر بالکل ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔ خیر اسی ماحول میں چھ دن گزارے اور روزانہ کئی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جن میں بھارتی وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری واجپائی اور اپوزیشن لیڈر سونیا گاندھی کے علاوہ مختلف سیاسی رہنما اور مذہبی قائدین شامل ہیں۔ ہم نے سکھوں اور ہندوؤں کے مذہبی رہنماؤں سے بھی ملاقات کی۔ جب ہم ہندو پنڈتوں سے ملے تو وہ ہمارے بارے میں مختلف شکوک وشبہات کا شکار تھے، ہم نے انہیں بتایا کہ ہم امن پسند لوگ ہیں، جنگ اور تشدد پر یقین نہیں رکھتے اور باہمی اختلافات کو مذاکرات اور گفتگو کے ذریعے حل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہم نے جب ان کے شکوک و

شبہات رفع کیے تو وہ بے ساختہ بول اٹھے کہ پاکستان اور بھارت کے عوام کے درمیان معمول کے تعلقات اور دوستی کا ماحول اگر بحال ہوسکتا ہے تو وہ دونوں طرف کے پنڈتوں (مذہبی رہنماؤں) کی کوششوں سے ہی ہوسکتا ہے کیونکہ سیاستدان تو مفادات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے ہندوستان کے رہنماؤں پر واضح کیا کہ ہمارے درمیان تنازع اور جھگڑے کی سب سے بڑی وجہ مسئلہ کشمیر ہے اور ہم کشمیر میں مسلمانوں کی تحریک کو دہشت گردی نہیں سمجھتے بلکہ آزادی کی جدوجہد تصور کرتے ہیں جو ان کا حق ہے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا ہمارے تعلقات معمول پر نہیں آسکیں گے اور دونوں ملکوں کے عوام اس کشمکش کی فضا میں مسائل ومشکلات کی دلدل میں پھنسے ہیں گے۔ اس لیے مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنا ہوگا۔

قاضی حمید اللہ خان نے کہا کہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے دورے کو بطور خاص اہمیت دی جا رہی ہے کیونکہ ہم امن اور صلح کی بات کر رہے تھے اور تنازعات کو باہمی مذاکرات کے ذریعے حل کرنے پر زور دے رہے تھے، ہم نے ان پر یہ بھی واضح کیا کہ ہم جنگ کو کشمیر کے مسئلہ کا حل نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے حکمران باہم بیٹھ کر اس مسئلہ کو حل کریں۔ اس کے ساتھ ہی ہم مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے امریکہ کی مداخلت اور ثالثی کے حق میں بھی نہیں ہیں کیونکہ اگر امریکہ اس بہانے یہاں آ گیا تو پھر اس خطہ میں وہی ہوگا، پاکستان اور بھارت دونوں غائب ہو جائیں گے۔ اس حوالہ سے مولانا فضل الرحمان نے مسٹر واجپائی سے کہا کہ جنوبی ایشیا کی مثال اس خیمے کی طرح ہے جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ بدو اس کے اندر تھا اور باہر اونٹ بندھا ہوا تھا، جب سردی بڑھی تو اونٹ نے بدو سے خیمے کے اندر آنے کی اجازت مانگی، بدو نے سوچا اگر یہ اندر آ گیا تو میں کہاں جاؤں گا؟ اس لیے اس نے انکار کر دیا۔ اونٹ نے کہا کہ صرف گردن اندر کرنے کی اجازت دے دو، بدو نے اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے ہوئے اس کی اجازت دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر بعد اونٹ اندر تھا اور بدو خیمے سے باہر اپنے لیے جائے پناہ تلاش کر رہا تھا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ امریکہ کا اونٹ جنوبی ایشیا کے خیمے سے باہر ہی رہے اور عراق اور افغانستان کا تجربہ نہ دہرایا جائے کیونکہ اگر ایک دفعہ اونٹ کو گردن خیمے کے اندر کرنے کی اجازت

دے دی تو پھر سارا اونٹ اندر ہوگا ہم خیمے سے باہر ہوں گے۔

قاضی صاحب نے بتایا کہ ہم نے کشمیر کی تحریک حریت کے راہ نماؤں میر واعظ مولوی عمر فاروق سے بھی کئی ملاقاتیں کیں اور ان سے مختلف معاملات پر گفتگو کی۔ وہ بہت سمجھدار اور متحرک نوجوان ہیں جو کشمیری مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہم اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ ہیں اور ان کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ دونوں طرف سے باہمی تعلقات کو معمول پر لانے میں مذہبی رہنما زیادہ بہتر طور پر کام کر سکتے ہیں کیونکہ وہی لوگ انسانیت کی عمومی بھلائی کی بات کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے لوگ صرف اپنے اپنے طبقہ کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہیں، سیاستدانوں کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اور تاجروں کی صورتحال یہ ہے کہ گزشتہ دنوں چیمبر کا ایک وفد بھارت گیا تو وہ وہاں یہ تلاش کرتا رہا کہ یہاں کون سی چیز سستی ہے جو پاکستان لے جا کر فائدہ دے گی اور کونسی چیز مہنگی بک سکتی ہے تاکہ پاکستان سے یہاں لا کر بیچی جائے۔ مگر علماء نے بھارت جا کر عوام کے عمومی مفاد کی بات کی اور ان کے درمیان بعد اور کشیدگی کم کرنے پر زور دیا جس کی بطور خاص پذیرائی ہوئی اور سب لوگوں نے اس فرق کو محسوس کیا۔

انہوں نے کہا کہ دہلی میں چھ دن گزار کر ہم واپسی کی تیاری کر رہے تھے کہ مراد آباد سے مدرسہ شاہی کے حضرات کا پیغام آ گیا جو اس بات پر سخت ناراض تھے کہ اس دورے میں مراد آباد کو کیوں شامل نہیں کیا گیا؟ ان کا یہ شکوہ دو وجہ سے درست تھا، ایک اس وجہ سے کہ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے ساتھ مدرسہ شاہی مراد آباد بھی ان قدیم ترین مدارس میں سے ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جنوبی ایشیا میں دینی تعلیمات کے تحفظ اور فروغ کی جدوجہد کا نقطہ آغاز بنے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ اس مدرسہ میں سات برس تک تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اس لیے مدرسہ شاہی کے اساتذہ اور طلبہ کو بجا طور پر توقع تھی کہ مولانا مفتی محمودؒ کے فرزند و جانشین مولانا فضل الرحمان کی قیادت میں پاکستان سے آنے والا علماء کا وفد مراد آباد ضرور آئے گا۔ چنانچہ ان حضرات کے شدید اصرار بلکہ ایک طرح کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ہمیں وہاں جانا پڑا۔ اور ان بزرگوں نے بھی خوب پذیرائی کی، مراد آباد میں ہم دو دن رہے، بہت

سے پرانے اساتذہ کو مولانا مفتی محمودؒ کا دورِ طالب علمی یاد تھا اور اس کا وہاں عام طور پر تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ مفتی محمود صاحبؒ طالب علمی کے دور میں ملی، سیاسی اور تحریکی ذوق رکھتے تھے اور ملی معاملات میں طلبہ کی قیادت کرتے تھے۔ ایک بار شہر میں ایک مسلمان کسی ہندو کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو مولانا مفتی محمودؒ نے احتجاج کے طور پر نہ صرف مدرسہ میں ہڑتال کرا دی بلکہ طلبہ کا ہجوم لے کر شہر کی طرف نکل گئے اور شہر میں بھی ہڑتال ہو گئی۔ مفتی صاحبؒ کے دورِ طالب علمی کے بہت سے واقعات وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو یاد تھے اور وہ بڑی محبت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے رہے۔

مولانا قاضی حمید اللہ خان نے اپنے دورہ کے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ جس چیز سے وہاں سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ سادگی اور بے تکلفانہ زندگی ہے۔ ہمارے ہاں کے تکلفات اور تصنع وہاں نہیں ہے بالخصوص مسلمانوں کی زندگی، خوراک، رہائش اور رہن سہن سادہ ہے جس سے خلوص اور نیکی ٹپکتی ہے۔ مسلمان عام طور پر غریب ہیں لیکن دین میں اسی قدر مضبوط ہیں، دینی اقدار و روایات کی پابندی، اسلامی شعائر کے احترام اور دینی معمولات میں وہ ہم سے کہیں آگے ہیں اور دینی حمیت و غیرت کے اظہار میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسری بات جس نے وہاں ہمیں بہت متاثر کیا وہ وہاں کے علماء اور عام مسلمانوں کی پاکستان کے علماء اور مسلمانوں سے محبت و عقیدت ہے۔ ہم تو وہاں اس جذبہ اور احساس کے ساتھ گئے تھے کہ ہمارا علمی اور فکری مرکز وہاں ہے اور ہمارے اساتذہ کی مادر علمی ہے لیکن انہوں نے اس طرح ہمیں پذیرائی بخشی جیسے ہم ان کے لیے عقیدت کے مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں اس پر شرمندگی بھی ہوئی لیکن ان کی اس محبت و احترام نے ہمارے حوصلوں کو دوچند کر دیا۔

مولانا قاضی حمید اللہ خان کے تاثرات و ارشادات کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد راقم الحروف کی گزارش یہ ہے کہ سیاسی مسائل سے ہٹ کر بھارت کے عمومی حالات، مسلمانوں کی صورتحال، علماء کرام اور دینی مدارس و مراکز کی سرگرمیوں اور عالم اسلام کے اجتماعی مسائل کے اجتماعی مسائل کے حوالہ سے وہاں کے علماء کرام، دانشوروں اور رہنماؤں کے خیالات و افکار، معاشرتی زندگی میں مسلمانوں کو درپیش مشکلات و مسائل اور مسلمانوں کے دینی ماحول کے حوالہ سے مولانا فضل

الرحمان اوران کے رفقاء کے دورۂ بھارت کے تاثرات واحساسات کومزید وضاحت کے ساتھ منظر عام پرلانے کی ضرورت ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ عقیدت اور بھارتی مسلمانوں سے محبت رکھنے والے پاکستانیوں کوان باتوں کا انتظار ہے، اگر مولانا فضل الرحمان یا حافظ حسین احمد اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کرخود اپنے دورہ کی تفصیلات اورتاثرات قلمبند کرسکیں تو یہ تشنگی کم ہو سکتی ہے ورنہ تاثرات کے حوالہ سے یہ دورہ ادھورا ہی رہے گا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور---۶ اگست ۲۰۰۳ء)

بھارتی دانشور ڈاکٹر یوگندر سکند کے خیالات

بھارت کے معروف دانشور ڈاکٹر یوگندر سکند گزشتہ دنوں پاکستان آئے، چند روز لاہور میں قیام کیا، حیدر آباد اور دیگر مقامات پر بھی گئے، دو دن ہمارے ہاں گوجرانوالہ میں قیام کیا، الشریعہ اکادمی کی ایک نشست میں سرکردہ علماء کرام اور اساتذہ وطلبہ سے بھارت کی مجموعی صورتحال خاص طور پر مسلمانوں کے حالات پر گفتگو کی اور مختلف حضرات سے ملاقاتوں کے بعد بھارت واپس چلے گئے۔

ڈاکٹر یوگندر سکند کے والد سکھ تھے، والدہ کا تعلق ہندو خاندان سے تھا اور خود اپنے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ خدا کی ذات پر یقین رکھتے ہیں اور انسانی سوسائٹی کے لیے مذہب کے رفاہی پہلوؤں کے قائل ہیں مگر خود کو کسی خاص مذہب کے دائرے میں پابند نہیں سمجھتے۔ البتہ ان کے مطالعہ، ریسرچ اور تحریروں کا سب سے زیادہ موضوع مسلمان ہیں اور انہوں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اسی حوالہ سے لکھا ہے۔ یوگندر کی ولادت ۱۹٦۷ء میں کلکتہ میں ہوئی، ان کے خاندان کا اصل تعلق پنجاب سے تھا، ان کی والدہ سرگودھا کے قریب گروٹ نامی کسی گاؤں کی تھیں جس کے بارے میں یوگندر سکند کا خیال ہے کہ میانوالی اور سرگودھا کی سرحد کے ساتھ واقع ہے۔ ان کی والدہ کے نانا گوجرانوالہ میں میڈیکل آفیسر رہے ہیں، ان کا نام رائے بہادر روہے مجان بھترا بتایا جاتا ہے اور یوگندر سکند کا خیال ہے کہ وہ شاید ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ گوجرانوالہ میں ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر رہے ہیں۔

یوگندر سکند نے گریجویشن دہلی میں کی اور ایم اے سوشیالوجی میں جواہر لال یونیورسٹی سے کیا۔ گریجویشن کی تعلیم کے دوران انہیں ان کے کسی مسلمان دوست نے قرآن کریم کا پکھتال کا انگلش ترجمہ دیا جس کے مطالعہ سے انہیں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی ہوئی۔ اس دوست کا نام وہ حنیف بتاتے ہیں، اس سے قبل انہیں اسلام کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں عام طور پر پائی جاتی ہیں ان کے ذہن میں بھی موجود تھیں۔ انہیں حنیف مذکور سے بہت معلومات حاصل ہوئیں جبکہ اردو انہوں نے ایک مولانا صاحب سے سیکھی۔ کہتے ہیں کہ مجھے قوالی سننے کا بہت شوق تھا اور اس کے لیے متعدد درگاہوں پر جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں یوگندر کا رابطہ لیفٹ کے ایک گروپ سے ہوا اور ان کے ساتھ سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارت میں لیفٹ کی پارٹیاں ہمیشہ فرقہ واریت کے خلاف فعال اور متحرک رہی ہیں اور اسی کے زیر اثر انہوں نے فرقہ واریت، خاص طور پر ہندو فاشزم کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ دیہات کی زندگی کے بارے میں انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ دیہی سماج کے بارے میں زیادہ معلومات رکھتے تھے اس لیے بعض این جی اوز کے ساتھ دو سال دیہات میں سماجی خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران میوات کے علاقے میں جانے کا موقع ملا، ان کا کہنا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں ہندو رسوم و روایات کے اثرات موجود ہیں۔ یہ بات ان کی دلچسپی کا باعث بنی اور انہوں نے ایم فل کا مقالہ میوات میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ کلچر کے حوالے سے لکھا جس پر انہیں وظیفہ ملا۔

میوات کے سفر کے دوران تبلیغی جماعت کے بارے میں انہیں بہت سی معلومات ملیں اس لیے انہوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے ''تبلیغی جماعت کا آغاز و ارتقاء اور اس کے سماجی اثرات'' پر مقالہ لکھا جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ دونوں مقالے انگلش زبان میں ہیں اور شائع ہو چکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یوگندر سکند برطانیہ اور ہالینڈ گئے۔ لائیڈن میں ڈاکٹر خالد مسعود کی سربراہی میں، جو اَب پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ہیں، بین المذاہب مکالمے کے استاد رہے۔ بھارت میں ایک مسیحی ادارہ ''ہنری مارٹن اسلامک اسٹڈیز'' میں کام کیا۔ ہنری مارٹن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اردو میں پروٹسٹنٹ بائیبل کا ترجمہ سب سے پہلے انہوں نے کیا تھا، ان

کے نام سے یہ تحقیقی ادارہ لاہور میں قائم ہوا تھا اور اب حیدر آباد میں کام کر رہا ہے۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد مسیحیت کی اشاعت و ترویج تھا لیکن ۱۹۸۵ء کے بعد اس کے ڈائریکٹر اینڈ ریس ڈیسوزا نے اس کا رخ سماجی خدمات کی طرف موڑ دیا اور معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان مفاہمت کے فروغ کو اس ادارے کا مشن بنالیا۔

ڈاکٹر یوگندر سکند نے کچھ عرصہ دہلی کی ہمدرد یونیورسٹی میں کام کیا لیکن اب آزادانہ طور پر تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے ''اسلام انٹر فیتھ'' کے عنوان سے ویب سائیٹ بنا رکھی ہے جس پر ''قلندر'' کے نام سے ان کا ویب میگزین شائع ہوتا ہے اور اب تک جن موضوعات پر ان کی کتابیں آچکی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ تبلیغی جماعت کا آغاز وارتقاء اور اس کے سماجی اثرات۔

☆ کیرالہ سے کشمیر تک سفر کے دوران درگاہوں پر حاضری کے مشاہدات و تاثرات جہاں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی حاضری دیتے ہیں۔

☆ تقسیم ہند کے بعد بین المذاہب مکالمے کے حوالے سے مختلف مسلم راہنماؤں کا زاویہ ہائے نگاہ۔

☆ اسلام، ذات پات اور مسلم دلت تعلقات۔

☆ بین المذاہب مفاہمت اور سماجی اصلاح میں کشمیری صوفیاء کرام کا کردار۔

☆ بھارت میں اسلامی تعلیم اور دینی مدارس کا جائزہ۔

میرے بیٹے محمد عمار خان ناصر مدیر ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کا انٹرنیٹ کے ذریعے ڈاکٹر یوگندر سکند سے کافی عرصہ سے رابطہ ہے اور ماہنامہ الشریعہ میں ان کی بعض تحریروں کا ترجمہ شائع ہوتا رہتا ہے۔ اسی حوالہ سے وہ پاکستان آمد کے موقع پر گوجرانوالہ بھی آئے اور دو روز ہمارے مہمان رہے۔ میں نے اس دوران ایک نشست میں کچھ امور پر گفتگو کی جس کی روشنی میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں۔

مذہب کے بارے میں لیفٹ کے دیگر دانشوروں کی طرح ان کا خیال ہے کہ یہ سماج کی پیداوار ہے اور اس کے صرف وہ پہلو قابل استفادہ ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتے ہیں اور

جو حقوق العباد کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب کی ایسی تشریح نہیں ہونی چاہیے جو لوگوں کے درمیان منافرت کا باعث بنتی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی تگ ودو زیادہ تر دو پہلوؤں پر ہے۔ ایک یہ کہ بھارت میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مفاہمت کو کس طرح فروغ دیا جا سکتا ہے، اور دوسرا یہ کہ مذہب کی انسانیت مخالف تشریح کا راستہ کیسے روکا جا سکتا ہے۔ بھارت کے تناظر میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان برداشت اور مفاہمت کے فروغ میں جمعیۃ العلماء ہند کا کردار ہمیشہ سے نمایاں چلا آ رہا ہے، جماعت اسلامی بھی اب اس رخ پر آگے بڑھ رہی ہے، جبکہ مسلم بزرگان دین کی وہ درگاہیں اس سلسلہ میں بہت نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں جہاں حاضر ہونے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کی بھی ایک بڑی تعداد ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلم صوفیاء کا خانقاہی نظام اب خانقاہی نہیں رہا بلکہ درگاہی بن گیا ہے لیکن مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان میل جول میں ان کا کردار بہت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر یوگندر سکند چونکہ لیفٹ کے فکری حلقے سے متاثر ہیں اس لیے معاشرے کی مذہبی تقسیم یا کلچر کے حوالے سے تقسیم پر یقین رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اصل تقسیم طبقاتی ہے کیونکہ اعلیٰ ذات کے مسلمانوں کا طرز عمل نچلی ذاتوں کے مسلمانوں کے ساتھ اسی طرز کا ہے جو ہندوؤں کی اعلیٰ ذات کے لوگوں کا نچلی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح ہندوؤں میں برہمن ذات کے لوگ نچلی ذاتوں کے ہندوؤں کے ساتھ رشتے ناتے نہیں کرتے اسی طرح مسلمانوں میں مغل، سید، پٹھان اور شیخ برادریوں کے لوگ دوسری ذاتوں کے مسلمانوں کے ساتھ رشتے ناتے سے گریز کرتے ہیں۔ اسی طرح اعلیٰ ذات اور طبقے کے ہندوؤں اور اعلیٰ ذات اور طبقے کے مسلمانوں کے سماجی مسائل ملتے جلتے ہیں جبکہ اس کے برعکس نچلی ذاتوں کے ہندوؤں اور نچلی ذاتوں کے مسلمانوں کے مسائل بھی آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

ڈاکٹر یوگندر سکند کا خیال ہے کہ بھارت میں ۱۵ فیصد مسلمان ہیں اور ۱۵ فیصد ہی دلت (اچھوت) ہندو ہیں۔ ان دونوں طبقوں کی مشکلات، مسائل اور پریشانیاں ایک جیسی ہیں۔ لیکن جس طرح برہمن ہندو مسلمانوں اور دلتوں کے درمیان میل جول واشتراک واتحاد میں رکاوٹیں پیدا

کرتے رہتے ہیں اسی طرح اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں کو بھی عام مسلمانوں اور دلتوں کا میل جول اچھا نہیں لگتا۔ رولنگ کلاس اس تفریق اور تضاد کو قائم رکھنا چاہتی ہے کیونکہ اس کا مفاد اسی میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دلتوں یعنی نچلی ذاتوں کے ہندوؤں کو اب یہ سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ ان کی پسماندگی اور تحقیر کے اصل ذمہ دار مسلمان ہیں کیونکہ وہ بہادر لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا اس لیے مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں انہیں اچھوت بنا دیا اور جان بوجھ کر پسماندہ رکھا۔ اس طرح برہمن ہندو دلتوں کو مسلمانوں سے متنفر کرنے کے لیے پوری تاریخ تبدیل کر رہا ہے۔

عالمی سطح پر بھی ڈاکٹر یوگندر سکند تہذیبی کشمکش اور سولائزیشن وار کے قائل نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اصل کشمکش امیر اقوام اور غریب اقوام کے درمیان ہے۔ دولت منداقوام وممالک ڈبلیو ٹی او اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے پوری دنیا کے وسائل پر کنٹرول حاصل کرتے جا رہے ہیں اور گلوبل اجارہ داری کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن دنیا کو انہوں نے اسلام اور مسیحیت کی کشمکش اور سولائزیشن وار کے تصورات میں الجھا رکھا ہے۔

مسلمانوں کے دینی مدارس کے بارے میں یوگندر سکند کا کہنا ہے کہ ایک عرصے سے ان مدارس کے خلاف عالمی سطح پر الزامات عائد کرنے کا سلسلہ جاری ہے جس میں نائن الیون کے بعد بہت تیزی آئی ہے اس لیے انہوں نے ایک مستقل مقالے میں اس صورتحال کا جائزہ لیا ہے اور بھارت کے مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کے نظام ونصاب کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر کے یہ بات واضح کی ہے کہ بھارت میں پائے جانے والے دینی مدارس کے بارے میں یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ ان میں دہشت گردی یا منافرت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ انہوں نے اس سلسلہ میں بھارت کے مسلم دینی مدارس کا ہی جائزہ لیا تھا اس لیے اپنے مقالے میں انہی کے حوالے سے بات کی ہے اور سوسائٹی پر دینی مدارس کے مثبت اثرات کو بھی اجاگر کیا ہے۔

اپنے دورۂ پاکستان کے اثرات بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ یہاں آتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ خدا جانے انہیں کس قسم کے طرزِ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن پاکستان میں انہیں جس محبت اور مہمان نوازی کے ساتھ ڈیل کیا جا رہا ہے وہ یوں سمجھ رہے ہیں جیسے اپنے ملک میں ہی ہوں

اور انہیں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس کا قطعاً احساس نہیں ہو رہا۔ البتہ یہاں کا سسٹم اور نظام دیکھ کر انہیں افسوس ہو رہا ہے کہ اقتصادیات، تعلیم، قانون کی عملداری اور کسی منظّم سسٹم کے حوالے سے کوئی ترقی نہیں ہو رہی اور عام لوگوں کی صورتحال تسلی بخش نہیں ہے۔

ڈاکٹر یوگندر سکند جنوبی ایشیا کی نئی نسل کے دانشور ہیں اور آج کی دنیا سے باخبر ہیں، وہ صرف حالات معلوم کر کے ان کے بارے میں رائے قائم نہیں کرتے بلکہ اپنی رائے عالمی سطح پر لوگوں تک پہنچا کر انہیں متاثر بھی کرتے ہیں۔ ان کے خیالات اور مختلف امور پر ان کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں مگر آج کے ان ملٹی نیشنل دانشوروں کے خیالات سے آگاہی بہت ضروری ہے بالخصوص ان علماء کرام اور ارباب دانش کے لیے تو یہ آگاہی ایک ناگزیر ضرورت کا درجہ رکھتی ہے جو آج کے گلوبل ماحول میں مسلم امہ کی رہنمائی کا دعویٰ رکھتے ہیں اور اس کے لیے کسی بھی درجے میں محنت اور کوشش کر رہے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور --- یکم فروری ۲۰۰۶ء)

بھارت اور پاکستان کے قوانین

بھارتی پنجاب کے معروف قانون دان ہر چند سنگھ باٹھ نے، جو وکلاء کی انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے، گزشتہ روز ''پاکستان فورم'' میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ

> ''دونوں ملکوں کے قانونی نظام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے کیونکہ یہ انگریز کا بنایا ہوا ہے۔ ہم آج تک اس میں اپنی ضروریات کے مطابق تبدیلی نہیں کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ انگریز نے تمام قوانین اپنی حاکمیت کو قائم رکھنے کے لیے بنائے تھے، ہمیں چاہیے تھا کہ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ضرورت کے تحت تبدیلیاں کرتے، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔''

یہ بات نئی نہیں ہے اور ہم فقیر لوگ ایک عرصے سے یہ گزارش کرتے آرہے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد وقتی ضرورت کے تحت تعطل اور خلا سے بچنے کے لیے تو ''انڈیا ایکٹ'' کو برقرار رکھنا شاید ہماری مجبوری تھی لیکن اسے ملک کے مستقل قانون کی حیثیت دے دینا ہماری معاشرتی ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ اسلامی نظریے کے تحت ایک الگ ملک پاکستان کے قیام کے اہداف سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہمارا مروجہ قانونی نظام اور نافذ شدہ قوانین ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں برطانوی حکومت کی براہ راست عملداری قائم ہونے کے بعد نوآبادیاتی مقاصد کے لیے نافذ کیے گئے تھے اور یہ نوآبادیاتی نظام ہی سے مطابقت رکھتے تھے۔ یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ نوآبادیاتی حکمرانوں کو ایسے ہی نظام قانون اور قوانین کی ضرورت تھی جو ان کی حکمرانی کو طول دے سکیں اور جن کے ذریعے وہ اپنے نوآبادیاتی عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

یہ بات خود ایک انگریز بیوروکریٹ پینڈرل مون (Penderel Moon) نے بھی اپنی آپ

بیتی اور یادداشتوں میں واضح کی ہے، جو کئی بار چھپ چکی ہے۔ پینڈرل مون نے سالہا سال تک برطانوی سول سروس کے تحت پنجاب اور دیگر علاقوں میں انتظامی اور عدالتی خدمات انجام دی ہیں اور طویل تجربے اور مشاہدات کے بعد اس امر کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے کہ برطانوی دور کا نافذ کردہ قانونی نظام برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے لوگوں کے مزاج ونفسیات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اور وہ ان کے مسائل وتنازعات کو حل کرنے کی بجائے مزید الجھانے اور پیچیدہ بنانے کا کام کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی نوآبادیاتی حکومت اپنی نوآبادی کو قبضے میں رکھنے کے لیے یہی کچھ کرسکتی ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ نوآبادیاتی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی اسی قانونی نظام اور قوانین کو باقی رکھا گیا ہے اور خود اپنی ضروریات کے مطابق بھی اس میں کسی قسم کے رد و بدل کو روا نہیں رکھا جا رہا ہے۔ ہرچند سنگھ باٹھ نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے اور حسرت کا اظہار کیا ہے کہ ہم ابھی تک اپنی ضروریات کے تحت ان قوانین میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکے۔

بھارت میں عام لوگوں کی ضروریات کیا تقاضہ کرتی ہیں اس کے بارے میں تو ہرچند سنگھ باٹھ ہی بہتر طور پر رہنمائی کر سکتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں پاکستان میں ہماری ضروریات کا دائرہ کیا ہے؟ اس کے حوالے سے ہم خود کچھ عرض کرنے کی بجائے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زبان سے ان ضروریات کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ قانونی نظام اور قوانین کے دائرے میں اس نئے ملک میں ان کے نزدیک کیا تبدیلیاں رونما ہونا ضروری تھیں۔ قائداعظمؒ نے ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے لیڈر گاندھی کے نام اپنے معروف خط میں فرمایا تھا کہ

> ’’قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے، اس میں مذہبی ومجلسی، دیوانی و فوجداری، عسکری وتعزیری، معاشی ومعاشرتی، غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ امور حیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک، اخلاق سے لے کر انسداد جرم تک، زندگی میں سزا وجزا سے لے کر عقبٰی کی جزا وسزا تک ہر ایک فعل، قول اور حرکت پر مکمل احکام موجود ہیں۔ لہٰذا

میں جب یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو حیات اور مابعد الممات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں''۔

جناب محمد علی چراغ نے اپنی تصنیف ''قائداعظم کے مہ وسال'' میں ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے قائداعظمؒ کے خطاب کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ

''اسلام کے اصول وضوابط آج بھی اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام محض رسوم، روایات، اور روحانی نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہے، مساوات اور آزادی واخوت اسلام کے اساسی اصول ہیں۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو بتائیں گے کہ یہ اعلیٰ آئینی نمونہ ہے۔''

''قائداعظمؒ کے مہ وسال'' میں ہی ان کا وہ خطاب مذکور ہے جو انہوں نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے کیا تھا اور اس میں کہا تھا کہ

''مغرب کے نظام معاشیات نے متعدد مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ میں اسلامی نظریات کے مطابق آپ کے یہاں نظام معیشت دیکھنے کا متمنی ہوں۔''

قائداعظمؒ کے ان ارشادات اور ان کے دیگر درجنوں فرمودات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاکستان میں قانونی نظام اور قوانین کے حوالے سے کس قسم کی تبدیلیوں کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ اسلام کے معاشی اور معاشرتی قوانین کو بروئے کار لانے کے متمنی تھے اور مغرب کے نظام معیشت پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسلام کے معاشی اصولوں کے مطابق ملک میں ایک نئے معاشی نظام اور اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل چاہتے تھے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک ''انڈیا ایکٹ'' سے چمٹے ہوئے ہیں اور دستور میں اسلامی نظام حیات اور اسلامی قوانین کی ترویج کی گارنٹی واضح طور پر موجود ہونے کے باوجود قوم کو قرآن و سنت کے احکام وقوانین کے نفاذ کی منزل سے ہمکنار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قومی سطح پر خلفشار کا شکار ہیں۔

ہم ایمان و یقین کا اظہار قرآن وسنت کے ساتھ کرتے ہیں لیکن ہماری وفاداری نوآبادیاتی نظام وقوانین کے ساتھ ہے۔ ہم نے دستور میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کر رکھا ہے لیکن اس حاکمیت اعلیٰ کو اپنے قانونی نظام اور معاشرتی و معاشی سسٹم میں دخل اندازی کا حق دینے کے لیے ابھی تک تیار نہیں ہیں۔ یہ دہری وفاداری ہمارے قومی مزاج کا حصہ بنتی جا رہی ہے جس کی ایک جھلک دہری شہریت کے حوالے سے ہونے والی بحث میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ہمارے بہت سے دوستوں بلکہ دانشوروں کو بھی اس بات میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہو رہی کہ ایک شخص ملکہ برطانیہ کا وفادار بھی ہو اور اس وفاداری کو پوری طرح قائم رکھتے ہوئے دستور پاکستان کے تحت اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حلف بھی اٹھا لے، اور پھر زندگی بھر دونوں وفاداریوں کا تمغہ اپنے سینے پر سجائے رکھے۔

مجھے اس موقع پر شکاگو میں قائم بہائیوں کا ایک مرکز یاد آ رہا ہے جس میں وحدت ادیان کے تصور کے تحت ایک بڑے ہال میں مسجد، مندر، چرچ، گوردوارہ، اور سینی گاگ کے الگ الگ پورشن ایک ہی چھت کے نیچے بنائے گئے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں یہ مرکز دیکھنے کا اتفاق ہوا تو مرکز کے انچارج نے بتایا کہ ہم نے مسجد اور مندر کو ایک ہی چھت کے نیچے جمع کر دیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مسجد اور مندر کو تو آپ نے ایک چھت کے نیچے جمع کر لیا ہے لیکن مجھے یہ سمجھائیں کہ توحید اور شرک کو آپ نے اس چھت کے نیچے آخر کس طرح اکٹھے کر دیا ہے؟ اسی چھت کے نیچے اللہ تعالیٰ ''وحدہ لاشریک لہٗ'' بھی ہے اور اسی ہال میں اس کے ساتھ دیگر شریکوں کی پوجا بھی کی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے کہ ہم پاکستانی بھی کم وبیش اسی طرح کی صورتحال اختیار کیے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا دامن بھی ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں اور برطانوی نوآبادیاتی دور کی یادگار معاشی، معاشرتی، اور قانونی نظام کی وفاداری سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ بقول غالب

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

(روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۵ نومبر ۲۰۱۲ء)

خواتین کی نسل کشی: دورِ جاہلیت کی روش

ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والی ''آن لائن'' رپورٹ کے مطابق امریکہ میں خواتین کے حقوق کے حوالہ سے ایک تنظیم متحرک ہوئی ہے جس کا نام ''جینڈر رسائیڈ اویئرنیس پروجیکٹ'' بتایا گیا ہے اور اس کی بانی چیئرمین بیورلی بل نامی خاتون ہیں۔ انہوں نے گزشتہ دنوں ڈیلس میں ساؤتھ ایشیا ڈیموکریسی واچ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ساتھ میٹنگ میں کہا ہے کہ خواتین کو دنیا بھر میں نسل کشی کا سامنا ہے جس میں چین سرفہرست ہے اور اس کے بعد بھارت دوسرے نمبر پر ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک بھی اس ضمن میں پیچھے نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مرد کی طرح عورت کی پیدائش بھی فطرت کا حصہ ہے لیکن ہر سال ۲ ملین کے لگ بھگ لڑکیوں کو اسقاط حمل کے ذریعے پیدائش سے قبل ہی فارغ کر دیا جاتا ہے اور بعض علاقوں میں مرد کو اثاثہ اور عورت کو بوجھ تصور کیا جاتا ہے۔

خواتین کی نسل کشی کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ اس دور جاہلیت کا بھی حصہ رہی ہے جسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر ختم کیا۔ جاہلیت کی جن اقدار سے انسانی معاشرہ کو اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات دلائی ان میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا بھی شامل تھا۔ قرآن کریم میں اس رسم بد کی دو وجہیں بتائی گئی ہیں: ایک خشیۃ املاق یعنی فاقے کے ڈر سے، کیونکہ عورتوں کو معاشی طور پر بوجھ سمجھا جاتا تھا۔ اور دوسرا من سوء ما بشر بہ اس کا سبب عار تھا کہ لڑکی کی ولادت ماں باپ کے لیے عار متصور ہوتی تھی اور طعنے کے خوف سے لڑکی کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔

ایک صاحب جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر پوچھا کہ میرے گناہوں کا کیا بنے گا؟ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اسلام قبول کرنے کی برکت سے

پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ آنے والے نے بتایا کہ میں اپنی آٹھ بیٹیوں کو یکے بعد دیگرے زندہ دفن کر چکا ہوں اور ساتھ ہی آٹھویں بیٹی کو زندہ درگور کرنے کا واقعہ سنایا تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

تاریخی روایت ہے کہ مشہور عرب شاعر فرزدق کے دادا ناجیہ نے ایک بار سفر کے دوران کسی خیمہ میں بچی کی ولادت پر اس کے باپ سے اسے زندہ درگور کرنے کا ارادہ سنا تو ایک اونٹنی دے کر بچی اس سے لے لی کہ اس کی پرورش میں کروں گا۔ اس کے بعد انہوں نے معمول بنا لیا کہ جہاں بھی کسی کے ہاں بچی کی ولادت کے بعد اسے قتل ہونے کا خطرہ محسوس کرتے وہاں پہنچ کر وہ بچی ایک اونٹ کے عوض خرید لیتے۔ ان صاحب نے جناب رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر جب اسلام قبول کیا تو ان کی حویلی میں اس قسم کی سینکڑوں پرورش پا رہی تھیں۔

اسلام نے جاہلیت کی اس قبیح اور ظالمانہ رسم کا خاتمہ کر کے گویا عورت کو زندگی کا حق عطا کیا۔ اور جناب نبی اکرمؐ نے اپنے گھر میں چار بیٹیوں کی پرورش کر کے اور انہیں محبت واحترام فراہم کر کے دنیا کو سبق دیا کہ بچی قتل کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کی حقدار ہے اور محبت واحترام کی مستحق ہے۔ لیکن یہ رسم قبیح آج بھی دنیا میں مختلف شکلوں میں موجود ہے جس کا اظہار مذکورہ بالا رپورٹس میں کیا گیا ہے۔ خاص طور پر بھارت میں یہ مسئلہ قومی سطح پر پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے کہ الٹراساؤنڈ کے ذریعے یہ معلوم ہونے پر کہ حمل میں بچی ہے، اس کا اسقاط کرا کے اسے زندگی کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس پر بھارت کی اعلیٰ قیادت بھی پریشان ہے کہ ہر سال ہزاروں لڑکیاں پیدائش سے قبل ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ اس لیے یہ مہم بہت اچھی ہے کہ لوگوں میں بیداری پیدا کی جائے اور اسقاط حمل کے ذریعے خواتین کی نسل کشی سے روکا جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اسقاط حمل جس طرح لڑکی کے حوالہ سے قتل کی صورت شمار کی جا رہی ہے لڑکے کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ اسقاط حمل لڑکے کا ہو یا لڑکی کا ہو، اگر وہ قتل ہے تو دونوں کا قتل ہے۔ اور محترمہ بیورلی بل کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے کہ مغرب میں وسیع پیمانے پر جو اسقاط حمل ہو رہا ہے اور اس میں لاکھوں کی تعداد میں بچے زندگی کے حق سے محروم ہو رہے ہیں ان میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں اور ان کی تعداد چین اور بھارت میں بچیوں کی نسل کشی

سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ جنوبی ایشیا کے بعض علاقوں میں بچی کی پیدائش کو عار کا باعث سمجھا جاتا ہے اور اسقاط حمل کے ذریعے اسے زندگی کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے لیکن یہ بات بھی اسی طرح درست ہے کہ مغرب میں زنا عام ہونے اور بچے کی کفالت کی ذمہ داری زانی مرد پر نہ ہونے کی وجہ سے لاکھوں بچے اور بچیاں اسقاط حمل کا شکار ہوتی ہیں جس کی بنیادی وجہ زنا کی کھلی آزادی ہے۔ مگر مغربی ممالک اس کی اصل وجہ کو دور کرنے کی بجائے دنیا بھر میں اسقاط حمل کو عورت کا قانونی حق قرار دلوانے کے چکر میں ہیں اور اقوام متحدہ کے عالمی فورم سے بھی یہ آواز مسلسل اٹھائی جا رہی ہے کہ عورت کو اسقاط حمل کا غیر مشروط حق دیا جائے اور تمام ممالک اپنے اپنے قوانین میں ترمیم کر کے اسے قانونی جواز فراہم کریں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے پیٹ میں بچے میں جان پڑ جانے کے بعد اسقاط حمل کو قتل قرار دیا ہے اور محترمہ بیورلی بل بھی اسے قتل ہی تسلیم کر رہی ہیں۔ تو دنیا بھر میں اسقاط حمل کو قانونی حق کا درجہ دلوانے کی عالمی مہم کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ زنا کو انسانی حق قرار دینے کے بعد اب قتل کو بھی حقوق کی فہرست میں شامل کیا جا رہا ہے۔ ہم خواتین کی نسل کشی کے خلاف مذکورہ بالا امریکی تنظیم کی اس مہم کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسقاط حمل کے ذریعے دنیا بھر میں بچوں اور بچیوں دونوں کا جس وسیع پیمانے پر قتل عام کیا جا رہا ہے اور زنا جیسے قبیح جرم کو جواز فراہم کر کے قتل کو فروغ دینے کی باقاعدہ مہم چلائی جا رہی ہے اس پر بھی غور کیا جائے۔ کیونکہ قتل بچی کا ہو یا بچے کا، اگر اسقاط حمل قتل کے مترادف ہے تو لڑکا اور لڑکی دونوں اس سے بچاؤ اور تحفظ کے مستحق ہیں اور اسے صرف خواتین کی نسل کشی قرار دینا بھی نسلی امتیاز ہی کہلائے گا۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ اپریل ۲۰۱۴ء)

چیمپئنز ٹرافی: ۱۸۰ نفلوں کی مار

مجھے کھیلوں سے اس حد تک کبھی دلچسپی نہیں رہی جو معمولات اور ضروری کاموں پر اثر انداز ہو مگر بہرحال کچھ نہ کچھ تعلق ضرور چلا آ رہا ہے۔ لڑکپن کے دور میں گکھڑ میں میرے ہم عمر دوستوں نے کرکٹ کی دو ٹیمیں بنا رکھی تھیں یونین کلب اور آزاد کلب کے نام سے۔ ان میں سے ایک کے کپتان محمد یونس بھٹی اب مرحوم ہو چکے ہیں جبکہ دوسری ٹیم کے کپتان محمد عبد اللہ خالد بقید حیات ہیں۔ دونوں میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے، اللہ تعالیٰ بھٹی صاحب مرحوم کی مغفرت فرمائیں اور خالد صاحب کی صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں۔ میں بھی ان میں سے ایک ٹیم کا حصہ تھا اور کرکٹ کھیلا کرتا تھا مگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ ہی چل سکا پھر ذہن کیرم بورڈ کی طرف مڑ گیا اور کافی عرصہ اس کا شغل رہا، اس کے بعد چند سال لڈو بھی کھیلی۔ البتہ قومی سطح پر کھیلوں سے اس حد تک دلچسپی ضرور باقی رہی کہ پاکستان کا قومی سطح پر کسی ملک سے مقابلہ ہو تو معلومات رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، پاکستانی ٹیم کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں اور کامیابی مل جائے تو خوشی کا اظہار بھی کرتا ہوں۔

یہ فطری بات ہے کہ دو قوموں یا گروہوں کے درمیان مقابلہ ہو تو کسی ایک طرف ہمدردی ضرور ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے روم و فارس کی باہمی جنگوں کا ذکر کیا ہے، یہ مسلمانوں کا مکی دور تھا۔ روم اور فارس دنیا کی دو بڑی قوتیں تھیں جن کی آپس میں محاذ آرائی رہتی تھی اور شام، عراق اور بحرین کے علاقے میدان جنگ تھے۔ مشرکین مکہ کی ہمدردیاں فارس کے مجوسیوں کے ساتھ تھیں جبکہ مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے اہل کتاب کے ساتھ تھیں۔ یہ قوموں کی نفسیات کا حصہ ہے کہ لڑائی کہیں اور ہو رہی ہوتی ہے جس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن ہمدردیوں کے باعث

باہمی محاذ آرائی کا نفسیاتی ماحول دوسرے علاقوں میں بھی بن جاتا ہے۔ فارس کے مجوسی پیشرفت کرتے تو مکہ کے مشرکین مسلمانوں کو طعنے دیتے اور جب روم کے اہل کتاب کو کہیں کامیابی مل جاتی تو مسلمان اپنی خوشی کا اسی طرح مشرکین کے سامنے اظہار کرتے۔ حالانکہ رومی اور فارسی دونوں کافر تھے اور بعد میں مسلمانوں کی دونوں سے جنگیں ہوئیں لیکن اس وقت کے حالات میں وہ بہر حال رومیوں کے ساتھ سمجھے جاتے تھے بلکہ ہمدردی اور دلچسپی کی حد تک ان کے ساتھ تھے بھی۔

ایک موقع پر فارسیوں نے رومی علاقوں پر ایسی چڑھائی کی کہ رومی دارالحکومت قسطنطنیہ کے قریب جا پہنچے۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو طعنے دیے جس سے مسلمان پریشان ہوئے۔ انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپؐ نے یہ کہہ کر تسلی دی کہ کوئی بات نہیں چند سالوں کے بعد رومیوں کو دوبارہ غلبہ حاصل ہوگا۔ اس پر قرآن کریم کی سورۃ الروم نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا کہ تسلی رکھو رومی چند سالوں کے بعد فارسیوں پر غالب آئیں گے اور تم مسلمانوں کو بھی خوشی کا دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ یہ باہمی نفسیاتی کشمکش اس عروج کو پہنچی کہ تفسیر ابن کثیرؒ میں مذکور روایات کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قریش کے بعض سرداروں کے ساتھ باقاعدہ شرط باندھ لی۔ اس وقت تک جوئے اور شرط وغیرہ کے ناجائز ہونے کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے اس لیے عام معمول کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ شرط لگائی اور پھر جیتی بھی۔

یہ صورتحال تو غیر مسلم قوموں کے باہمی مقابلہ میں کسی ایک طرف دلچسپی کی ہے لیکن اگر مقابلہ میں خود اپنی قوم اور ملک کھڑا ہو تو یہ دلچسپی کہیں زیادہ ہو جاتی ہے اور کھیل کا مقابلہ بھی باقاعدہ محاذ جنگ بن جاتا ہے جیسا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلوں کے مقابلہ میں دونوں طرف یہ کیفیت دیکھنے میں آتی ہے۔ چنانچہ مجھے تو ان مقابلوں سے اسی حد تک دلچسپی ہوتی ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں مگر میری اہلیہ اور پوتوں کی دلچسپی ایسے موقعوں پر قابل دید ہوتی ہے۔ بڑا پوتا طلال خان جو کہ عمار خان کا بیٹا ہے، ماشاء اللہ حافظ قرآن ہے اور اس رمضان میں ہم گھر والوں کو گھر میں ہی تراویح میں قرآن کریم سنا رہا ہے۔ جب یہ چھوٹا تھا اور اس کے پردادا جان حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ حیات تھے تو ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ بستر علالت پر تھے، اس کی ولادت پر اسے گھٹی بھی پردادا محترم نے دی تھی، انہوں نے اس سے نام پوچھا تو اس نے بتایا ''طلال

آفریدی‘‘۔انہوں نے تعجب سے اس کی والدہ کی طرف دیکھا تو اس نے وضاحت کی کہ کرکٹ کا شوقین ہے اور شاہد آفریدی کو پسند کرتا ہے اس لیے اپنے نام کے ساتھ اس نے آفریدی لگا رکھا ہے۔ پردادا نے فرمایا کہ بیٹا ہم آفریدی نہیں ہے اس لیے اپنے نام سے یہ نسبت ہٹا لو چنانچہ اس کے بعد اس نے یہ لفظ ترک کر دیا۔

میرے تین پوتے ہیں، طلال خان، ہلال خان اور ابدال خان جن کی عمریں ترتیب سے ۱۵ سال، ۱۲ سال اور ۹ سال ہیں۔ دوسرے دونوں بھی قرآن کریم حفظ کر رہے ہیں جبکہ کرکٹ کے ساتھ تینوں کی دلچسپی یکساں ہے جس میں انہیں اپنی دادی کی سرپرستی حاصل ہے۔حالیہ چیمپئنز ٹرافی کے مقابلوں میں اس حوالہ سے ہمارے گھر میں ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہوگئی جس نے مجھے یہ کالم لکھنے پر آمادہ کیا۔ پاکستان نے برطانیہ سے سیمی فائنل جیتا تو باقی سب لوگ خوش تھے مگر طلال خان کی دادی افسردہ ہوئی، وجہ پوچھی تو کہنے لگی کہ انگلینڈ سے ہار جاتا تو خیر تھی اب فائنل میں پہنچ کر بھارت سے ہارے گا تو زیادہ کوفت ہوگی۔ ہمارے گھر میں ٹی وی تو ہے نہیں اس لیے فائنل مقابلہ کے دن دادی اور پوتے انٹرنیٹ پر میچ میں مصروف رہے اور ان کا چچا عامر خان جو اپنے کام میں مصروف تھا وقفہ وقفہ سے صورتحال پوچھتا رہا۔عصر کے بعد مجھے افطاری کے پروگرام کے لیے شہر سے باہر جانا تھا وہاں مجھے پاکستان کے جیتنے کی خبر مل گئی۔ میرا چھوٹا بیٹا ناصرالدین خان عامر رات سونے سے قبل مجھے دوائی کی خوراک دیتا ہے اور کچھ ٹانگیں وانگیں بھی دباتا ہے، اس نے بتایا کہ آج بھارت ایک سو اسی نفلوں سے ہار گیا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا ایک سو اسی نفلوں سے؟ کہنے لگا کہ امی جان نے نذر مان لی تھی کہ بھارت جتنے رنز سے ہارے گا اتنے نفل پڑھوں گی، اب انہیں کیا پتہ تھا کہ بھارتی ٹیم اس میچ میں اتنی نکمی ثابت ہوگی۔ رات کو سب سے چھوٹا پوتا ابدال خان معصوم سی ہمدردی کے ساتھ دادی سے کہہ رہا تھا کہ ’’دادو جان! آپ نفل بیٹھ کر پڑھ لینا‘‘۔اس نے کہا کہ بیٹا میں تو پہلے ہی بیماری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھتی ہوں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور---۲۰ جون ۲۰۱۷ء)

سیاسی اخلاقیات کی چند خوشگوار جھلکیاں

ان دنوں سیاسی رسہ کشی نے جو شکل اختیار کی ہوئی ہے وہ بہت پریشان کن ہے کیونکہ ایک دوسرے کے خلاف جو زبان اختیار کی جا رہی ہے اور باہمی الزام تراشی اور طعنہ زنی کے ساتھ ساتھ قومی اداروں بالخصوص عدلیہ کے فیصلوں کو جس طرح بے وقار کیا جا رہا ہے اور فوج کے خلاف نفرت کی فضا بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس نے سیاسی اخلاقیات کو سوالیہ نشان بنا کر رکھ دیا ہے اور اس خلفشار کو ''نو ٹرن پوائنٹ'' کی طرف بڑھتے دیکھ کر بسا اوقات قلبی اضطراب انتہائی حدوں کو چھونے لگتا ہے، اس ماحول میں کچھ واقعاتی جھلکیاں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جو ماضی قریب میں ہی قومی سطح پر ہماری قیادتوں کی اخلاقی اقدار کی طرف توجہ دلاتی ہیں اور یہ احساس دلاتی ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔

وطن عزیز دولخت ہو چکا تھا، ہماری فوج کا ایک بڑا حصہ انڈیا کی قید میں تھا اور مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی، جمعیۃ علماء اسلام، مسلم لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کی باہمی سیاسی کشیدگی عروج پر تھی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو ملک کے حکمران تھے اور خان عبد الولی خان، مولانا مفتی محمود اور میاں ممتاز دولتانہ اپوزیشن کی قیادت کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب کو نازک ترین مسائل پر بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے مذاکرات کے لیے انڈیا جانا تھا اور سیاسی ماحول میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان مذاکرات میں ملک کی اپوزیشن بھی ان کی پشت پر کھڑی دکھائی دے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیۃ علماء اسلام کے ایک اجلاس میں بتایا کہ ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ بھارت کے ساتھ مذاکرات کے لیے بھٹو صاحب کو ہمارے اعتماد کی ضرورت ہے چنانچہ ہم نے قومی اسمبلی میں بھٹو صاحب پر اعتماد کی قرارداد منظور

کر کے اس ضرورت کو پورا کیا اور بھٹو صاحب نے پورے اعتماد کے ساتھ بھارتی وزیراعظم سے مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں شملہ معاہدہ وجود میں آیا۔

اسی دوران جمعیۃ علماء اسلام پاکستان دو حصوں میں بٹ گئی اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے مولانا مفتی محمودؒ کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے ''ہزاروی گروپ'' کے نام سے جمعیۃ علماء اسلام کی تشکیل نو کر لی جس سے مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ جماعتی پالیسیوں اور گروہ بندی میں آمنے سامنے آگئے۔ اسی تسلسل میں ۱۹۷۷ء کی ''تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ'' کے دوران جبکہ مولانا مفتی محمودؒ نو سیاسی جماعتوں کے مشترکہ فورم ''پاکستان قومی اتحاد'' کے سربراہ کے طور پر تحریک کی قیادت کر رہے تھے کہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا ایک تند و تیز بیان مفتی صاحبؒ کے خلاف اخبارات کی زینت بنا، میں ان دنوں جمعیۃ علماء اسلام کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات اور پاکستان قومی اتحاد پنجاب کا صوبائی سیکرٹری جنرل تھا، ہم کچھ دوست جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ روزنامہ نوائے وقت کے رپورٹر اکرام الحق شیخ ان سے ملنے کے لیے آئے اور مولانا ہزارویؒ کے اس بیان کے بارے میں سوال کیا۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ مولانا کی رائے ہے جو انہوں نے بیان کی ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ انہوں نے آپ کے بارے میں بھی کچھ کہا ہے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ بھی ان کی رائے ہے۔ اکرام الحق نے ایک دو بار پھر سوال دہرایا تو مفتی صاحبؒ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ''اکرام! جو تم کہلوانا چاہتے ہو وہ میں نہیں کہوں گا، وہ ہمارے بزرگ ہیں۔''

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کے لیے پاکستان سے جانے والے علماء کرام کے بھرپور وفد کی قیادت مولانا مفتی محمودؒ کر رہے تھے اور اس میں والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا مفتی عبدالحمید سواتیؒ کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اور مولانا مفتی محمودؒ کے درمیان سیاسی مخاصمت عروج پر تھی، پبلک جلسوں میں مفتی صاحبؒ کی تند و تیز فقروں پر بسا اوقات ہم بھی دھیمے لہجے میں مفتی صاحب سے کچھ عرض کر دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل الشیخ محمد علی الحرکان مرحوم بھی تشریف لا کر ان دونوں کے درمیان کشیدگی کو کم کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ بظاہر

کشیدگی کی سطح کم کرانے کی کوئی شکل نظر نہیں آ رہی تھی اور مفتی صاحبؒ جنرل محمد ضیاء الحق کے خلاف تمام سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے تھے۔

اس فضا میں مولانا مفتی محمودؒ دہلی گئے تو بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ان کی ملاقات ہوئی جس کے بعد بھارتی صحافیوں نے ملاقات میں مفتی صاحبؒ سے پاکستان کی سیاسی صورتحال کے بارے میں سوالات شروع کر دیا۔ بالخصوص جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ ان کے سیاسی اختلاف کی شدت کے بارے میں سوالات ہوئے، مفتی صاحبؒ پہلے تو طرح دیتے رہے مگر جب بار بار سوال ہوا تو مفتی صاحبؒ نے دوٹوک لہجے میں یہ فرما کر سوالات کو روک دیا کہ ضیاء الحق کے ساتھ میرا اختلاف ملک کی سرحدوں کے اندر ہے اور یہاں میں پاکستان کا نمائندہ ہوں اس لیے اس حوالہ سے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ جبکہ اسی ماحول میں مولانا مفتی محمودؒ کا انتقال ہو گیا تو جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ڈیرہ اسماعیل خان جا کر جنازہ میں ذاتی طور پر شرکت کی اور مفتی صاحبؒ کو شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر یہاں ذکر کرنا چاہوں گا کہ ہم نے بحمد اللہ اس ماحول میں سیاسی تربیت پائی ہے اور صد شکر کہ یہ روایات ان کے بعد بھی ہمارے ماحول میں قائم و موجود ہیں جن کے بعض واقعات میں اپنے کالموں میں ذکر کر چکا ہوں کہ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات پر بھی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان (۱) درخواستی گروپ اور (۲) فضل الرحمانؔ گروپ کے نام سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور ہمارے درمیان بیان بازی اور ایک دوسرے کی مخالفت انتہا کو پہنچی تھی مگر یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور بزرگوں کی صحبت و تربیت کا اثر تھا کہ اخلاقیات کا دامن ہمیشہ ہاتھ میں رہا ہے اور کسی اختلاف کو ذاتی مخاصمت اور دشمنی کا رنگ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ باہمی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں، گپ شپ بھی ہوتی تھی، نوک جھونک بھی ہوتی تھی اور سیاسی میدان میں باہمی محاذ آرائی بھی تھی۔

اس لیے آج کی سیاسی مخاصمت اور اس کے اظہار میں شدت، سنگینی اور اخلاقیات سے عاری لب ولہجہ دیکھنے میں آتا ہے تو الجھن ہونے لگتی ہے اور دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ روز ایک محفل میں اس صورتحال کا تذکرہ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ الزام تو ہم مذہبی حلقوں پر تھا کہ ان میں قوتِ

برداشت کم ہوتی ہے اور یہ دوسروں کو اختلاف کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور کسی مخالف کے لیے کفر سے کم کا فتویٰ ان کے پاس نہیں ہوتا۔ مگر عملی صورتحال یہ ہے کہ مذہبی قیادتیں تو آج بھی قومی اور ملی مفاد میں اکٹھے بیٹھنے کا اہتمام کر لیتی ہیں اور مشترکہ موقف طے کر لیتی ہیں۔ یہ سیاسی حلقوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے کی بات سننے کے روادار بھی نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ مئی ۲۰۲۲ء)